نصف آخر کا PDF فائل
پہلے سے موجود ہے اس
وجہ سے شامل نہیں کیا گیا
ہے

خطباتِ نظامی

نصف اول

خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد صاحب نظامی علیہ الرحمہ

فاروقیہ بک ڈپو
۴۲۲ مٹیا محل
جامع مسجد دہلی ۶

خطبات نظامی کے آخر کی فہرست

فہرست

یہ پہلے سے موجود ہے اس وجہ سے اس PDF میں شامل نہیں کیا گیا ہے

فہرست مضامین	صفحہ نمبر

طلبہ کیلئے چند اشارات

۱:۔ بعض تقریروں میں ایسے واقعات آگئے ہیں جو نئے نہیں ہیں بلکہ بہت ہی کثیر الاستعمال اور زبان زد ہیں۔ آپ یہ دیکھ کر اس تقریر سے اچاٹ نہ ہوں اور نہ ہی ذہن کو بوجھل بنائیں بلکہ اس کی ترتیب تسلسل اور سیٹنگ پر غور کریں۔ یہی تقریر کی جان ہے۔ نفسِ واقعہ کو نقل کر کے تقریر کو طول دینا مقصود نہیں بلکہ ان ہی واقعات کو صحیح ترتیب اور تسلسل سے بیان کیا جائے تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔

۲:۔ اگر کسی تقریر میں حشو و زوائد آگئے ہوں تو بلا تکلف آپ اسے اپنی تقریر سے خارج کر دیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ سب کا ذہن ایک دوسرے سے میل کھائے۔ اور سب کے اندازِ بیان میں یکسانیت ہو۔

۳:۔ تقریری میٹر خواہ آپ کہیں سے لے رہے ہوں لیکن جو خود آپ کا فکری اندازِ بیان ہے اس میں کسی بھی مقرر کی نقل کی جھلک تک بھی نہ آنے پائے۔ ورنہ (دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا)

محنت آپ کی ہوگی اور تقریر اس کی طرف منسوب ہوگی جس کی آپ نقل کرتے ہوں گے۔ عوام کو میٹر بہت کم یاد رہتا ہے لیکن لب لہجہ بہت یاد رہتا ہے۔ لہٰذا بھول کر ایسی طفلانہ اور بچکانہ غلطی نہ کیجئے۔ جو لطف دکشش اپنے فکری اندازِ بیان میں ہے وہ دوسرے کی نقل میں نہیں ہے۔ اگرچہ میٹر آپ ہی کا ہو لیکن جس کا لب ولہجہ ہوگا تقریر ادھر ہی منسوب ہو جائے گی۔

۴ :- شروع ہی سے اس بات کی کوشش کیجئے کہ آپ کا ذہن لطائف وظرائف، قصص وحکایات اور چٹکلے نما واقعات سے کم وابستہ ہو۔ علمی نکات اور باریکیوں میں ذہن اترنے کا عادی ہو۔ تقریر میں اگر ابتدا ہی سے آپ اس کے عادی ہوں گے تو اپنی اصل عمر کو پہنچتے پہنچتے ایک اعلیٰ سطح کے کامیاب مقرر بن جائیں گے۔

۵ :- آغاز تقریر ہی سے آپ نذرانہ کے خواہشمند نہ ہوں بلکہ اپنے فن کے فروغ وتشہیر کے لئے اپنے اکابر یا مخلص عوام سے ایسے مواقع حاصل کیجئے کہ وہ آپ کو تقریر کا موقع دے دیں۔ ابتداءً اس کو غنیمت جان کر اسی پر قناعت کیجئے اور اگر تقریر کامیاب ہو جائے اسی کو اپنی تقریر کا بہترین نذرانہ تصور کیجئے۔ پھر جب قوم آپ کے انداز بیان کو پسند کرے گی تو اسے خود ہی آپ کی طلب ہوگی۔ اب آپ کا جیسا معمول ہو اپنی صوابدید کے تحت اسی پر عمل پیرا ہوں۔

مقصد یہ ہے کہ ابتدا ہی میں اپنے کو نذرانے کی حرص ولالچ کی بندھن میں نہ باندھے ورنہ، نہ تو آپ کا حلقہ وسیع ہو سکے گا اور نہ ہی عوام میں اصل تعارف ہو سکے گا۔

۶ :- تقریر کثرت مشق کا نام ہے۔ علم اور معلومات کی زیادتی سے تقریر نہیں آتی بلکہ عوام کی بھیڑ بھاڑ میں اسکے استعمال سے۔ لہٰذا جسے مقرر بننا ہو وہ ہمیشہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہے۔ اور جب بھی اس کا موقع مل جائے تو بے دھڑک مائک پر آجائے۔ انشاء اللہ اس طرح آپ ایک دن بیباک اور نڈر مقرر بن جائیں گے۔

۷ :- تقریر عوام کے لئے کی جاتی ہے نہ کہ اسٹیج کے اکابر علماء ومشائخ کے لئے۔ اس لئے آپ دوران تقریر عوام سے مخاطب ہوں نہ کہ علماء سے یہ تو ان کا کرم ہے جو سبحان اللہ کہہ کر آپ کی حوصلہ افزائی کرے۔ لہٰذا

آپ ہلکی سی اس غلطی میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ طبقہ آپ سے استفادہ کی غرض سے بیٹھا ہے۔

(الف) البتہ ان کی موجودگی سے آپ کا فائدہ یہ ہوگا اگر کچھ خامیاں ہوں گی تو اس کی اصلاح ہوجائے گی۔

(ب) ایسی تقریر کو آپ سند یافتہ تقریر کہہ سکتے ہیں

۸:۔ ایک مقرر کو مجمع کے ہجوم سے گھبرانا نہیں چاہئے بلا جھجک نڈر ہو کر تقریر کی عادت ڈالنی چاہئے۔ دل و دماغ پر نہ کوئی وحشت ہو نہ ہی پریشانی۔ ورنہ آپ اصل میٹر نہیں بولیں گے۔ بہکی بہکی تقریر ہوگی۔ گویا بے جوڑ کا پیوند۔

۹:۔ کانفرنسوں وغیرہ میں صاحب صلاحیت علماء سے یہ خیال کر کے کہ آئندہ یہ بوجھ ہمارے کاندھے پر آنے والا ہے۔ اگر آپ اس یقین کے ساتھ اکابر علماء سے قریب رہیں گے تو آئندہ ملکی ملی مسائل پر حالات کے اعتبار سے ایجنڈوں کے تعین اور ترتیب اور تجاویز کے متن پر قابو یافتہ ہوجائیں گے۔ گویا علماء کا یہ قرب آپ کے حق میں ٹریننگ کا کام دے گا۔ آپ اپنے کو اپنی قوم کیلئے شروع ہی سے ایک باوزن ذمہ دار فرد بنانے کی کوشش کریں۔

۱۰:۔ اگر کسی انجمن میں تقریر کا عنوان کچھ اس طرح متعین کیا ہو کہ فرق باطلہ کا رد نہ ہوسکے تو اولاً انھیں سمجھانے کی کوشش کیجئے کہ قوم مریض ہے۔ علماء اس کے طبیب۔ لہٰذا نسخہ تجویز کرنا یہ علماء کا کام ہے آپ لوگ ایسی غلط روش نہ اختیار کریں۔ اگر وہ آپ کی بات تسلیم کرلیں تو کیا کہنا۔ اور اگر تسلیم نہ کریں اور تسلیم کرلینے کی کچھ لچک ہو تو اس انجمن سے رابطہ رکھئے ورنہ اگر ناقابل اصلاح ہوں تو ان سے رابطہ رکھ کر ان کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔

۱۱:۔ تقریر بھی ایک فن ہے مگر فن برائے فن نہ استعمال کیا جائے۔

بلکہ فن برائے مشن مذہب کا فروغ اور مسلکِ رضویت کی تشہیر سب پر مقدم رکھا جائے۔

۱۲:۔ ایسا اجلاس جو کئی رخاسے یک رخا کرنے کی کوشش کیا جائے اس سلسلے میں حکمت عملی اور مصالح شرعیہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

۱۳: وقت اور ماحول کا جو شرعی تقاضا ہو اس کی مناسبت سے عنوان منتخب کیا جائے۔ تقریر فروشی اور ضمیر فروشی سے دامن کو داغدار نہیں کرنا چاہیے۔

۱۴: تقریری مواد کے لئے کسی بھی غیر معتبر و غیر مستند کتاب کا مطالعہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے اساتذہ اور اکابر علماء سے رائے حاصل کرنا چاہیے۔ ورنہ اندیشہ ہے غیر شعوری طور پر سادہ ذہن کسی غیر معتبر روایت کو قبول کرے۔

۱۵: تقریر میں وہی بات کہی جائے عند الضرورۃ جس کا حوالہ پیش کیا جا سکے۔

۱۶: حتی الوسع مناظرے کے چیلنج میں پہل نہ کیجئے اور اگر فریق ثانی چیلنج دے تو آپ اس کے اہل ہوں تو فوراً قبول کریجئے ورنہ اسے اپنے بڑوں کی طرف منتقل کر دیجئے۔ لیکن مرحبا سے الوداع تک آپ اس میں شریک رہیے تاکہ تدریجاً شرائطِ مناظرہ طے کرنے اور مناظرہ کرنے کا سلیقہ آجائے۔

۱۷: حتی الوسع مناظرہ ہرگز ہرگز اکیلے نہ کیجئے۔ بہتر ین معین مناظر کی موجودگی کو ضروری سمجھئے۔ تنہا آپ کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک مسلک ایک جماعت کا مسئلہ ہے۔ مناظرہ کو مجادلہ نہ بنائیے۔

۱۸:۔ نذرانہ طے کرنے کو اب سے پہلے علماء اور انجمنیں دونوں کی نظر میں معیوب تھا لیکن اب دھیرے دھیرے دونوں کا یہی معمول بنتا

بنتا جا رہا ہے شاید کہ کچھ دنوں بعد یہی معروف طریقہ ہو جائے! اسلئے یہ مسئلہ آپ کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے۔

۱۸: اپنے اسلاف تقریر و تبلیغ کی راہ میں عوام اور انجمنوں پر بوجھ بننا پسند نہیں فرماتے۔ لہٰذا چاہیئے تو دشواریاں اور کٹھنائیاں جھیلنی پڑیں اپنی طرف سے بھی عوام کو سہولتیں دی جائیں تاکہ اصلاحی و تبلیغی جلسے زیادہ سے زیادہ ہو سکیں۔

۱۹: تقریر خواہ کسی بھی عنوان پر کیجیے لیکن ہر تقریر میں یہ سمجھانے کی ضرور کوشش کیجیے کہ ہمارا اور ہمارے حریف کے عقائد میں بنیادی اختلاف کیا ہے وقت کی یہ بہت ہی اہم ضرورت ہے۔

۲۰: عوام کو اتنا منھ نہ لگائیے کہ وہ حدود ادب کو برقرار رکھنے میں غیر محتاط ہو جائیں۔ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چلئے۔ اور نہ ہی ایک دوسرے کا ہاتھ کسی کے کاندھے پر ہو۔ میانہ روی بہت ہی ضروری ہے۔

۲۱: عوام سے کسی سامان کی فرمائش نہ کیجیے۔ اگر وہ بطیب خاطر نذر گذاریں تو انشراح صدر سے قبول کر لیجیے۔ طلب ہرگز نہ کریں۔

۲۲: تقریر بہت ہی صاف و شستہ زبان میں کیجیے۔ اور اس کو روز مرہ کی زبان بنائیے تاکہ دوران تقریر اچھے الفاظ کی تلاش میں لکنت نہ پیدا ہو۔

۲۳: زبان میں تذکیر و تانیث کا بہت خیال رکھیے تاکہ سامعین آپ کے بارے میں یہ گمان نہ کریں کہ دس برس کی طالبعلمانہ زندگی میں جب اردو زبان نہ سیکھ سکے تو فارسی، عربی کیا سیکھی ہو گی۔

۲۴: خواہ آپ اپنے فن میں کتنے ہی کامیاب ہوں مگر کبر و غرور آپ کے تلوے تک نہ پہنچے یہ زوال کا پہلا زینہ ہے۔ تواضع و انکساری ہی

میں سربلندی و سرفرازی ہے۔

۲۵: عوام کی نشست میں قصّے کہانیاں، لطائف وظرائف نہ بیان کیجئے۔ جب تک وہ آپ کے پاس ہوں حسب ضرورت دینی و شرعی مسائل صحابۂ کرام، اولیائے عظام، علمائے ربانیین، اسلاف واکابر کے حالات بیان کرکے ان کو اپنے سے قریب کیجئے۔ تاکہ وہ آئندہ بھی آپ سے یہی دینی سرمایہ لینے آئے۔ وہ آپ کی صاف ستھری نشست سے صحیح عقائد، اعمال صالحہ و دینی واقعات کا دولت گرانمایہ لے کر جائیں۔

۲۶: تقریر بہترین فن ہے لیکن مکمل اور ٹھوس تعلیم کے بعد اسے نیا فن بنایا جائے۔ برتن سے وہی نکلتا ہے جو برتن میں ہوتا ہے۔ اگر ظرف علم ہی سے خالی رہ گیا تو آپ چٹکلے بازیوں میں وقت گنوا دیں گے اور قوم کو کوئی تعمیری ذہن نہیں دے سکتے۔

۲۷: علماء اور ائمہ مساجد کو اپنا کمرہ حسب استطاعت دینی کتابوں سے سجانا چاہیئے تاکہ آپ کے پاس آنے والے گُرتوں کے مختلف بیل بوٹوں کو نہ دیکھیں بلکہ آپ کے علمی مذاق سے متأثر ہو کر جائیں۔ ایسی کتابیں جو آپ کے ذوقِ مطالعہ سے قریب ہوں ان ہی کو اپنا دوست اور ساتھی بنائیں تاکہ دورانِ گفتگو عند الضرورۃ کتابوں کے حوالے پیش کئے جاسکیں اور آئندہ یہ لوگ اسی ذوق کے ساتھ آپ کے پاس آئیں۔

۲۸: آپ اس غلط فہمی میں ہرگز ہرگز مبتلا نہ ہوں کہ جو لطف آپ کو تقریر سننے میں آتا ہے وہی کیفیت تقریر کے پڑھنے میں بھی حاصل ہوگی تقریر میں آواز کا دھماکہ، بادلوں کی گھن گرج، الفاظ کا اتار چڑھاؤ نہ جانے کتنی چیزوں کی آمیزش ہوتی ہے لیکن یہ بات تحریر میں نہیں لائی جاسکتی البتہ اس کی کوشش آپ اپنے انداز بیان میں اس سے بھی زیادہ کامیاب ہو جائیں جس کی تقریر سے استفادہ کیا ہے۔

خطبات میں

واعظین اور مقررین کیلئے چند اشارات

میں نے کہیں کہیں چند خصوصی ٹکڑے دیدیئے ہیں۔ لہٰذا آپ ان ہی حدوں تک محدود نہ رہ جائیں بلکہ اسے ایک مستقل عنوان بنا کر خود اس عنوان پر نئی تقریر تیار کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً

۱:۔۔۔ خاک پر ہونا اور ہے خاکی ہونا اور ہے۔

۲:۔۔۔ قرآن میں ہونا اور ہے ہمارا پانا اور ہے۔

۳:۔۔۔ کافر بنانا اور ہے کافر بتانا اور ہے۔

۴:۔۔۔ سرکار کائنات کا ہم میں آنا اور ہے۔ ہم جیسا ہونا اور ہے۔

۵:۔۔۔ قرآن کو دیکھنا اور ہے قرآن میں دیکھنا اور ہے۔

۶:۔۔۔ نبی کریم کے علم کا فی الواقع عقلاً محدود ہونا اور عملاً محدود کر لینا اور ہے۔

۷:۔۔۔ اسلام کی جنگ کفر سے ہے کافر سے نہیں۔

۸:۔۔۔ نبی مظہر الوہیت ہوتا ہے اور ولی مظہر نبوت۔

تمہید نمبر ۱
پھولوں کا ہار

حضرات! آپکے ہار کو دیکھ کر سطحِ ذہن پر ایک بھولی بسری بات ابھر آئی ہے۔ اچھا فرمائیں اسے آپ کیا کہتے ہیں۔ ہار ہار ہار۔ تو گویا سب سے پہلے مجھے ہار پہنا کر کے آپ لوگوں نے میرے ہارنے کا اعلان کر دیا تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں واپس جاؤں۔ ہاری ہوئی تقریر سننے سے کیا فائدہ؟ نہیں، نہیں ہرگز نہیں۔ آپ ارشاد فرمائیں یہ تو ہمارے ملک کا اعزاز ہے۔ ملک کو بدنام نہ کیجئے۔ یہ کیسا اعزاز ہے کہ ہارنے والے کی گلپوشی کی جائے مجمع پر مکمل سناٹا اور خاموشی۔

حضرات! میں ذہنی خلجان اور فکری تشویش میں آپ کو مبتلا رکھنا نہیں چاہتا۔ لیجئے اب اس کا نام ہار نہیں جیت ہے۔

ذرا خیال تو فرمائیے یہ پھول اب سے پہلے کہاں تھا۔ اس چمن اور باغیچہ میں تھا جہاں کوئل اور کوا کی آواز سنتا تھا۔ پرندوں کی چونچ کی ٹھوکر کھاتا تھا لیکن اب ایسی نور بھری محفل میں ہے جہاں قرآن سنتا ہے، پہلے پرندوں کی جھرمٹ میں تھا اب دیوانگان مصطفےٰ کی آغوشِ محبت میں ہے۔ درود پڑھا جا رہا ہے، چوما جا رہا ہے نعتیں پڑھی جا رہی ہیں، سونگھا جا رہا ہے۔ خدارا انصاف کا خون نہ کیجئے۔ سچ سچ بتائیے اس کی جیت کہاں ہے۔ چمن میں یا اسٹیج پر۔ لہٰذا اس کا نام ہار نہیں جیت رکھئے۔ غور فرمائیے اس کے حق میں کتنی بڑی ناانصافی ہے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بہت حضرات! اب تو آپ کا دل بھی گواہی دیتا ہوگا کہ اس کا نام ہار نہیں جیت ہی ہونا چاہئے لیکن میں اس بزم میں اپنے اگلوں کی رسوائی نہیں برداشت کرسکتا اور دانشوروں کا بہت بڑا مجمع بھی حیران ہوگا کہ الٹی گنگا کیسے بہائی جا رہی ہے۔ میں پھر آپ سے کہنا چاہتا ہوں

کہ جن لوگوں نے اس کا نام ہار رکھا بہت سوچ اور بڑی دوراندیشی سے رکھا کسی بھی حقیقت کو جذبات کی رو میں ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔

اب میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ لوگ اس کا نام جیت نہیں ہار ہی رکھئے۔ یہ صحیح ہے کہ اب یہ پرندوں میں نہیں، انسانوں کی نور و نکہت بھری محفل میں ہے۔ مگر چونکہ اپنوں سے الگ ہو گیا اپنوں سے کٹ گیا اپنوں کو چھوڑ دیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو اپنوں سے الگ ہوتا ہے وہ جیتتا نہیں ہارتا ہے۔ یہ خود گواہی دے رہا ہے کہ میں اپنوں سے الگ ہو گیا ہوں مجھے کبھی چوما جاتا ہے، گلے لگایا جاتا ہے، سونگھا جاتا ہے، دامن میں لیا جاتا ہے مگر یہ سب اعزاز چند گھنٹے کا ہے۔ صبح میرا انجام یہ ہوگا کہ میں پاؤں سے روندا جاؤں گا، کوڑے خانے میں پھینکا جاؤں گا۔ حتیٰ کہ مجھے کوئی دیکھنا بھی پسند نہ کرے گا۔ گویا میں انسانوں کے لئے مقام عبرت ہوں اے انسانو! اگر تم سر بلند اور سرفراز ہونا چاہتے ہو تو مجھ سے نصیحت حاصل کرو۔ اگر تم سرفراز اور سر بلند ہو کر رہنا چاہتے ہو تو ایک ہو کے رہو، مل جل کر رہو۔ جماعت سے کٹ جانا تباہی و بربادی ہے۔

تمہید ۲ ۔ حضرات! قرآن کریم کا ارشاد ہے یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً یعنی قرآن کے ذریعہ بہت سے لوگ گمراہ ہوئے اور بہت سے لوگ ہدایت پائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن ہدایت ہی ہدایت ہے اس میں گمراہی کا شائبہ تک نہیں۔ آپ بتائیں تو سہی معاذ اللہ اگر قرآن میں گمراہی آجائے تو انسانیت ہدایت کہاں پائے گی۔ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب آپ کو تلاش کرنا ہے۔

حضرات! اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ قرآن کی تلاوت کرنے والے دو قسم کے ہیں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو اپنے ذہن کی سادہ تختی قرآن

کے سامنے پیش کرتا ہے کہ لے قرآن تو ایمان وعقیدہ کی جو بھی دولت گرانمایہ دے گا اسے ذہن کی سادہ تختی پر لوٹ کر لیتا ہے۔

اور ایک طبقہ وہ ہے جو اپنی کالی کوٹھری میں عقیدہ بناتا ہے کہ قبر والوں کو پکارنا نہ چاہیئے۔ ان سے مدد نہ مانگنا چاہیے۔ اب عقیدہ بنانے کے بعد قرآن کے پاس آتا ہے اسلئے نہیں کہ اسے قرآن سے عقیدہ لینا ہے بلکہ اپنے خانہ ساز اور من گھڑت عقیدہ کی دلیل لینا ہے۔ چنانچہ جب وہ ان آیات کے پاس پہونچتا ہے جس میں قرآن نے بتوں کے بارے میں اعلان کیا ہے، بتوں کے پاس نہ جاؤ۔ یہ اپنے کام نہیں آتے، تمہارے کیا کام آئیں گے سنتے نہیں چلتے نہیں، بولتے نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان آیات کو پانے کے بعد اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے اپنے دعوے کی دلیل پالی۔ قرآن ایسے ہی لوگوں کے لئے فرماتا ہے یضل به کثیرًا و یهدی به کثیرا کہ قرآن سے بہت سے لوگ گمراہ ہوں گے۔

اب یہ بات آپ کے ذہن میں اتر گئی ہوگی کہ قرآن کو ذہن کے سانچہ میں نہ ڈھالا جائے بلکہ خود ذہن کو قرآن کے سانچہ میں ڈھالنا چاہیئے۔ آج بہت سی برائیوں کا یہی شاخسانہ ہے کہ آیات قرآنی کے شانِ نزول پر نظر نہیں کرتے بلکہ اپنے ذہن و فکر کے مطابق قرآن کریم کو اپنے ہی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ تمہید ذہن میں اتر گئی ہو اور ذہن و فکر نے قبول کر لیا ہو تو اس کی روشنی میں آنے والی تقریر کو ملاحظہ فرمایئے

تمہید ۳

حضرات! کسی بھی گفتگو سے پہلے آج کی تقریر سے پہلے ایک چھوٹی موٹی سی تمہید ملاحظہ فرمائیے:

قرآن کا طریقۂ خطاب یہ ہے کہ جو جس حال میں ہو، جو جس کیفیت سے

متکیف ہو جس صفت سے متصف ہو اس کو اسی کی کیفیت کے ساتھ پکارتا ہے مثلاً قل ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا یعنی آپ یہ فرمادیں کہ اے لوگو میں تم سب کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ یہاں رسالت کی دعوت عامہ دی ہے اسلئے انسان کو انسان کہہ کر پکارا جا رہا ہے کہ اے لوگو ایمان لانے اور نہ لانے کی بنیاد پر انسان کی تقسیم مومن و کافر کی تقسیم کی جائے گی۔ ابھی کسی کیفیت کا لحاظ نہیں۔

اور آگے بڑھئے۔ قرآن کہتا ہے قل ایہا الکفرون۔ اے کافرو اور آگے بڑھئے یا ایہا الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلوٰۃ اے ایمان والو جب تم نماز کا ارادہ کرو الخ اور آگے بڑھئے اذا جاءک المنٰفقون غرضیکہ قرآن کا طریقۂ خطاب یہ ہے کہ لوگوں کو لوگ کہتا ہے۔ منافقین کو منافق کہتا ہے۔ مومن کو مومن کہتا ہے اور کافر کو کافر۔ اور وہ بھی خدا مصطفٰے سے کہلواتا ہے کہ کہد یجئے اے کافرو۔ تو جب اللہ تعالٰے کے کہنے سے مصطفٰے کافر کو کافر کہہ رہے ہیں۔ تو پھر اس لمبی چوڑی زمین پر کون ہے شریعت کا ٹھیکیدار جو یہ کہے کہ کافر کو کافر نہیں کہنا چاہیے۔ قرآن سے بڑھ کر ہمارے لئے فیصلے کی کون سی کتاب ہو سکتی ہے۔

تمہید حضرات! آج کی تقریر کے لئے ضروری ہے آپ ایک چھوٹی سی تمہید ملاحظہ فرمائیں۔ اگر آپ نے اسے قبول کر لیا تو آنے والی تقریر سمجھنے اور قبول کرنے میں بہت آسان ہو جائے گی۔

حضرات! رشتہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک خون کا، ایک ایمان کا ہم اور آپ سب بھائی بھائی ہیں یہ رشتہ ایمان کا ہے! امام حسن اور سرکار حسین دونوں حقیقی بھائی تھے یہ رشتہ خون کا تھا۔ اگرچہ ایمان کا بھی رشتہ ہے اب آج آپ کو سوچنا یہ ہے کہ اگر تقابل پیدا ہو جائے تو کونسا رشتہ غالب

ہو جائیگا۔ میں پہلے ہی سے مدعی ہوا جاتا ہوں کہ ایمان اور خون کے رشتہ میں جب تقابل ہوگا تو ایمان کا رشتہ غالب اور خون کا رشتہ مغلوب ہوگا۔ اتنے بڑے مجمع میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ابولہب کو نہ جانتا ہو اور یہ بھی جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا رشتہ کیا تھا۔

حضرات آپ تمامی حضرات کو معلوم ہے کہ یہ رشتہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا سرکار کائنات کا پڑوسی تھا، وطن کے اعتبار سے مکی تھا۔ غرضیکہ سرکار کا چچا، پڑوسی، مکی یہ ساری نسبتیں حاصل ہیں لیکن وہ مسلمانوں کے پاؤں کی ٹھوکر پر ہے مسلمانوں کے پاؤں کا فٹ بال۔

لیکن ایک وہ ہے جو مکی نہیں حبشی ہے، کالا کلوٹا ہے، تتلی زبان کا ہے جس کو سرکار کائنات سے کوئی رشتہ نہیں لیکن ہر مسلمان کے کلیجہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ پوری دنیائے اسلام مکرم اور معظم جانتی ہے۔ وہ کون ہیں وہ بلال حبشی ہیں۔ ایک چچا پڑوسی مکی ہو کر پاؤں کی ٹھوکر پر رہا اسلام میں اس کو کوئی اہمیت ہی نہیں۔

اور دوسرا نہ تو کوئی رشتہ ہے نہ مکی ہے نہ پڑوسی ہے لیکن پوری دنیائے اسلام کا مقتدیٰ اور پیشوا ہے۔

معلوم ہوا کہ اسلام پہلے خون کا رشتہ نہیں دیکھتا بلکہ ایمان کا رشتہ دیکھتا ہے جو سرکار کائنات کا ہو گیا وہ پوری دنیائے اسلام سے مل گیا۔ اور جو سرکار سے کٹ گیا وہ پوری دنیائے اسلام سے کٹ گیا۔

تمہید ۵ حضرات آج آپ کا مجمع دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے یہ کوئی چھوٹا موٹا جلسہ نہیں بلکہ علاقائی کانفرنس ہو رہی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ میں پہلی بار آپ کے یہاں نہیں آیا متعدد بار آچکا ہوں۔ آپ نے مجھ کو اپنے یہاں بھی سنا ہے اور اپنے گھر کے باہر بھی سنا ہے۔ اگر میں پہلی بار آتا تو حیرت نہ ہوتی مگر بارہا

مجھے دیکھنے اور سننے کے بعد امنڈتے ہوئے سیلاب کی طرح آرہے ہیں اس لئے میں شدتِ احساس سے سوچ اور فکر میں ڈوب گیا ہوں۔ آنے سے پہلے آپ کے نفس نے آپ کو ایڑ ماری ہوگی کہ مشتاق نظامی بہت پرانا ہے اس کی تقریریں پرانی ہیں، کتاب پرانی، حدیث پرانی، واقعات اور تاریخ پرانی غرضیکہ ہر چیز پرانی۔ کہاں جاؤ گے پھر کبھی آئے گا دیکھ لینا، سن لینا مگر آپ کا حال یہ ہے کہ ؎ کچے دھاگے میں بندھے آئیں گے سرکار میرے

حضرات! انسان کی نفسیات یہ ہے کہ پرانے پن سے گھبراتا ہے مثلاً میرے عزیز گرامی مولانا عبد القیوم مصباحی جو سنی تبلیغی جماعت بھیونڈی کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لئے ہیں اور کارواں رواں دواں آگے چلا جا رہا ہے عید کا موسم آیا، مولانا اپنے بچہ کو کپڑا دلانے کے لئے بازار آئے ایک دوکان پر پہونچے۔ چکن بہت پسند آیا۔ بچے نے بھی پسند کیا۔ چنانچہ مولانا نے بچہ کے لئے چکن خرید لی۔ بچہ بہت ہی خوش۔ کپڑا تیار ہو گیا۔ کپڑا پہن کر بچہ عید گاہ جاتا ہے نماز دوگانہ ادا کرتا ہے۔ اپنا چکن سب کو دکھاتا ہے بہت ہی حساس بشاش۔ اسنے عید منائی۔ چنانچہ سال گذر گیا۔ دن بیت گئے پھر دوسری عید آئی۔ پہلے ہی سال کی طرح مولانا اپنے بچہ کو لے کر بازار گئے اور اتفاق یہ ہے کہ پہلے چکن سے اچھا چکن نظر آیا بچہ چکن دیکھتے ہی لوٹ پوٹ گیا اور بولا ابا حضور، اس کی بوٹیاں بہت اچھی ہیں ہم اسی کو لیں گے۔ باپ نے پیار و شفقت سے خرید دیا۔ بیٹا بہت خوش خوش گھر آیا پھر اس نے اپنی عید منائی۔

دن گذرتے دیر نہیں لگتی پھر تیسرے سال کی عید آگئی۔ مولانا بچہ کو لے کر بازار گئے پھر چاہا کہ بچہ کو چکن خرید دیں مگر بچہ مچلا ہوا ہے کہ ابا خواہ کتنے ہی دام کا چکن ہو لیکن میرے لئے پرانا ہو چکا ہے۔ میں نے دو سال چکن پر عید منائی لیکن اب میرے لئے یہ چکن بہت پرانا ہے خواہ کتنے ہی کم

دام کا کپڑا ہو لیکن رنگ بدل دیجیے، ڈیزائن بدل دیجیے لیکن جکن نہ خریدیے
حضرات! بچہ کا مچلنا یہ کس لئے ہے۔ اسی بنا پر کہ انسان پرانے پن سے گھبراتا ہے۔

اسی لئے میں کہہ رہا تھا کہ شیطان نے چلتے وقت آپ سے کہا ہوگا نظامی بہت پرانا ہے، کتاب بہت پرانی ہے (اللہ کا شکر ہے کہ میں پرانی کتاب، پرانا مذہب لے کر چلتا ہوں۔ نئے مذہب کو نئی کتاب چاہیے مجھے تو وہی پرانا اسلام اور پرانا مذہب ہی چاہیے۔ میں خدا کی بارگاہ میں شکر گذار ہوں)

حضرات! اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ادیب شہیر حضرت ضیاء جالوی بیٹھے ہیں۔ صبح ہوتے ہی بچہ سے کہا پانی لاؤ۔ بچہ انتہائی عقیدت و احترام سے پانی حاضر کر دیا۔ شدت کی گرمی ہے، ضیا صاحب نے پھر پانی طلب کیا۔ بچہ نے پھر پانی حاضر کر دیا۔ غرضیکہ مسلسل اسی طرح ہر گھنٹہ کے بعد پانی طلب کرتے رہے اور بچہ حاضر کرتا رہا۔ غرضیکہ دن بھر پانی پیئے۔ ہفتہ بھر پانی پیئے، مہینوں پانی پیئے، سال بھر پانی پیئے، زندگی بھر پانی پیئے، حتی کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو گلے سے پانی اتارا جاتا ہے اور وہی زندگی کا سفر پورا کرنے کے بعد عالم نزع میں ہوتا ہے تب بھی چمچہ سے گلے میں پانی اتارا جاتا ہے۔

میں حیران ہوں کہ مولانا عبدالقیوم مصباحی کا بچہ دو سال جکن پہنا تیسرے سال اس کے حق میں پرانا ہو گیا۔ اس کے برخلاف حضرت ضیاء جالوی کے صاحبزادے مولانا غلام مقتدر پانی پلاتے رہے اور ضیا صاحب عمر بھر پیتے رہے اور کبھی بھی یہ نہیں فرمایا کہ پانی میرے حق میں بہت پرانا ہو گیا مٹکا توڑ ڈالو، صراحی پھوڑ ڈالو۔ اب پانی نہیں کچھ اور لاؤ۔ حتی کہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ شربتِ روح افزا دیا جائے گا تو پینے کے بعد پھر پانی طلب کیا جائیگا

پیاس کی تشنگی پانی ہی سے بجھتی ہے۔ اب آپ ذہن پر دباؤ ڈالئے کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ جکن تین سال میں پرانا ہو جائے۔ اور پانی زندگی بھر پرانا نہ ہو سکے۔

حضرات! معلوم ہوا کہ انسان کی پیاس پانی ہی سے بجھتی ہے۔ جب کبھی پیاسا ہوگا پانی ہی دیا جائے گا جکن پرانا ہو سکتا ہے لیکن پانی پرانا نہیں ہو سکتا معلوم ہوا جب آدمی پیاسا ہوتا ہے تو یہ پیاس پانی ہی سے بجھتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ کپڑا پرانا ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کی روح کیلئے ذکر مصطفٰے کبھی بھی پرانا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پیدا ہوتا ہے تو اذان میں اشہد ان محمد رسول اللہ کہا جاتا ہے۔ اور مرنے کے بعد قبر میں سپرد خاک کرنے کے بعد اشہد ان محمد رسول اللہ پکارا جاتا ہے۔ یعنی پیدا ہو تو ذکر مصطفٰے اور جب آغوش لحد میں جائے تو ذکر مصطفٰے۔ سرکار کائنات کے ذکر کی یہ برکت ہے۔

اسی لئے میں نے کہا تھا کہ شیطان نے بہت چاہا کہ آپ جلسہ میں نہ جائیں لیکن عشق مصطفٰے کی بندھن میں بندھے چلے آئے ؎

عشق احمد دیکھئے میرا لڑکپن دیکھئے
زلف کی زنجیر اور ننھی سی گردن دیکھئے

تمہید ۶

حضرات! آج کی گفتگو کے لئے ایک تمہید کا سماعت فرمانا بہت ضروری ہے۔ تمہید اس لئے ہوتی ہے کہ آنے والے مضمون کو سمجھنے اور قبول کرنے کو ذہن آمادہ ہو جائے۔

اب آپ چند جملوں کی تمہید کو بہت ہوشمندی سے ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی بعض بعض خصوصیات میں اتنے ممتاز و منفرد ہیں کہ کوئی نبی، کوئی رسول اس میں شریک نہیں۔ مثلاً ہر نبی کو نبی کہا جائیگا، ہر رسول کو رسول کہا جائیگا لیکن سید عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو

خاتم النبیین کہا جائیگا۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جو صرف میرے سرکار کے ساتھ پایا جائے گا۔ اور کہیں نہیں۔ اب آپ یہاں ذہنی انتشار میں مبتلا نہ ہوں جیسا کہ بعض بدنصیبوں نے یہ سوچا کہ آخر النبی ہونا یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کسی کا آخر میں آنا یہ کوئی قابل ذکر صفت نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے اپنی کتابوں تک میں لکھ دیا ہے۔ حالانکہ خاتم النبیین ایک بہت ہی اہم سوال کا جواب ہے۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول کائنات کی ذات گرامی ممکن النظیر ہے یا ممتنع النظیر ہے۔ ہم اہلسنت وجماعت کا عقیدہ ہے کہ سرکار کی ذات گرامی ممتنع النظیر ہے یعنی ان کے مثل پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے برخلاف بدعقیدہ اور گمراہ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ سرکار کی ذات والاصفات ممکن النظیر ہے۔ یعنی ان کے مثل پیدا ہونا ممکن ہے۔ اسی بنیاد پر لکھا گیا ہے کہ اللہ کی قدرت سے بعید نہیں کہ اگر وہ چاہے تو محمد جیسے سینکڑوں محمد پیدا کر سکتا ہے۔

حضرات! یہ ایک کانٹے کی بحث ہے۔ اب آپ پوری طرح متوجہ ہو جائیں میں نے یہ عرض کیا ہے کہ خاتم النبیین ممتنع النظیر ہونے کی بہت ہی اہم دلیل ہے۔

دیکھئے خاتم ایک ہوتا ہے دو نہیں۔ مثلاً یہ آج کا اجلاس فاضل گرامی مولانا جہانگیر خاں صاحب نے مدعو کیا ہے لیکن انھوں نے یہ بھی اہتمام کیا ہے کہ جلسے میں داخل ہونے کے لئے ایک بہت بڑا پھاٹک تیار کرایا ہے اور یہ بھی اعلان کیا ہے کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد پھاٹک بند کر دیا جائیگا۔ اور ٹھیک دس بجے رات پھاٹک کھولا جائے گا اور اسی کے ساتھ ایک اہتمام یہ بھی ہے۔ کہ پھاٹک سے متصل ایک میز، ایک کرسی، میز پر ایک رجسٹر اور قلم اور ایک منشی بیٹھا ہوا ہے۔ اور اس کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جو پھاٹک کھلنے کے بعد جو سب سے پہلے آئے اس کا نام لکھ لو۔ اس کے بعد

قلم روک دو۔ ہزاروں جاتے رہیں جانے دو۔ کچھ لکھنا نہیں۔ اور جلسہ ختم ہونے کے بعد جو سب سے آخر میں جائے جس کے بعد کوئی جانے والا نہ ہو اس کا نام لکھ لو۔ اب میں انصاف چاہتا ہوں کہ رجسٹر میں کتنے نام نظر آئیں گے۔ معلوم ہوا اول بھی ایک آخر بھی ایک۔ آخر دو نہیں ہوتا ایک ہی ہوتا ہے اس لئے میں نے عرض کیا کہ خاتم النبیین، ممتنع النظیر کی بہت ہی اہم دلیل ہے۔ سرکار کے بعد کسی کا آنا اگر مانا جائے تو کذب باری لازم آئے گا۔

یہاں پہونچ کر آپ ایک سوال کر سکتے ہیں کہ کوئی خود تو نہیں پیدا ہوتا اللہ تعالےٰ پیدا فرماتا ہے تو کیا اللہ تعالےٰ ابھی نہیں پیدا فرما سکتا۔

جی ہاں میرے کہنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نہیں پیدا فرمائے گا۔ چنانچہ انبیاء و رسل کو اللہ ہی نے پیدا فرمایا ہے اور نبوت و رسالت عطا فرمائی۔ ہر نبی و رسول کے ساتھ اپنی قدرت کا اظہار فرمایا ہے میں جس کو چاہوں رسول بناؤں میں جس کو چاہوں نبی بناؤں۔ لیکن جب میرے سرکار کی باری آئی تو اللہ تعالےٰ نے اپنی قدرت کا بھی اظہار فرمایا اور اپنی مرضی کا بھی اعلان فرما دیا خاتم النبیین فرما کر۔ یعنی اب تک تو میں نبی و رسول پیدا کرتا رہا لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں پیدا ہوگا۔ تو جب نبوت و رسالت عطا فرمانے والے پروردگار نے اپنی مرضی کا اعلان فرما دیا۔ تو اللہ تعالےٰ کی اس لمبی چوڑی زمین پر اب کون ٹھیکیدار ہے جو خدا کے کلام کی تکذیب کرنا چاہتا ہے۔

اب اگر کوئی پیدا ہو تو خواہ تمام صفتوں میں مصطفےٰ سے مشابہ ہو لیکن وہ خاتم نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوا کہ خاتم ایک ایسی صفت ہے جس نے ممتنع النظیر کا مسئلہ حل کر دیا یعنی اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مثل کوئی پیدا نہیں ہو سکتا۔

تمہید حضرات! یہ بات آپ کے علم میں آچکی ہے کہ آج میرا عنوان معراج جسمانی ہے۔ ایک بہت ہی بولتا ہوا عنوان ہے معراج تو دراصل نکات کا مجموعہ ہے جس قدر غور کرتے چلے جائیے اسرار و رموز کھلتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کا اسرار و بھید اس میں سمو دیا گیا ہے۔ مجھے واقعات پر نہیں بولنا ہے بلکہ جو حقائق پنہاں ہیں انھیں کو آشکارا کرنا ہے۔

میں نے اپنے عنوان کے ساتھ جسمانی کی قید لگائی ہے چونکہ بعض لوگ سے معراج روحانی کہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں بعبدہٖ کہا گیا ہے اور عبد کہتے ہیں روح مع الجسد کو۔ اگر بدن نہیں ہے تو اسے عبد کیسے کہا جائیگا۔؟

بات کا بتنگڑ بنانے سے کیا فائدہ۔ بنیادی غلطی یہ ہے کہ لوگوں نے سرکار کائنات کی حقیقت پر غور نہیں کیا ہے ورنہ آپ اس حقیقت کو یہیں بیٹھے بیٹھے غور کیجئے۔ یہ اسٹیج کی بہت بڑی زینت ہیں کہ مفکر اسلام حضرت مولانا حسن رضا خاں صاحب کے بارے میں۔ آپ فرماتے ہیں کہ مولانا اپنے مکان تشریف لے گئے، کبھی آپ کہتے ہیں مولانا پٹنہ چلے گئے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ مولانا مدرسہ شمس الہدیٰ تشریف لے گئے۔ پھر کبھی فرماتے ہیں کہ مولانا ادارۂ تحقیقات گئے ہیں۔ انتہائی حیرت کا مقام ہے کہ زید، عمرو، بکر، خالد سب اپنے اپنے مکان آتے جاتے رہتے ہیں آپ سنتے بھی ہیں اور دیکھتے بھی ہیں مگر آپ کا ماتھا کبھی نہ ٹھنکا کہ مفکر اسلام اپنے مکان کیسے گئے۔ آپ بارہا سنتے ہیں مگر آپ خاموش رہتے ہیں لیکن سرکار کائنات ایک رات اپنے ہی گھر گئے۔ یہ سنتے ہی آپ کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔ دنیا اپنے گھر آئے جائے تو آپ کو کوئی حیرت نہ ہو اور کبھی یہ سن لیں کہ سرکار عرش معلیٰ سے بھی آگے گئے وہاں گئے اتنی بلندی پر پہنچے جہاں جبرئیل کا ذہن بھی نہ جا سکا۔ یہ سنتے ہی

آپ کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے جس بےچین ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ نے سرکار کا گھر ہی نہیں سمجھا۔ اگر یہی سمجھ لیتے تو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوتا۔

تمہید حضرت ہم میں سے اکثر لوگوں کی فطرت ہے کہ ہم باغ و باغیچہ لگاتے ہیں، رنگ برنگ گوناگوں، طرح طرح کے پھولوں سے باغ کو سجاتے ہیں۔ اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ چمن اتنا سجا سجایا ہو کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اس میں فلاں پھول نہیں ہے۔ کبھی جب احباب باغیچہ دیکھنے آتے ہیں تو انھیں کیاری کیاری روش روش گھما کر تمام پھولوں کو دکھایا جاتا ہے، جس پھول کے پاس آپ کھڑے ہوں گے اسی پھول کی خوشبو پائیں گے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے دوست کو گھومنے پھرنے کی زحمت کیوں دی جائے۔ باغ کا ایک گلدستہ تیار کیا جائے تاکہ ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر پورے باغ کا معائنہ کر لیا جائے اور اندازہ ہو جائے کہ چمنستان میں کتنے پھول ہیں۔ بس بلاتشبیہ و تمثیل پروردگار عالم نے باغ رسالت اور باغ نبوت کو سجایا سنوارا۔ اسی چمنستانِ نبوت کی ایک کلی حضرت آدم بن کر آئے، حضرت نوح اسی کے پھول بن کر آئے، حضرت سلیمان، حضرت ابراہیم خلیل یہ سب اسی باغ رسالت و باغ نبوت کی الگ الگ کلیاں اور رنگ برنگ کے پھول ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السّلام، حضرت موسیٰ علیہ السّلام، حضرت عیسیٰ علیہ السّلام یہ سب کے سب اسی باغ نبوت کے شاداب پھول ہیں۔ ہر ایک کا رنگ جدا ہر ایک کی مہک الگ لیکن خدائے قدیر نے جب یہ چاہا کہ باغ رسالت اور باغ نبوت کا ایک گلدستہ تیار کیا جائے تو رب کریم نے ایک بہت ہی حسین و خوبصورت گلدستہ تیار کیا جس کا نام نامی سرکار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ ایک ہی جلوہ نہیں ہے ہزاروں جلوے سمو دیئے گئے ہیں۔

کسی نے بہت خوب کہا ہے :-

حسنِ یوسف ، دمِ عیسیٰ ، یدِ بیضا داری !!
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اب باغ کی سیر کرنا نہیں ہے ، باغ کا خلاصہ و نچوڑ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ علاحدہ علاحدہ حضرت آدم سے لے کر حضرت مسیح علیہم الصلوٰۃ والسلام تک کے جلوے نظر آئیں گے۔

اب آپ آنے والی تقریر ملاحظہ فرمائیے :

تمہید حضرات! آج آپ کو جس مضمون کو سمجھنا ہے اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس کے لئے ہم اور آپ یہ غور و فکر کریں کہ ایک حاجی صاحب کے سامنے یہ کہیے کہ مدینہ شریف ۔ تو بولتے ہیں کہ میں گنبدِ خضریٰ دیکھ رہا ہوں ، جالی مبارک کو دیکھ رہا ہوں ، حرم کعبہ دیکھ رہا ہوں ، صفا و منی دیکھ رہا ہوں۔

جس نے لندن اور امریکہ دیکھا ہو اس کے سامنے لندن اور امریکہ کہیے تو کہتا ہے کہ میں لندن اور امریکہ کا ایرپورٹ دیکھ رہا ہوں۔ لندن اور امریکہ کا بازار دیکھ رہا ہوں۔ حالانکہ ہمارے اور آپ کے درمیان موجود ہیں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے سفر نہیں کیا ، چلا نہیں ، گیا نہیں تو اسے دیکھا کیسے۔

حضرات! یہاں سے معلوم ہوا چلنا دو طرح کا ہے ایک پاؤں کا چلنا ہے ایک تصورات و تخیلات کا چلنا ہے۔ جب مدینہ کہا گیا تو اس نے کہا کہ میں گنبدِ خضریٰ دیکھ رہا ہوں ۔ وہ پاؤں سے چل کر نہیں گیا بلکہ اس کا تصور پہنچ گیا ، اس کا خیال پہنچ گیا ، وہ تصور کی دنیا میں گنبدِ خضریٰ بھی دیکھ رہا ہے ، جالی مبارک بھی دیکھ رہا ہے ۔ حرم کعبہ بھی دیکھ رہا ہے اور جو کچھ کہہ رہا ہے بالکل سچ کہہ رہا ہے

اب غور یہ کرنا ہے کہ ہم اور آپ بھی لوگ سرکارِ کائنات کے غلام ہیں جب ہم غلام ہیں تو ہمارا ذہن ، ہماری فکر ، ہمارا تصور ، ہمارا خیال یہ سب کے

سب آقائے کائنات کے غلام ہیں۔ اور یہیں سے سمجھنا چاہئے کہ جیسے مدینہ کہا حاجی صاحب بول اٹھے میں گنبد خضریٰ دیکھ رہا ہوں اور وہ بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔

حضرات! وہ پاؤں سے مدینہ نہیں گئے نہ ٹرین اور طیارہ سے گئے بلکہ ان کے تصور اور خیال کی رفتار اتنی تیز ہے کہ جیسے سنا ایک لمحہ میں اپنے تصور اور خیال کی دنیا میں مدینہ شریف حاضر ہو گئے۔

اب آپ غور فرمائیے کہ ہم سرکار کے غلام اور ہمارا تصور اور خیال بھی غلام تو مجھے کہنے دیجئے جس کے غلام کی رفتار اتنی تیز ہو گی اس کے آقا کی رفتار کتنی تیز ہو گی، کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟

تمہید حضرات! آج میری تقریر کا عنوان سیرت پاک ہے۔ آپ کچھ بھی سنئے۔ پہلے چند جملے سماعت فرمائیں۔ شاید کہ یہی چند جملے میری تقریر کی تمہید بن جائیں۔

حضرات! آج کی ترقی یافتہ دنیا کو اپنی ترقیات پر بہت ناز ہے۔ ہر ملک اپنے مقابل ملک سے اس دور میں سبقت لے جانا چاہتا ہے دانشوروں کی بزم میں یہ کہتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ ہم یہ مانتے ہیں کہ تم بہت بڑھ گئے ہو اور اتنا بڑھ گئے ہو کہ اب زمین پر رہنے کے بجائے چاند اور مریخ کی دنیا میں رہنا چاہتے ہو۔ ہم اس دوڑ میں بہت پیچھے ہیں لیکن احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہم اس ترقی یافتہ دور میں کسی ملک اور صوبہ سے نہیں بلکہ دنیا سے ایک ایسا آدمی چاہتے ہیں کہ جو بیک وقت پوری دنیا کو خطاب کرے۔ تم علم و عمل میں جو کچھ بننا چاہتے ہو میرے پاس آجاؤ، مفسر بننا ہو یا محدّث بننا ہو، مؤرخ بننا ہو یا مصنف بننا ہو، مجاہد بننا ہو یا عابد شب زندہ دار بننا ہو شہسوار بننا ہو یا تو انگر بننا ہو، علم ہندسہ لینا ہو یا علم ریاضی لینا ہو طبعیات

کا مسئلہ ہو یا فلکیات کا، علم الابدان ہو یا علم الادیان۔ غرضیکہ اپنے ذوق کے مطابق جو کچھ لینا ہو اس کے لئے میری درسگاہ میں چلے آؤ۔ یہ سنتے ہی دانشوروں کی محفل میں سناٹا چھا جائیگا۔ آج دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے کہ جس کے پاس کوئی ایسا آدمی ہو جس میں اتنی جامعیت پائی جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مسلمان اپنی پیشانی اونچی کر کے چل سکتا ہے۔ یہ گوہر بے مایہ اگر ہے تو صرف مسلمان کے پاس ہے وہ ذات گرامی سرور لولاک سید عالم روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ ایک نبی، ایک کتاب اور اصحاب صفہ جس کو عالمی یونیورسٹی کہا جا سکتا ہے اسی چبوترے پر بیٹھ کر اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کے ذریعہ پوری دنیائے اسلام کو سیدنا صدیق اکبر جیسی عظیم ترین و بلند و بالا شخصیت دی سیدنا فاروق اعظم، سیدنا عثمان غنی، سیدنا مولا علی رضی اللہ عنہم جیسے چاند ستارے دیئے اور سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ اور سیدنا حسنین کریمین و سیدنا سرکار غوث اعظم سرکار سلطان الہند خواجہ غریب نواز و سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالےٰ عنہم جیسی عبقری و باوقار شخصیتوں سے دنیا کو مالا مال فرمایا۔

آج جب ان میں سے کسی کا جواب نہیں لایا جا سکتا تو وہ شہنشاہِ دو عالم سلطان دارین مالک کونین روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب کہاں سے لایا جا سکتا ہے۔

اے دنیا کے دانشورو! تم اس دولت بے بہا سے کل بھی خالی تھے آج بھی خالی ہو اور ہمیشہ کے لئے خالی ہو۔ یہ دولت تو اسلام صرف اسلام اور مسلمانوں کے نصیبہ میں ہے۔

حیرت ہے تمہاری دانشوری اور دانائی پر کہ آج کھربوں روپیہ اس بات پر خرچ کیا جاتا ہے کہ کوئی ایسا آتشی اسلحہ تیار کیا جائے کہ اگر طیارہ سے زمین پر گرایا جائے تو لاکھوں اور کروڑوں کی آبادی جل کر خاک ہو جائے اے دانشورو! آج تم کھربوں روپیہ اس بات پر خرچ کرتے ہو کہ

انسانوں کو کیسے مارا جائے۔ اور میرے مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثنا مسجد نبوی میں۔ کھجوروں کی چٹائی پر بیٹھ کر یہ سوچا کرتے تھے کہ انسانوں کو جِلایا کیسے جائے۔

ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

تمہید ۱۱ حضرات! تقریر سے پہلے ایک بات ملاحظہ فرمائیے۔ ایک ہے سُنّی اور دوسرے سنی کی علامت اور پہچان۔ کہنا یہ ہے کہ سُنّی کی تعریف اور ہے اور سنیت کی علامت و پہچان اور ہے۔

مثلاً اولیائے کرام کے آستانوں پر جانے والا، میلاد، سلام، قیام کا کرنے والا، نیاز فاتحہ کا دلانے والا، تعظیم مصطفےٰ بجالانے والا، اسے سنی کہا جائے گا۔ مگر یہ سنی کی تعریف نہیں ہے۔ یہ علامات سنیت ہیں۔ ان چیزوں سے سُنّی پہچانا جاتا ہے۔ مثلاً مسجد میں اذان سے قبل پانچ سو آدمی حاضر ہیں۔ مؤذن نے اذان پکاری اشہد ان محمد رسول اللہ پر ۴۹۰ چار سو نوے آدمیوں نے انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ لیکن انھیں میں سے دس اپنی اکڑفوں میں بیٹھے رہ گئے۔ کسی کی پیشانی پر یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ سُنّی ہے، یہ سنّی نہیں ہے لیکن آج کے دور میں اذان میں سرکار کے نام کو سن کر انگوٹھا چوم کر آنکھوں سے لگانا علاماتِ سنیت سے ہے۔ ہر ایک دوسرے کو سمجھ جاتا ہے کہ یہ سنی ہے، مصطفےٰ والا ہے اور ہمارا ہے۔

مجھے کہنا یہ ہے کہ کبھی کبھار بعض بعض چیزیں دیکھنے میں ہلکی پھلکی معلوم ہوتی ہیں لیکن نتیجۃً وہ بہت بڑی ثابت ہوتی ہیں۔ ہم اہلسنت و جماعت اپنی علامات و پہچان کو مٹاتے نہیں بلکہ اپنے عمل و کردار سے زندہ رکھتے ہیں۔ اور غالباً دنیا کی کوئی بھی زندہ قوم اپنی علامت کو مٹانا پسند نہ کرے گی۔ ہم اہلسنت و جماعت جب سرکار کا نام سن کر انگوٹھا چومتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں تو بہت سے لوگ ہمیں یہ طعنہ دیتے ہیں کہ

یہ پاگل اور دیوانوں کی جماعت ہے۔

ہمیں کہنے دیجیے کہ ہمارا دشمن بھی ہمیں دیوانہ کہتا ہے تو کسی کا نہیں بلکہ مصطفےٰ کا دیوانہ کہتا ہے۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تم نے اس دیوانگی کو سمجھا ہی نہیں۔ یہ ایرے غیرے، نتھو، خیرو کو نہیں ملتی جو مقدر کا سکندر ہے یہ دولت اسے ملتی ہے۔ آپ بمبئی کی بہت اچھی مارکیٹ میں جائیے جہاں پر لوگ ہزاروں ہزار کا لباس پہنے چل رہے ہیں۔ کوئی کسی کو خاطر میں نہیں لاتا

لیکن اسی سڑک کے کنارے سے پھٹے پرانے کمبل میں ایک دیوانہ چلا جاتا ہے تو ہزاروں کا لباس پہننے والے آپس میں کانا پھوسی کرتے ہیں انگلیوں کا اشارہ کرتے ہیں۔ ارے دیکھو دیوانہ جا رہا ہے۔ ارے دیکھو دیوانہ جا رہا ہے۔ ہزاروں کے لباس کو کسی نے نہیں پوچھا لیکن دیوانہ سب کی نظروں میں آگیا ہر ایک کا مرکز توجہ بن گیا۔ اب آپ سوچو یہ کیسا راز ہے۔

حضرات! اونچے لباس والوں کا لباس ان کی جیب کا خریدا ہوا ہے لیکن کمبل پوش کا لباس یہ محبوب کا عطیہ ہے یہ سب کو نہیں ملتا۔ یہ تقدیر والوں کا نصیبہ ہے۔ سیماب نے سچ کہا:

دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا لیں،

حضرات! میں کہہ یہ رہا تھا کہ سنّی مسلمان اپنی علامتوں کو باقی رکھتا ہے، چھوڑتا نہیں۔ میلاد، قیام، سلام، نیاز، مزارات کی حاضری ان تمام چیزوں کو فرض اور واجب نہیں کہتا، مہمات دین میں شمار نہیں کرتا۔ لیکن اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ قوم جن چیزوں سے پہچانی جاتی ہے اسے مٹاتی نہیں بلکہ زندہ رکھتی ہے۔ اگر ایک قوم کی حیثیت سے اسے زندہ رہنا ہے تو اپنے تشخص کو برقرار رکھے گی۔

تمہید ۱۲ حضرات ملک کا دستور ہے کہ وہ اپنے رہبر اور رہنما کا پروپیگنڈہ کرتا ہے۔ اس کی دانشوری اس کی سیاسی سوجھ بوجھ اس کے کردار کی برتری رعایا پروری حسن اخلاق، نظم وضبط کا پروپیگنڈہ کرکے اس کو عالمی برادری میں فوقیت دیتا ہے مثلاً ہمارا ملک بھارت ہے اس کے وزیراعظم راجو گاندھی ہیں ان کا پروپیگنڈہ کرنا یہاں کے اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن کی فرض شناسی ہے یہ جو کچھ بھی کہیں گے وزیراعظم کی تعریف میں کہیں گے۔ کہنا یہ ہے کہ راجو گاندھی کی تعریف کرنا یہ ہندوستان کی ذمہ داری ہے۔ پاکستان کی نہیں۔ مسز بے نظیر بھٹو کی تعریف اور پروپیگنڈہ کرنا یہ پاکستان کی ذمہ داری ہے، ہندوستان کی نہیں۔ ایسے تمام ممالک کو قیاس کر لیجئے۔

حضرات! اب آپ خیال فرمائیے مذہبی اسٹیج پر جب بھی کوئی خطیب اور مقرر آتا ہے تو وہ قرآن کریم کی کسی بھی آیت کو اپنا عنوان بناتا ہے یہ اسی اصول کا نتیجہ ہے کہ ہر مملکت اپنے پیشوا کی تعریف وتوصیف اور پروپیگنڈہ کرتا ہے۔ بس ایسے ہی سرکار دو عالم پوری عالم انسانیت کے رہبر ورہنما بن کر آئے ہیں۔ اور آسمان کی اتاری ہوئی کتاب قرآن عظیم تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے ہے۔ روئے زمین پر بسنے والا ہر انسان اپنی ہدایت کے لئے قرآن عظیم کا محتاج ہے۔ مصطفےٰ ساری کائنات کے پیغمبر اور راہنما ہیں اور قرآن حکیم ساری کائنات کے لئے کتاب ہدایت ہے۔

لہٰذا مصطفےٰ کو قرآن میں دیکھا جائیگا۔ تقویۃ الایمان میں نہیں اس لئے ہر خطیب ومقرر قرآن ہی کو اپنا عنوان بناتا ہے۔ چونکہ مصطفےٰ کے پروپیگنڈہ کی ذمہ داری قرآن پر ہے نہ کہ دوسری کتابوں پر۔

تمہید ۱۳ حضرات! آج کا بولتا ہوا نعرہ اتحاد ہے خواہ وہ کتنی ہی تخریب کاری میں مبتلا ہو۔ نفاق اور انتشار کی آگ لگاتا ہو لیکن اس کا بھی نعرہ ہے

اتحاد اتحاد۔ آپ پوچھے اور سوال کیجئے اتحاد کیسے ہوگا، پارٹیاں بہت سی ہیں کانگریس ہے، لوک دل ہے، سوسلسٹ ہے، کمیونسٹ ہے اور دیگر بہت سی علاقائی پارٹیاں ہیں۔ یہ ہل جلانے والوں کی جماعت نہیں ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی گروپ بندی ہے۔ آخرش یہ سب ایک کیوں نہیں ہو جاتے۔

حضرات! اس حقیقت کو آپ کو ماننا پڑے گا کہ اتحاد کا نعرہ بہت پرکشش نعرہ ہے، بڑی جاذبیت ہے۔ اور نعرہ دینے والے بھی بہت پرکشش ہیں۔ لیکن ہمیں کہنے دیجئے کہ نعرہ دیا جا رہا ہے لیکن حقیقت کو سمجھایا نہیں جا رہا ہے بلکہ قوم کے جذبات سے کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

آپ دانشور ہیں آپ خود سوچئے اور فیصلہ کیجئے کہ جب لوگوں میں بنیادی، کلیدی اور اصولوں کا اختلاف ہوگا تو آپس کا اتحاد فروعی مسائل میں کیونکر ہو سکتا ہے۔ مثلاً میلاد شریف کی محفل میں آپ چاہتے ہیں کہ ہر مکتبۂ فکر کو شریک کیا جائے، لیکن کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ جو لوگ رسول خدا کو اپنا جیسا بشر کہتے ہوں، گاؤں کا چودھری اور زمیندار مانتے ہوں تو وہ کیونکر اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔

سوال میلاد، قیام کا نہیں رہ جاتا ہے بلکہ ذات رسالت کے ماننے اور نہ ماننے کا پیدا ہوتا ہے۔ ہم تو خود کہتے ہیں کہ جو لوگ میلاد نہیں کرتے یقیناً انھیں میلاد نہیں کرنا چاہئے۔ چونکہ میلاد زمیندار اور گاؤں کے چودھری کا نہیں کیا جاتا بلکہ میلاد محبوب کبریا اور شفیع محشر کا کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں سے پہلے میلاد نہیں منوایا جائیگا بلکہ ان کے سیاہ دلوں میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت و محبت اتاری جائیگی۔ ان کے دلوں میں جب عشق مصطفےٰ کا نور آجائے گا تو بغیر کہے بغیر پوچھے یہ خود ہی میلاد کے قائل ہو جائیں گے۔ اس لئے بحث ان سے میلاد کی نہ کی جائے بلکہ سرکار رسالت کے ماننے کی طرح ماننے کی گفتگو کی جائے۔ اس لئے عصر حاضر کے ابتدائی دور کے علماء کو یاد رکھنا چاہئے

کہ مناظرہ میلاد، سلام، قیام پر کرنے کے بجائے ان کی ان کفری عبارات پر کرنا چاہئے۔ جو کفر اور اسلام کے درمیان حدّ فاصل ہے۔ اگر کوئی میلاد کا قائل ہو جائے اور مزارات پر حاضری دینے لگے اور سرکار کائنات کی معاذ اللہ توہین بھی کرتا رہے تو میلاد شریف اور مزارات کی حاضری اس کے کچھ نہ کام آئے گی میلاد شریف اور آستانہ جات کی حاضری سے پہلے ایمان چاہئے۔

اسلئے خوبصورت نعروں سے کام نہیں چلتا ہے اور اتحاد بھی خربوزہ جیسا ہو، سنگترہ جیسا نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بہت سے خربوزے اس قسم کے ہوتے ہیں جن کی اوپری سطح پر لکیریں بنی ہوتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اندر بھی یہ خربوزہ الگ الگ کٹا ہوا ہوگا۔ اس کے برخلاف سنگترہ اوپر سے بالکل چکنا ہوتا ہے لیکن چھیلنے پر قاش قاش علاحدہ ہوتی ہے۔

کہنا یہ ہے کہ مومن کا مومن سے اتحاد ہوتا ہے غیر مومن سے نہیں۔ ایمان میں متحد ہو جائیں گے ایمان کے تحت جو بھی مسائل آئیں گے اس میں خود بخود اتحاد ہو جائے گا۔

خلقِ اوّل

میرے سرکارِ عالمِ امکاں کی خشتِ اوّل اور پہلی کڑی ہیں۔ خدائے ذوالجلال نے سب سے پہلے میرے مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثنار کو پیدا فرمایا۔ اور ساری کائنات انھیں کے صدقے میں منصۂ شہود میں آئی۔

آج آپ حضرات کو خلق اول کا بنیادی فلسفہ سمجھنا ہے کہ رب نے سب سے پہلے میرے سرکار کو کیوں پیدا فرمایا؟ اسی کے منطقی شواہد سمجھنے ہیں۔ گویا اس میں اشارہ ہے کہ اگر میری خالقیت کا کمال دیکھنا ہو تو بدر کامل کا چہرہ مت دیکھو، مصطفےٰ کا تلوا دیکھو۔ یعنی انھیں دیکھو، مجھے پہچانو۔

خدا کرے اس اہم مضمون کو میں سمجھا سکوں اور آپ سمجھنے کا حق ادا کرسکیں۔ گویا آج کی گفتگو اس شعر کی مصداق ہے ؎

مختصر اتنا کہ دو حرفوں سے بن جاتا ہے دل
اور طویل اتنا کہ اس میں دو جہاں کا درد ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

امّا بعد۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اوّل ما خلق اللہ نوری کل خلائق من نوری و انا من نور اللہ

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے "خلق اوّل" محترم حضرات جسے ہم اور آپ دنیا اور کائنات کہتے ہیں۔ اس پر ایک ایسا دور اور ایک ایسا زمانہ بھی گذرا ہے کہ ذاتِ باری کے سوا اس کائنات میں کچھ بھی نہیں تھا بس اللہ کی ذات، اللہ کے صفات، حسن الٰہی، تجلّی الٰہی، صفاتِ باری کے سوا کچھ بھی نہ تھا بس وہی وہ تھا۔ وہ اپنی ذات وصفات دونوں میں قدیم ہے اس کی کوئی بھی صفت ایسی نہیں جو نہ رہی ہو، ہو گئی ہو۔ ایسا تو مخلوقات و ممکنات اور حوادثات میں ہوتا ہے۔ عالم نہیں تھے، کورس مکمل کیا عالم ہو گئے۔ حافظ نہیں تھے، حفظ مکمل کیا حافظ ہو گئے۔ ڈاکٹر نہیں تھے، ڈگری حاصل کی ڈاکٹر ہو گئے۔ وکیل نہیں تھے، ایل، ایل، بی کیا وکیل ہو گئے۔

غرض کہ یہ ممکنات کی صفات ہیں کہ پہلے نہ تھیں بعد میں ہو گئیں مگر ذاتِ الٰہی اپنی ذات وصفات دونوں میں قدیم ہے۔ اسی لئے مسلمان ہونے کے اعتبار سے ہم دو لفظ بولتے ہیں "ازلی" اور "ابدی"۔

ازل کی تعریف ہے مالا بدایۃ لہ جس کی کوئی ابتدا نہ ہو۔ اور "ابد" کہتے ہیں جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔ مالا نہایۃ لہ یعنی قدیم کسی

کے لئے بول سکتے ہیں تو صرف ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ اور اسکی صفات کے لئے۔ چونکہ وہ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی۔ نہ اس کی ابتدا ہے اور نہ اس کی کوئی انتہا۔

اس مفہوم کو سمجھنا ہو تو اس آیت میں غور کیجئے۔ مثلاً خدائے تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اے پیارے کہدو اللہ ایک ہے۔

نکتہ :- حضرات! یہ بات تو یوں بھی کہی جا سکتی تھی کہ میں ایک ہوں مگر خدا یہ نہیں فرماتا کہ "میں ایک ہوں" بلکہ پیارے تم کہدو "وہ ایک ہے" اس میں گویا اشارہ اس طرف ہے جب میری بات آئے تو تم کہدو اور جب تمہاری بات آئے تو میں کہدوں۔ مثلاً تم یہ کہدو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور میں کہدوں گا قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۔ تم لوگوں میں اللہ کی طرف سے نور آیا اور روشن کتاب۔

دوسرا نکتہ یہ بھی ہے کہ ساری کائنات کہے کہ وہ اللہ ایک ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے بات تو جب بھاری بھر کم ہو کہ خود میرا محبوب کہدے کہ "وہ اللہ ایک ہے" ساری کائنات ایک طرف، محبوب کی بات ایک طرف۔

میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ آیت میں اللہ کی ازلیت اور ابدیت کا راز سربستہ تلاش کیجئے۔ اور ان گرہوں کو کھولئے جس سے اس کی ازلیت اور ابدیت آشکارا ہو سکے۔

حضرات! اب میں آپ کی خصوصی توجہ کا طلبگار ہوں۔ غور فرمایئے خدا فرماتا ہے مصطفےٰ کہدو "وہ اللہ ایک ہے۔ اس ایک میں اشارہ اس طرف ہے کہ ایک سے عدد بنتا تو ہے مگر خود ایک عدد نہیں ہے۔

آپ جیسے اہل علم اور دانشوروں کو معلوم ہے کہ عدد کہتے ہیں "مجموعۂ حاشیتین کے نصف کو" یعنی عدد اسے کہتے ہیں جو اس کے پہلے ہو اور جو اس کے بعد۔ پہلے ان دونوں کو جمع کر دو۔ پھر جمع کرنے کے بعد اس کا نصف کر دو۔ نصف کرنے کے بعد جو حاصل آئے اسی کو عدد کہتے ہیں مثلاً دو۲ عدد ہے۔ کیونکہ دو سے پہلے ایک ہے۔ اور دو کے بعد تین۔ اب ایک اور تین کو جمع کر دیجئے۔ کتنا ہوا۔ چار۔ پھر چار کا نصف کر دیجئے تو کتنا بچا۔ دو۲۔

ایسے ہی چار۴ عدد ہے۔ کیونکہ چار کے پہلے تین۔ چار کے بعد پانچ پانچ اور تین آٹھ۔ اور آٹھ کا نصف چار۔

۵ عدد ہے کیوں؟ پانچ کے پہلے چار۔ پانچ کے بعد چھ۶۔ چھ اور چار دس۔ دس کا آدھا پانچ۔

دس۱۰ عدد ہے کیوں؟ دس کے پہلے نو۔ دس کے بعد گیارہ۔ گیارہ اور نو بیس۲۰۔ بیس کا آدھا دس۱۰۔

بیس۲۰ عدد ہے کیوں؟ بیس کے پہلے انیس۔ بیس کے بعد اکیس انیس اور اکیس چالیس۔ چالیس کا آدھا بیس۲۰۔

پچاس عدد ہے کیوں۔؟ پچاس سے پہلے انچاس۔ پچاس کے بعد اکیاون۔ اکیاون اور انچاس سو۱۰۰۔ اور سو کا آدھا پچاس۔ وقس علیٰ ہذا۔

بس ایسے ہی جوڑتے اور اس کا نصف کرتے چلے جائیے حقیقت واضح ہوتی جائیگی۔ معلوم ہوا دو عدد ہے، پانچ عدد ہے، دس عدد ہے بیس عدد ہے، پچاس عدد ہے۔ لیکن ایک۱ عدد نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ عدد اسے کہتے ہیں جو اس کے پہلے ہو اور جو اس کے بعد ہو پہلے دونوں کو جمع کیا جائے پھر اس کا نصف کیا جائے۔ نصف کے بعد جو بچے اسی کو عدد کہتے ہیں۔ تو اے حضرات! دو کے پہلے ایک ہے،

پانچ کے پہلے چار ہے۔ دس کے پہلے نو ہے، بیس کے پہلے انیس ہے۔ لیکن ایک کے بعد دو تو ہے مگر ایک کے پہلے کچھ بھی نہیں ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ ایک پر عدد کی تعریف صادق ہی نہیں آتی اسی لئے میں نے عرض کیا تھا ایک سے عدد بنتا تو ہے مگر خود ایک عدد نہیں۔ دس میں ایک بڑھا دیجئے گیارہ ہو جائے۔ بیس میں ایک بڑھا دیجئے اکیس ہو جائے۔ پچاس ہزار میں ایک بڑھا دیجئے اکیاون ہزار ہو جائے بات سمجھ میں آگئی کہ ایک سے عدد بنتا تو ہے مگر خود ایک عدد نہیں ہے۔

اب آیتِ مبارکہ پر غور کیجئے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ط پیارے کہدو اللہ ایک ہے۔ اس ایک سے کیا پتہ چلا کہ جس طرح ایک سے عدد بنتا ہے، ایک عدد بناتا ہے مگر خود ایک عدد نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ عالم بناتا تو ہے مگر خود عالم نہیں ہے۔ عالم کہتے ہیں "ماسوی اللہ کو" اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ سب عالم ہے آسمان عالم ہے، سورج عالم ہے، چاند عالم ہے، عرش و کرسی عالم ہیں۔ لوح و قلم عالم ہیں۔ سدرہ عالم ہے، جنت و دوزخ عالم ہیں۔ کہکشاں عالم ہے۔ قوس و قزح عالم ہیں، حور و غلمان عالم ہیں، جن و فرشتے عالم ہیں، پستی و بلندی عالم ہیں، پہاڑ و دریا عالم ہیں، عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی، ہوا عالم ہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات عالم ہیں۔ گرجتے بادل تڑپتی بجلیاں سسکتی ہوائیں، مہکتے گلشن عالم ہیں، طلوعِ صبح، غروبِ آفتاب، شبِ دیجور، سپیدۂ سحر غرضیکہ یہ ساری کائنات عالم ہے، مگر خدا عالم نہیں، خالقِ عالم ہے۔

پھر دماغ پر زور دیجئے اور آیتِ کریمہ پر غور کیجئے "مصطفیٰ! کہدو کہ وہ اللہ ایک ہے۔ یعنی جس طرح ایک عدد بناتا ہے خود عدد نہیں ہے

بس ایسے ہی خدائے تعالیٰ خالقِ عالم تو ہے مگر عالم نہیں ہے۔ ہم عالم، جن و بشر عالم، بحر و بر عالم، جنوب و شمال عالم، مشرق و مغرب عالم، صبح و شام عالم، رات و دن عالم، زمین و زماں عالم، این و آں عالم، مکین و مکان عالم، جہت و سمت عالم، یہاں عالم، وہاں عالم، کہاں عالم، جہاں عالم اس میں جو کچھ بھی ہے وہ سب عالم۔

حضرات! اب میں ایک جملہ بولنے جا رہا ہوں۔ ذہن کو حاضر کیجئے۔ یہ ساری کائنات، عالم۔ خدا، خالقِ عالم۔ اور میرے مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم رحمتِ عالم۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ ؎

وہ ہر عالم کی رحمت ہیں کسی عالم میں رہ جاتے
یہ ان کی مہربانی ہے کہ یہ عالم پسند آیا

خدا اور بندوں کے درمیان میرے سرکار گویا شامیانۂ رحمت ہیں۔ اگر یہ شامیانۂ رحمت نہ ہوتا تو کائنات جلالِ باری برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ رب العلمین ہے، یہ رحمۃ للعالمین ہیں۔ وہ خالقِ عالم ہے میرے مصطفٰے رحمتِ عالم ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

دُوسرا گوشہ: حضرات! اب اس کا دوسرا گوشہ ملاحظہ فرمایئے:

پروردگار فرماتا ہے پیارے کہدو، وہ ایک ہے۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ ایک کے بعد تو سارے اعداد ملیں گے۔ دس بھی ہے سو بھی ہے، ہزار بھی ہے، کروڑ بھی ہے، ارب بھی ہے، کھرب بھی ہے سنکھ بھی ہے اور مہا سنکھ بھی ہے۔ غرض کہ ایک کے بعد تو ساری گنتیاں ہیں۔ مگر یہ بتایئے کہ ایک سے پہلے بھی کوئی گنتی ہے۔؟

بس ایسے ہی سمجھ لیجئے خدا فرماتا ہے پیارے کہدو وہ ایک ہے یعنی جس طرح ایک کے بعد تو ساری گنتیاں ہیں مگر ایک کے پہلے کچھ بھی

نہیں۔ ایسے ہی خدا کے بعد تو سارا عالم ملے گا مگر خدا کے پہلے کچھ نہیں۔ اسی کا نام ہے ازلیت! یہی میں کہہ رہا تھا کہ وہ ازلی ہے اور ابدی ہے۔

حضرات! پھر اسی نکتۂ آغاز پر آ جائیے۔ میں یہی تو کہہ رہا تھا کہ اس کائنات پر ایک ایسا بھی دور گزرا ہے کہ ذات باری، تجلّیٔ الٰہی اور حسنِ الٰہی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ مگر آپ جیسے علم دوست اور دانشور یہ سوچتے ہونگے کہ کس پاگل و دیوانے سے سابقہ پڑ گیا ہے۔

حضرات! سنبھل جائیے اور ذہن کی بھرپور حاضری کے ساتھ آنے والی گفتگو سماعت فرمائیں۔

یقیناً آپ جیسے اہل علم اور مدبر و مفکر حیران و پریشان ہو کر ذہنی خلجان میں مبتلا ہوں گے۔ کہ مشتاق نظامی، کیسی متضاد گفتگو کر رہا ہے ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ خدا کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ دوسری طرف یہ بھی کہتا ہے کہ زمانہ گزر گیا۔ جب کچھ نہیں تھا تو بیچ میں زمانہ کہاں سے آگیا؟

عجب کچھ پھیر میں ہے سینے والا جیب و داماں کا!

جو یہ ٹانکا تو وہ ادھڑا، جو وہ ادھڑا تو یہ ٹانکا!

حضرات! سنبھل جائیے میں آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ اگر اندھیرے میں رکھنا مقصود ہوتا تو میں اس دبے ہوئے گوشے کو ابھارتا ہی کیوں؟ از خود سوال کیوں پیدا کرتا؟ یہاں علمائے اہلسنت کا بھی ایک باوقار مجمع اسٹیج پر ہے بھلا یہ ہمیں کیوں معاف کرنے لگے۔ ہمارا اور ہمارے حریف کا یہی فرق ہے کہ ہم قانونِ مصطفےٰ کا احترام کرتے ہیں اور وہ اپنے ان علماء کا جنہوں نے منھ بھر کر سید عالم روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی ہیں۔ ان کی جنبہ داری کرتے ہیں۔

اسی لئے میں اکثر و بیشتر یہ عرض کرتا ہوں کہ وہ تھانے والے پر ایمان لائے ہیں اور ہم مدینے والے پر۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ایک طرف تو میں نے یہ کہا کہ اللہ کی ذات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اور دوسری طرف یہ بھی کہا کہ اس کائنات پر زمانہ گذر گیا۔

حضرات! بدیہی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کے سوا کچھ بھی نہیں تھا تو درمیان میں یہ زمانہ کیسے آگیا؟ زمانہ بھی تو اللہ کی مخلوق ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو دنیا اور کائنات کچھ بھی نہیں بول سکتے۔ اس لئے کہ یہ سب کے سب ممکنات، مخلوقات اور حوادثات ہیں جب کچھ بھی نہیں تھا تو دنیا اور کائنات کا وجود کیسا؟ لیکن اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ زبان اردو نے ہر چند کہ بہت ترقی کی ہے اور روز بروز اپنی منزل ارتقا کی طرف رواں دواں ہے۔ خدا اسے حاسدوں کی نگاہِ بد سے محفوظ رکھے۔ لیکن میری گفتگو ایک ایسے نازک موڑ پر آگئی ہے کہ زبان اردو کا قافیہ یہاں پر بالکل ہی تنگ ہے۔ ترقی کا عالم تو یہ ہے کہ دیوانِ غالب کا پہلا شعر ہے:۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

سُہا جیسا ادیب، بے خود دہلوی، حسرت موہانی جیسا صاحب قلم ان سبھوں نے دیوانِ غالب پر بہت کچھ لکھا ہے۔ حسرت موہانی نے تو اسی ایک شعر پر صفحات کے صفحات سیاہ کرڈالے لیکن اندازِ قلم یہ ہے کہ اس شعر کا صحیح مفہوم چچا غالب ہی بہتر جانتے ہیں۔

حضرات! یہ ہے اردو کے عروج و ترقی کا عالم، مگر میں حیران ہوں کہ آخر جس نازک موڑ پر میری تقریر آگئی ہے اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے الفاظ کہاں سے لائے جائیں۔ ایک طرف تو میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ اللہ کی ذات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا، دوسری طرف یہ بھی کہہ رہا ہوں

کہ "اس پر ایک زمانہ گذر گیا" یاد رہے کہ اگر فلسفہ کے ان اشاروں پر اعتماد و بھروسہ کر لیا جائے کہ زمانہ نام ہے گردش آفتاب کا، آفتاب ہو، اس کی گردش ہو تب کہیں زمانہ کا وجود ہے۔

آفتاب ہماری اور آپ کی گھڑی دیکھ کر نہیں چلتا۔ گھڑی آفتاب کے طلوع و غروب سے ملائی جاتی ہے۔ ہم لمحہ بناتے ہیں، لمحے سے سکنڈ، پھر سکنڈ سے منٹ، منٹ سے گھنٹہ، گھنٹے سے دن، دن سے ہفتہ، ہفتہ سے مہینہ، مہینہ سے سال، سال سے صدی۔

غرض کہ ہم لمحے سے چلتے ہیں تو صدی پر سانس توڑتے ہیں۔ اور مجھے کہنا یہ ہے کہ جب خدا کے سوا کچھ بھی نہیں تھا تو درمیان میں زمانہ کیسے حائل ہو گیا۔

جُملہ مُعترضہ: حضرات! سخن گسترانہ بات آہی گئی ہے تو زبان اردو سے متعلق ایک بات عرض کرتا چلوں۔ ہم اور آپ تو مومن، میر، داغ، ذوق، غالب، ناسخ اور سودا کی اردو میں الجھے ہوئے ہیں کون کس کا استاد، کون کس کا شاگرد۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ہمارے حریف نے اردو کے میدان میں ریس کھیلا ہے وہ بھی دن میں نہیں رات میں۔ خوابوں کے گھوڑے دوڑائے ہیں چنانچہ ملاحظہ فرمائیے براہین قاطعہ مطبوعہ ساڈھورہ ص۲۶:

ایک صالح فخر عالم علیہ السلام کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوئے۔ تو آپ کو اردو میں کلام کرتے دیکھ کر پوچھا کہ آپ کو یہ کلام کہاں سے آگئی۔ آپ تو عربی ہیں؟ فرمایا جب سے علمار مدرسہ دیوبند سے ہمارا معاملہ ہوا ہم کو یہ زبان آگئی۔ سبحان اللہ اس سے رتبہ مدرسہ کا معلوم ہوا۔

اوّلاً تو اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ سچ مچ خواب دیکھا ہی ہے۔
ہو سکتا ہے توہین نبوت کے ارادے سے خواب گڑھ لیا ہو۔

مثلاً اگر آپ یہ فرمائیں کہ میں نے رات خواب دیکھا کہ میرے کمرے میں ہوائی جہاز آیا میں اس سے لندن پہنچا، پھر فرانس، امریکہ، جاپان سوئزرلینڈ، وغیرہ گھومتا رہا۔ اس کے بعد بحری جہاز سے چل کر بمبئی آیا یہاں ٹیکسی، لوکل ٹرین پر خوب گھوما۔ پھر ٹرین کا سفر کیا۔ اس کے بعد کبھی رکشہ پر بیٹھا کبھی یکّہ پر، کبھی بیل گاڑی پر۔ مگر جب آنکھ کھلی تو اپنے کمرے کی مسہری پر تھا۔ آخرش بتائیے تو سہی! آپ میں سے کوئی اسے جھٹلا سکتا ہے؟ خواب تو خواب ہے

مگر ایک بات یہ تو بتائیے کہ کیا ہر خواب کا چھاپنا بھی ضروری ہوتا ہے؟ عام مسلمانوں کی فطرت تو یہ ہے کہ اگر عمدہ اور اچھے خواب دیکھتا ہے تو اس کی تعبیر تلاش کرتا ہے۔ لیکن اگر مزاج و فطرت کے خلاف خواب دیکھتا ہے تو اسے چھپاتا نہیں چھپاتا ہے۔

میں دریافت یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ایسا خواب دیکھ ہی لیا تھا تو اسے چھاپا کیوں جا رہا ہے؟ چھپایا کیوں نہیں گیا۔؟

شاتمانِ رسول کا یہی وہ کینسر ہے جو پھوٹ کر نوکِ قلم اور نوکِ زبان پر آ رہا ہے۔ اگر اس مجمع میں ان کا کوئی نمائندہ ہو تو میری طرف سے کوئی ان سے پوچھو کہ اگر ان کے دھرم میں ہر خواب کا چھاپنا اتنا ہی ضروری ہے تو یہ حق ہمیں بھی دیا جائے کہ ان سے متعلق رات کو خواب دیکھیں اور صبح کو چھاپ دیا کریں۔

اے نادانو! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ نبی اس دنیا میں پڑھنے نہیں آتا بلکہ کائنات کو پڑھانے آتا ہے۔ وہ تمہارا ڈالڈا ٹائپ نبی ہوگا جسے تم نے تھانہ بھون میں پڑھایا بھی ہوگا پھر خواب میں اسی کا کلمہ بھی پڑھا

ہوگا۔ پروردگار نے تو میرے سرکار کے دامن کو اتنا بے غبار رکھا کہ اس دنیا میں کبھی کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ نہ کسی مکتب میں گئے، نہ مدرسہ میں اور نہ کسی کے سامنے بسم اللہ شروع کی۔ بلکہ خدا خود فرماتا ہے :-

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝

نگارِ من کہ بمکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموخت و صد مدرس شد

اگر سید عالم کہیں پڑھنے گئے ہوتے تو چالیس سال کے بعد جب آپ اعلانِ نبوت فرماتے تو اہل عرب ببانگِ دُہل کہدیتے :- اے محمد اگر کسی کو نبی ہی ماننا ہے تو تمہیں کیوں مانیں؟ اسے کیوں نہ مانیں جس سے ہم نے تم کو پڑھتے دیکھا ہے۔ بتائیے اس وقت بات کتنی کمزور ہوجاتی۔ اسی لئے میں نے کہا کہ خدائے قدیر نے سرکار کے دامن کو صاف و شفاف آئینہ بنائے رکھا۔ تاکہ اعلان نبوت کے بعد یہ پیچیدگی نہ پیدا ہونے پائے۔ اسی لئے حضرت امیر نے فرمایا :-

حضرت کا علم، علمِ لدنی تھا اے امیر !!
حضرت وہیں سے آئے تھے لکھے پڑھے ہوئے

اچھا چلو اگر تمہارا خواب سچ ہی مان لیا جائے تو تمہارے ترکش کا تیر ہمارے سینے پر نہیں آتا بلکہ تم نے خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اس سے تمہاری ہی جہالت کا پردہ فاش ہوتا ہے اور تمہاری کم علمی اور بے مائیگی کا بھانڈا پھوٹتا ہے ۝

ہم نہ کہتے تھے کہ اے داغ تو زلفوں کو نہ چھیڑ
اب وہ برہم ہے تو ہے تجھ کو قلق یا ہم کو

بقول تمہارے اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ سرکار اردو میں بولے تو ہمارے اس سوال کا کیا جواب ہوگا؟ کہ سرکار تو عربی تھے ان کی

مادری زبان ہی عربی تھی۔ وہ تم سے اردو میں کیوں بولے؟
پیارے یہی وہ نشیب ہے جہاں پانی مر رہا ہے۔ تمہاری آنکھوں پر عداوتِ رسول کی ایسی دبیز پٹی بندھی ہے کہ تم اجالے اندھیرے کی تمیز نہیں کر سکتے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہہ رہے ہو کہ سرکار نے اردو میں کلام فرمایا تو گویا سرکار نے یہ واضح فرما دیا کہ تم لوگ عربی مدرسہ بناتے تو ہو مگر عربی سمجھتے نہیں۔ اگر سرکار کو یقین ہوتا کہ تم عربی سمجھ لوگے تو سرکار عربی ہی میں گفتگو فرماتے مگر سرکار جانتے تھے کہ ہمارا مخاطب عربی زبان سے ناآشنا و نابلد ہے۔ اب اس یقین کے باوجود اگر سرکار عربی زبان میں گفتگو فرماتے تو کلام مقتضائے حال کے مطابق نہ ہوتا۔ معیار بلاغت سے گر جاتا۔ لہٰذا سرکار کا اردو زبان میں گفتگو فرمانا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ تم عربی زبان سے ناآشنا اور جاہل ہو۔ ؎

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

علاوہ ازیں، معاذ اللہ تمہارا یہ کہنا کہ تم نے رسول خدا کو اردو پڑھائی۔ تمہیں یہ لکھتے اور چھاپتے شرم و غیرت محسوس نہ ہوئی۔ حیا ہوتی تو چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر گئے ہوتے۔ کسی کو منھ نہ دکھاتے۔ تم اور نبی کو اردو پڑھاؤ۔ یہ منھ اور مسور کی دال؟ الامان والحفیظ۔

اچھا چلو آج تم کو تمہارے گھر تک پہنچا ہی دیا جائے۔ بر سبیل تنزل اگر تمہارا خواب صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو اعجاز مصطفےٰ دیکھو کہ تمہیں اردو زبان ہی میں ٹھوکر کھلائی۔ تمہیں اتنا بھی شعور نہ ہوا کہ کلام مذکر ہے یا مؤنث۔ غالب اپنی قبر میں کلیجہ پیٹتا ہوگا، اور داغ ماتم کر رہا ہوگا، کہ یا اللہ جو ہمارے دور کا مذکر تھا وہ سہارنپور پہنچ کر مؤنث کیسے ہوگیا۔؟

اے عصرِ حاضر کے فرعونو! چونکہ تم نے توہینِ نبوت کے ارادے سے قلم اٹھایا تھا اور نبی کا استاد بننے کا شوق چرایا تھا اس لئے میرے سرکار جو جامع الکلم ہیں انھوں نے زبان ہی میں ایسی ایڑ ماری کہ تمہیں دن میں ہی تارے نظر آنے لگے۔ لہٰذا اب تمہاری کتاب کا پڑھنے والا اسے آسانی سے سمجھ لے گا کہ جسے اتنی بھی تمیز نہیں کہ کلام مذکر ہے یا مؤنث وہ پڑھانے کا حقدار نہیں بلکہ اسے طفلِ مکتب بننا چاہئے۔ یعنی ایسے کوڑھ مغز کو پڑھانا نہیں، پڑھنا چاہئے۔ تمہاری نجس و ناپاک عبارت تمہارے مکروہ چہرے پر ایسا غیبی طمانچہ ہے کہ پہلے تو رخسار سرخ ہوا، اور اب ہمیشہ کے لئے ایسا سیاہ ہو گیا کہ جس سے تم دن کے اجالے میں ہی نہیں رات کی تاریکی میں بھی پہچانے جاتے ہو۔

خوش عقیدہ مسلمانوں کے بچے بھی تمہیں دیکھ کر کہتے ہیں:
"دیکھو وہ جا رہا ہے وہ جو بولتا ہے مگر سمجھتا نہیں"۔ اسی لئے میں ایقان وادعان کی بلند ترین چوٹی سے اعلان کرتا ہوں کہ ان بدبختوں اور بدنصیبوں نے جہاں کہیں بھی توہینِ نبوت کے ارادے سے قلم اٹھایا، قلم کی دشنامی میرے مصطفٰے کے جوتے کے تلے تک تو نہیں پہنچی البتہ اس نے ہمیشہ کے لئے ان کا چہرہ سیاہ کر دیا۔

اگر خدائے قدیر نے زندگی وصحت عطا فرمائی تو انشاء اللہ تعالیٰ ان کی ایک ایک کفری عبارت کا آپریشن کر کے اس بے غبار حقیقت کو واضح کروں گا کہ آفتاب کا تھوکا منھ پر آتا ہے۔ ان کی اڑائی دھول وہاں تک تو نہ پہنچی البتہ ان کا چہرہ غبار آلود کر گئی۔

حضرات! یہ خدا کی مار نہیں تو اور کیا ہے۔ شاتمانِ رسول کا معتوب گروہ ایسے دلدل میں پھنسا ہوا ہے کہ روز بروز اس میں دھنستا ہی چلا جا رہا ہے۔ معذرت کے ساتھ حضرات نہ جانے میں کن کانٹوں میں

الجھ گیا۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ براہینِ قاطعہ کی اردو پڑھانے والی عبارت سے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوِ مرتبت پر کوئی حرف نہ آیا۔ سہارنپور کی ڈھول تو مدینے کی سرحد بھی نہ پار کر سکی چہ جائیکہ گنبدِ خضرا کی بلندیوں تک پہنچتی؟ البتہ یہ ضرور ہوا کہ گندی، ناروا و توہین آمیز عبارت نے دانشوروں اور عقیدت کیشوں کی نگاہ میں ان کو ہمیشہ کے لئے ننگا اور رسوا کر دیا۔ اب یہ اس قابل نہیں کہ شرفاء و اہل علم سے آنکھیں ملا کر گفتگو کر سکیں۔ اگر ان میں کچھ بھی شرم و حیا ہوتی تو خواب کا سہارا لے کر ایسی دل آزار و دل خراش عبارت کو ہرگز ہرگز نہ چھاپتے۔

آواز دو انصاف کو، انصاف کہاں ہے

نیا گوشہ:- نادانو! تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم نے رسولِ خدا کو اردو پڑھائی۔ مگر اس طویل عرصے میں توہینِ نبوت کا نشہ کچھ ہلکا ہو گیا ہو۔ تو آؤ گنبدِ خضرا کی چھاؤں کا کیف آور اور روح پرور منظر دیکھو!

ایامِ حج میں مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ گویا بین الاقوامی شہر بن جاتے ہیں۔ اپنی حسب استطاعت و مقدرت دنیا کا مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے وہاں پہنچتا ہے۔ ادائیگیِ حج سے پہلے یا بعد وہ آقائے کائنات مالکِ کونین کی بارگاہ کرم میں حاضری دیتا ہے۔ ایک داتا ہے۔ ہزاروں بھکاری ہیں۔ ایک ہی صف ہے، ایک ہی قطار میں مختلف زبانوں کے بولنے والے فریادی اپنی اپنی زبانوں میں اپنا اپنا دردِ دل، اپنی اپنی دکھ بھری کہانیاں سنا رہے ہیں۔ ترکی، مصری، انڈونیشی، بنگلہ دیشی، ہندی سندھی، پنجابی، گجراتی، چینی، جاپانی، ایرانی، افغانی، یونانی، پاکستانی غرض کہ دنیا کا مسلمان اپنے آقا و محبوبِ خدا کو اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ اگر لرزتے و کانپتے ہونٹ ساتھ نہ دیتے تو ہم کبھی آہوں کی زبان میں اشکوں

کے سہارے حالِ دل سُناتے ہیں :

ع آنسوؤں کے ساز پہ کہتا ہے افسانہ مجھے

بہر نوع دنیا کا مسلمان آج اپنی اپنی زبان میں مالکِ کونین سے گفتگو کر رہا ہے۔

اس مقام پہ پہنچ کر اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ بنگالی کے دل و دماغ میں یہ کھٹک کیوں نہیں پیدا ہوئی۔ وہ خطرہ کیوں نہیں محسوس کرتا کہ آج میں جن سے بنگلہ زبان میں گفت گو کر رہا ہوں "وہ کبھی بنگال آئے نہیں بنگلہ زبان پڑھی نہیں، یہ زبان کسی سے سیکھی نہیں، ان سے بنگلہ زبان میں بولیں گے تو یہ سمجھیں گے کیسے؟

مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کی زبان پر کوئی پہرہ نہیں۔ وہ بلا جھجک اور بلا روک ٹوک، بغیر تکلف و تامل اپنی زبان میں بول رہا ہے۔ اور تنہا وہی نہیں بلکہ ہر ملک والا اپنی ہی زبان میں گفتگو کر رہا ہے۔

آقا کی بارگاہ میں غلاموں کی اس ادا نے داناؤں کو شعور عطا کر دیا کہ جب یہ ساری کائنات کے رسول ہیں تو ساری کائنات کی زبان بھی جانتے ہیں۔ گویا یہ مسلمانوں کا فطری و پیدائشی عقیدہ ہے کہ گنبد خضرا میں آرام فرمانے والے آقا نے اُس درسگاہ میں آنکھ کھولی ہے جہاں زبانوں کی تخلیق ہوتی ہے اگر وہ ربُّ العٰلمین ہے تو اسی نے اپنے محبوب کو رحمۃ للعالمین بنایا ہے۔ جس طرح بندہ اپنے رب کو پکارنے میں کسی زبان کا پابند نہیں، ایسے ہی رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے میں بھی کسی خاص زبان کا پابند نہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ان کی شان رحمۃ للعالمینی پر حرف آجائے گا۔ جب وہ ساری کائنات کی رحمت ہیں تو اس کا لازم ہے کہ وہ ساری کائنات کی زبان بھی جانتے ہوں۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

بھلا کیسے ممکن ہے کہ وہ ساری کائنات کے رسول ہوں اور اردو پڑھنے کے لئے "دیوبند" بلائے جائیں۔

حضرات! یہ انھیں کا کوئی مفروضہ دجال وکذاب نبی ہو سکتا ہے جسے گرگوں نے طوطے کی طرح خود ہی پڑھایا سکھایا ہو اور بعد میں اسی کا کلمہ بھی جپنے لگے ہوں۔

تُف ہے ایسی نجس و ناپاک ذہنیت پر! دوستو! مجھے کہہ لینے دو وہ "تھانہ" والا تو ہو سکتا ہے "مدینہ" والا نہیں۔ خدا ان کے شر و فتنے سے دنیا کے سادہ لوح مسلمانوں کو محفوظ فرمائے۔ آمین۔

دوستو! میری بات بہت پھیل گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس کائنات پر ایک ایسا بھی دور گذرا ہے کہ ذات باری اور حسنِ الٰہی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا کان اللّٰہ و لم یکن لہ شیئا۔

نیا تخیل مگر آپ پر یہ واضح رہے کہ حسن کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ کوئی اسے دیکھے، کوئی اس سے آنکھیں ملائے، کوئی سجود نیاز لٹائے کوئی نیازمندانہ دامن پھیلائے، کوئی آنکھ مچولی کھیلے، کوئی پردہ اٹھائے کوئی چلمن گرائے۔

ہاں مجھے کہہ لینے دیجئے کہ حسن کا کوئی دربار اس وقت تک نہیں سجتا، تا وقتیکہ کوئی عاشق، گریباں چاک، دامن تار تار، عشق کے بھڑکتے شعلوں میں کود نہ پڑے۔ بس عشق ہی حسن کا دربار لگاتا بھی ہے اور سجاتا بھی ہے۔ ورنہ حسن ہزار پردہ میں رہ جائے۔ کون اسے دیکھے، کون اسے پہچانے۔ یہ تو کسی دیوانے ہی کا کام ہے کہ چھلانگ ماری اور عشق کی بھٹی میں کود پڑا۔ شور و ہنگامے کی فضا میں نہ جانے کتنے سینوں کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ پھر یہی چنگاری آگ بنی، شعلہ ہوئی۔ اور شعلۂ جوالہ ہوئی۔ حسن مسکراتا رہا عشق جلتا رہا۔ تماشا گاہ عالم کی یہ ریت و رسم کچھ آج کی نہیں ہے بلکہ آفرنیش عالم سے تا ایں دم و آں دم جس کی کوئی خبر نہیں۔ یہی ہوتا چلا آیا ہے اور جب تک یہ گردش لیل و نہار رہے یہ ہوتا ہی رہے گا۔

ہاں میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حسن کی فطرت کا تقاضا ہے کہ کوئی اسے دیکھے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ شمع جلتی ہے، پروانے ٹوٹ پڑتے ہیں، کلیاں مسکراتی ہیں، بھنورے چکر کاٹتے ہیں، پھول قہقہہ لگاتا ہے، بلبلیں چہچہاتی ہیں، لیکن میں خدا کے لئے فطرت نہیں بولتا

مشیت و ارادہ بولوں گا اب
وہ خالق فطرت ہے ۔ البتہ میں اس کے لئے مشیت و ارادہ بولوں گا اب
آپ ذہنی بیداری اور فکری توانائی کے ساتھ بیٹھ جائیے ۔
حضرات ! یہ صحیح ہے کہ اللہ کی ذات کے سوا کچھ بھی نہ تھا مگر
جب مشیت باری ہوئی حسنِ الٰہی نے چاہا کہ کوئی مجھے دیکھے تو میں جانا
پہچانا جاؤں ، کوئی سربسجود ہو تو اللہ نے اپنے ہی نور سے ایک پیکرِ
جمیل تیار کیا جس کا نام رکھا "محمد" صلی اللہ تعالے علیہ وسلم ۔ جسنِ ذاتِ
والاصفات نے بارگاہ احدیت میں سب سے پہلا سجدہ کیا ۔
گویا یہی عالم امکان کی خشت اول اور پہلی کڑی ہیں ۔
بزمِ نبوت کی روشن شمع اور آسمان رسالت کے نیّر تاباں
واضح رہے کہ میرے سرکار کے دونوں نام ہیں احمد بھی
محمد بھی ۔ احمد اسے کہتے ہیں جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف
کرے ۔ اور محمد اسے کہتے ہیں جس کی اللہ سب سے زیادہ
تعریف کرے ۔
میرے سرکار "احمد و محمد" دونوں ہیں ۔ نہ تو میرے سرکار سے
زیادہ کسی نے خدا کی تعریف کی اور نہ ہی خالقِ کائنات نے
میرے سرکار سے زیادہ کسی کی تعریف کی ۔
نام تو دونوں ہیں مگر فرق یہ ہے کہ عالم نور کا نام احمد ہے
اور عالم ظہور کا نام محمد ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیح نے
جب اپنی قوم کو سرکار کی ولادت کی بشارت دی تو یہ فرمایا یاتِ
مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ ۔ میرے بعد آنے والے کا نام
احمد ہے ۔ حضرت مسیح نے احمد فرمایا محمد نہیں ۔ چونکہ ابھی عالم نور
میں ہیں خدا کی تعریف میں لگے ہیں اور جب عالم ظہور میں آئے تو رب
نے اپنے محبوب کی تعریف فرمائی ۔

حضرات! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ نے اپنے ہی نور سے پیکرِ جمیل تیار کیا۔ اپنے ہی نور، اپنے ہی نور پر میں بار بار زور دے رہا ہوں چونکہ یہی میرے عنوان کی روح ہے۔ لہٰذا گوشۂ ذہن میں یہ محفوظ رہے تو اب مجھے کہنے دیجئے کہ اب سے پہلے صرف ایک آئینہ تھا۔ "آئینۂ الوہیت"، مگر اب دو آئینے ہیں "آئینۂ نبوت اور آئینۂ الوہیت"

ایک طرف آئینۂ الوہیت ہے تو دوسری طرف آئینۂ نبوت الوہیت اپنے کو آئینۂ نبوت میں دیکھ رہی ہے کہ یہ میرا ہی مصنوع ہے۔ میرے ہی دست قدرت کا سنوارا ہے اور نبوت سربسجود ہے کہ یہی میرا خالق ہے، یہی میرا مالک ہے، اللہ کی بارگاہ میں سب سے پہلے اگر کسی نے سجدہ کیا تو میرے سرکار نے۔ میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ میرے سرکار نے سجدہ کیا مگر یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ سجدہ کتنا طویل تھا۔ میرا رب جانے یا میرے سرکار۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

حضرات! محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے۔ ایک بڑی پیاری بات ارشاد فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں ایک بڑا آئینہ لو جس میں طرح طرح کی نوع بنوع، گوناگوں مرصع کاری کی گئی ہو، بے شمار بیل بوٹے ہوں، غنچے بھی ہوں اور پھول اور کلیاں بھی۔ غرض کہ اس کا ہر ہر گوشہ نقش و نگار سے جڑا ہوا ہو۔ حضرت شیخ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اس بڑے آئینہ کے مقابل ایک سادہ آئینہ لاؤ تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جس قدر بیل بوٹے نقش و نگار بڑے آئینہ میں ہوں گے اس کا عکس سادہ آئینہ میں بھی اُتر جائے گا۔

قربان جایئے! آج آئینۂ الوہیت کے مقابل آئینۂ نبوت ہے

گویا اس آئینہ کا حسن و جمال اس آئینہ میں اتارا جا رہا ہے، دیا جا رہا ہے، بخشا جا رہا ہے۔ یہ نہ کہئے گا کہ مشتاق نظامی شرک بول رہا ہے۔ میں بہت ہی صاف اور واضح الفاظ میں بول رہا ہوں کہ رب دے رہا ہے مصطفےٰ لے رہے ہیں۔

ایک سوال کا جواب:۔ حضرات! کہیں کوئی آپ کو شبہے میں نہ ڈال دے کہ مشتاق نظامی شرک بول رہا ہے۔ یعنی جو آئینہ الوہیت میں ہے، وہی آئینۂ نبوت میں۔

دوستو! اسے یاد رکھنا "آئینۂ نبوت" میں خواہ کچھ بھی آ جائے یہ سب "عطائی" ہے۔ خدا ہی کا دیا ہوا ہے۔ اور وہاں جو کچھ ہے وہ "ذاتی" ہے۔ رب نے کسی سے مانگا نہیں اس کو کسی نے دیا نہیں۔

اتنے واضح فرق کے بعد بھی اگر کوئی اسے "شرک" کہے تو اس کی آنکھیں چوندھیا گئی ہیں۔ یا تو عقل ہی نہیں ہے یا تھوڑا بہت پردہ پڑ گیا ہے۔ یا رسول دشمنی میں اس کی بوکھلاہٹ اپنے شباب پر پہنچ گئی ہے۔ گویا براہِ راست میرے سرکار نے خدا سے لیا۔ اور ساری کائنات نے خدا سے جو کچھ بھی پایا بوسیلۂ مصطفےٰ پایا۔ رب اور مصطفےٰ کے بیچ کوئی حائل نہیں۔

خلقِ اوّل حضرات! اس گفتگو سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ خداوند قدوس نے سب سے پہلے میرے سرکار کو پیدا فرمایا۔ غور کیجئے کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ ارشاد باری ہے لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر۔ ترجمہ آنکھیں اسے احاطہ نہیں کرتیں۔ اور سب آنکھیں اس کے احاطہ میں

ہیں. اور وہی ہے پورا باطن اور پورا خبردار۔

جب رب نے یہ فرمایا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ تو طبعی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسے دیکھ نہیں سکتے تو اسے پہچانیں کیسے؟ حالانکہ اسی نے یہ بھی فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْن تو جب انسان کی منشائے تخلیق میں اس کی معرفت متعین ہے تو بن دیکھے اسے پہچانیں کیسے؟

مادیات کی دنیا کا دستور یہی ہے کہ دل کہتا ہے کہ آنکھ کسی خوبرو کو دیکھے تو ہم اس سے دل لگائیں۔ بغیر دیکھے دل کا جھکاؤ کیسا؟ پروردگار اسی سوال کا جواب عطا فرماتا ہے کہ میری معرفت کے لئے تم پہلے میری طرف مت دوڑو۔ چونکہ تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ وہ بہت ہی لطیف ہے۔ تمہاری مادی آنکھ اس لطیف کو نہیں دیکھ سکتی۔

اسی سوال کا جواب ہے کہ ہم اسے کیوں نہیں دیکھ سکتے۔ اسلئے کہ وہ لطیف ہے پھر سوال پیدا ہوا کہ جب دیکھ نہیں سکتے۔ تو پہچانیں کیسے۔ تو "خبیر" اس ابھرے ہوئے سوال کا جواب ہے کہ تم براہِ راست مجھے تو نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ میں ایسی خبریں دوں گا جس کے توسط سے تم مجھے پہچان سکو۔ اور یہ خبریں کہاں سے ملیں گی" وہ آستانہ ہے میرے محبوب کا" گویا میرے سرکار خدا اور بندوں کے درمیان ایک مضبوط وسیلہ ہیں۔ ان کا جمال جہاں آرا دیکھو اور مجھے پہچانو۔ حتی کہ زبان ان کی ہوگی اور کلام میرا ہوگا ۔

آنکھیں دیکھیں گی ان کا ہاتھ ہے مگر وہ مرا ہی ہاتھ ہو گا
"یداللہ فوق ایدیہم" ان کا پھینکنا مرا پھینکنا ہو گا
وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى

ایک سوال اور اس کا جواب:۔ ہو سکتا ہے کل کی صبح کوئی سوال کر بیٹھے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آنکھ ہو اور ہم خدا کو نہ دیکھیں۔ پھر یہ آنکھ کس کام کی۔ تو آپ میری طرف سے ان سے "بقراط زمانہ" سے ایک سوال کیجئے! جناب دیکھئے وہ آم کا درخت ہے اور اس کی پتی ہل رہی ہے۔ یہ بتائیے کہ پتی کیوں ہلی۔ جواب یہی ہوگا ہوا چلی، پتی ہلی۔

معلوم ہوا کہ ہوا کا وجود ہے اگر وجود نہ ہوتا تو ہوا چلتی کیسے؟ اجی جناب! ہوا کے تو نہ جانے کتنے روپ ہیں۔ یہی ہوا "نسیم سحری" بن کر چلے، "باد صبا" بن کر چلے۔ آندھی، طوفان، جھکڑ بن کے چلے۔ اگر ہوا نہیں ہے تو چل کیسے رہی ہے۔

معلوم ہوا، ہوا کا وجود بھی ہے چلتی بھی ہے۔ اب ان بقراط زمانہ سے سوال کیجئے کہ جس ہوا کے ٹھوکر مارنے سے درخت کی پتی ہل گئی۔ ذرا اس ہوا کو دکھائیے تو سہی۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ اور جناب چاروں شانہ چت ہو جائیں گے۔ مجبوراً یہی کہنا پڑے گا میرے بھائی! ہوا کا وجود بھی ہے اور ہوا چلتی بھی ہے لیکن دیکھی نہیں جاتی۔ آنکھوں کی گرفت میں نہیں آتی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ہوا ہے بھی، چلتی بھی ہے مگر دیکھی نہیں جاتی۔ چونکہ وہ بہت ہی لطیف ہے۔

اب دوسرا سوال کیجئے کہ ہوا ہے کیا؟ ارے اللہ کی مخلوق ہی تو ہے۔ بس راز کھل گیا اور حقیقت منکشف ہو گئی کہ جب ہم اللہ کی مخلوق ہوا کو نہیں دیکھ سکتے، تو پھر یہ آنکھ خالق ہوا کو کیسے دیکھ سکتی ہے۔

ایک بار میں پورنیہ میں تقریر کر رہا تھا۔ بولتے بولتے اچانک ذہن میں ایک بات آگئی اور میں نے مجمع سے کہا:

بھائیو! آج تک تو آپ نے ہوا کو نہیں دیکھا لیکن اگر میں دکھا دوں تو؟ یہ سنتے ہی سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ بعض جو سو رہے تھے، بعض

جو اونگھ رہے تھے اب سب بیدار ہو گئے۔ چونکہ جس ہوا کو آج تک نہیں دیکھا تھا اسے دیکھنے کے لئے سب اٹھ بیٹھے۔ میں نے کہا بھائیو! اپریل مئی میں آبادیوں سے باہر ایک گول ہوا دیکھی ہوگی، جیسے پانی میں بھنور ویسے ہی یہ چکر کاٹتی ہے۔ میں نے دریافت کیا تم لوگ اسے کیا کہتے ہو کسی نے کہا بگولا، کسی نے کہا بونڈر، میسور کے احباب سے میں نے پوچھا کہ آپ لوگ کیا کہتے ہیں تو لوگوں نے سر جھکا لیا۔ میں نے کہا ارے بھائی بولو۔ تم لوگوں نے گردن کیوں جھکالی۔ تو سبھوں نے گردن اور نیچی کرلی گویا مراقبہ میں چلے گئے۔ جب میں نے بہت اصرار کیا تو کسی گوشہ سے آواز آئی ہم اسے "شیطان باڑا" کہتے ہیں۔

بہرحال ہر صوبہ کی الگ الگ زبان، بھانت، بھانت کی بولی ہے۔ میں نے کہا وہ "ہوا" ہی تو ہے جسے تم لوگ کہتے ہو دیکھو وہ ہوا گئی، وہ گئی، ارے بہت دور چلی گئی۔ آخر وہ ہوا ہی تو دیکھ رہے ہو یہ سن کر مجمع پر سناٹا طاری رہا۔ میں نے کہا بھائیو! تم ہوا نہیں دیکھ رہے ہو۔ اس ہوا کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اس نے دھول کا، غبار کا، پتوں اور تنکوں کا لباس پہن لیا ہے۔

تم ہوا نہیں دیکھ رہے ہو بلکہ ہوا کا لباس دیکھ رہے ہو۔ چنانچہ جیسے جیسے ہوا کی رفتار سست ہوتی جائے گی ویسے ویسے دھول زمین سے لگتی جائیگی۔ تنکے الگ ہوتے جائیں گے، غبار علیحدہ ہوتا جائے گا۔ اب وہ ہوا برہنہ ہو جائے گی۔ اب ڈھونڈھو، وہ ہوا کہاں ہے۔ کیا معلوم؟ چونکہ اس کا لباس اتر گیا۔

معلوم ہوا آپ لوگوں نے ہوا کو نہیں دیکھا بلکہ اس کے لباس کو دیکھا ہے۔ غبار، دھول، پتے، تنکے یہ سب اس کے لباس تھے۔

اے دوستو! بس یہیں سے ایک فلسفہ اور بھی سمجھ میں آیا کہ تم نے

ہوا نہیں بلکہ ہوا کا لباس دیکھا ہے۔ بس ایسے ہی آج تک کسی نے "حقیقتِ محمدی" کو نہیں دیکھا بلکہ لباسِ بشری کو دیکھا ہے۔ کسی نے اچھا کہا ہے ؎

دھوکے میں آ نہ جائے کہیں فکرِ آگہی
آقائے کائنات لباسِ بشر میں ہے

حیرت ہے ان کوتاہ بینوں پر جنھوں نے لباس دیکھا اور اپنا جیسا کہہ دیا۔ مگر یہ نہیں دیکھا کہ لباس پہنا یا کس نے ہے۔ ارے یہ تو ان کا کرم ہے کہ ہمارا لباس پہن کر ہمارا مقام و منصب اونچا کر دیا۔ چنانچہ ایک شاعر بھی فرشتوں سے آنکھ ملا کر کہتا ہے۔ جہاں تمہارا پر جلے اس سے کہیں آگے ہمارا قدم بڑھے۔ آخر ش وہ کون ہے جو سدرہ سے آگے بڑھا تھا وہ میرے سرکار ہی تو تھے جو لباسِ بشر میں آئے۔ ؎

اگر یک سر موئے بر تر پرم،
فروغ تجلّی بسوزد پرم،

حضرات! میں ابھی تک تمہید ہی میں الجھا رہ گیا۔ میں نے اتنا تو سمجھایا کہ سب سے پہلے میرے رب نے میرے مصطفٰےؐ کو پیدا کیا۔ مگر اب مجھے خلقِ اول کا فلسفہ سمجھانا ہے کہ سب سے پہلے پیدا کرنے کا فلسفہ کیا ہے؟

فلسفۂ خلقِ اوّل:۔ حضرات! اس عنوان کی تمہید اتنی طویل ہو گئی کہ خود اسے ایک مستقل عنوانِ تقریر بنایا جا سکتا تھا۔ مگر شروع ہی سے میں نے زبان و قلم پر ایجاز و اختصار کا پہرہ بٹھا رکھا ہے، جو بات چند لفظوں میں ادا کی جا سکے خواہی نخواہی اسے طول دینے اور پھیلانے سے کیا فائدہ۔ اس لئے اسے تقریر بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ وہ ایک ایسی تمہید ہے جو تقریر کا جزو بن گئی۔

حضرات! یہ بات تو ذہن میں اتر گئی خدائے قدیر نے سب سے پہلے میرے مصطفےٰ کو پیدا کیا۔ اب اس کا فلسفۂ اول ملاحظہ فرمائیں:

ا:۔ محترم بزرگو اور دوستو! خلق اول کا ایک فلسفہ تو یہ ہے کہ اللہ نے میرے سرکار کو سب سے پہلے پیدا کر کے اپنی خالقیت کے کمال واکملیت کا اعلان فرمایا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے مثلاً اللہ کے صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ خالق ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ پردۂ عدم سے کسی کو وجود میں لانا، کسی کو وجود بخشنا، مگر اسی رب نے اپنے بندوں کو وہ صفت دی ہے بنانے کی۔ یہ بندہ نئی چیزوں کو بناتا ہے، چند چیزوں کو جوڑ گانٹھ کر ایک نئی چیز کو وجود میں لاتا ہے جس کی طرف ڈاکٹر اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ جیسا کہ یہ ہمارے سامنے مائک ہے، آج سے اسیؔ برس پہلے اس کا کوئی وجود نہیں تھا لیکن انسانی ذہن وفکر نے کچھ چیزوں کو ایک دوسرے میں پیوست کیا۔ انھیں ملایا، جوڑا، گانٹھا۔ تو ایک نئی چیز بنائی۔

واضح رہے کہ اسے تخلیق نہیں کہیں گے۔ صنعت کہیں گے۔ یہ اللہ تعالےٰ کی دی ہوئی سوجھ بوجھ ہے کہ فکر انسانی اپنی اسی صلاحیت سے کسی نئی چیز کو وجود میں لاتا ہے۔ لیکن انسان اپنی صنعت کو پہلے کمال درجے کی نہیں بنا تا پہلے نقص والی بنائے گا، کمزور بنائے گا، گھٹیا درجے کا بنائے گا مثلاً یہ بنانے والا انسان جب اس میدان میں اترا تو اس نے سب سے پہلے گراموفون بنایا۔ آج سے تقریباً چالیس برس پہلے کی تاریخ کا جائزہ لیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ اگر گراموفون کسی گاؤں اور دیہات میں آجاتا، تو بارہ گاؤں کے لوگ اسے سننے کے لئے اکٹھا ہو جاتے۔ شہر میں آجائے تو محلہ اور پڑوس کے لوگ ٹوٹ پڑتے۔

حضرات! انسان نے گراموفون بنایا تو، مگر اسے تسلی نہ ہوئی۔

آگے بڑھنے کی پیاس بجھ نہ سکی بلکہ یہ تشنگی تیز سے تیز تر ہو گئی۔ اس نے سوچا! بنایا تو مگر یہ کیا بنایا جس کی آواز ایک فرلانگ سے زیادہ نہ جا سکے۔ ارے وہ بناؤ کہ بولیں دلی میں اور سنے ساری دنیا۔ چنانچہ اس کی فکر میں لگ گیا اور جد وجہد کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر اس نے کامیابی کا منھ دیکھا۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ اس نے ریڈیو کے کل پرزوں پر قابو پا کے ایک نیا شاہکار پیش کیا اور پوری دنیا میں اس کی واہ واہ ہو گئی۔ لیکن پھر بھی اس کا فن مطمئن نہ ہو سکا۔ آگے بڑھنے کی فکر میں لگا رہا اجی! یہ کیا بنا دیا۔ آواز تو سنی جائے مگر بولنے والے کی صورت نہ دیکھی جائے مزہ تو جب ہے کہ بولنے والے کی صورت بھی دیکھی جائے۔

چنانچہ تھک کر بیٹھ نہ گیا بلکہ حصولِ مقصد کے لئے شب و روز سرگرم رہا۔ اور اپنی صلاحیتوں کو نشانے پر لگائے رہا۔ آخر ایک دن وہ بھی آیا کہ اس نے ٹیلی ویژن پر قابو پا لیا کہ بولنے والے کی آواز بھی سنی جائے اور اس کی صورت بھی دیکھی جائے۔

حضرات! معلوم ہوا کہ انسان نئی چیزوں کو بناتا تو ہے مگر مرتبۂ اولیٰ میں کمال والی چیز نہیں بناتا بلکہ کمال کی جانب تدریجاً بڑھتا ہے۔ رینگتا ہے، کبھی دوڑتا ہے اور کبھی چھلانگ لگاتا ہے۔ غرض کہ اپنی نوع بنوع رفتار سے اپنے منصوبے و مقصد میں قابو پانے کی کوشش کرتا ہے

حضرات! اب خلقِ اول کا فلسفہ ملاحظہ فرمائیے:

کہ پروردگارِ عالم نے میرے سرکار کو سب سے پہلے پیدا فرما کے انسانوں کی صنعت گری اور اپنی صفتِ خالقیت کے درمیان ایک بہت ہی واضح لکیر کھینچ دی کہ انسانو! جب تم کوئی نئی چیز بناتے ہو تو پہلے کمال والی نہیں بنا پاتے۔ نقص والی، کمزور اور گھٹیا درجے کی بناتے ہو۔ پھر تم تدریجاً کمال کی جانب رینگتے ہو۔ چلتے ہو، بڑھتے ہو

مگر میں نے اس کائنات کو سب سے پہلے قدم نازِ مصطفےٰ سے سنوارا اور سجایا گویا میں نے سب سے پہلے ایک ایسے کمال والے کو پیدا کیا کہ اب اس عالم خلق میں کوئی بھی ان سے زیادہ کمال والا نہ پیدا ہو گا۔

ع نہ کسی کے وہم و خیال میں نہ نگاہِ آئینہ ساز میں

ایک ایسے حسین کو پیدا کیا کہ خود "حسن" جس کی ملاحت کی قسم کھائے۔ اب ان سے زیادہ کوئی حسین نہ پیدا ہو گا۔ ایک ایسے اعلم اولین و آخرین کو پیدا کیا کہ علم ماکان و مایکون جس کی گرفت میں ہے۔ اب ان سے زیادہ جاننے والا کوئی پیدا نہ ہو گا۔ گویا اب میری بارگاہ سے جسے جو کچھ ملے گا وہ انھیں کا صدقہ ملے گا۔

حضرات! اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ خلق اول کا ایک بنیادی فلسفہ یہ بھی ہے کہ رب نے سب سے پہلے میرے مصطفےٰ کو پیدا کر کے اپنی خالقیت کے کمال کا اعلان فرما دیا ہے۔ گویا اشارہ یہ ہے کہ اے لوگو! گہنانے والے چاند میں میری خالقیت کا کمال نہ ڈھونڈو۔ اگر دیکھنا ہی ہے، تو مصطفےٰ کا تلوا دیکھو۔ چاند، سورج، انجم و کہکشاں جس کے تلوے کی دھول ہیں۔ اور اس چہرۂ زیبا کو دیکھو جس کے حسن ساگر میں چاند و سورج کنول کی طرح تیر رہے ہیں۔ گویا یہ صفتِ خالقیت کا کھلا ہوا اعلان ہے۔

حضرات! اس فلسفہ کو یوں بھی سمجھئے کہ اگر خدا پہلے اندھے کو پیدا فرماتا پھر ایک آنکھ والے، کانے کو، پھر دو آنکھ والے، انکھیارے کو۔ پہلے لولے کو پھر دو ہاتھ والے کو، پہلے ایک ٹانگ والے کو پھر دو پاؤں والے کو، پہلے پاگل و دیوانے کو پھر ہوشیار اور عقل والے کو، پہلے گونگے بہرے کو، پھر بولنے سننے والے کو۔ تو یہ بنانے والا نادان انسان اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر سامنے آجاتا کہ خداوندا! تیری خالقیت اور میری

صنعت میں فرق ہی کیا رہا۔ لہٰذا پروردگار نے ان کے منہ میں دہی جمانے اور ہونٹوں پر تالا لگانے کی خاطر عالم امکان کی خشتِ اوّل بنا کر میرے سرکار کو پیدا فرمایا۔ اور ایسی سج دھج کے ساتھ کہ کوئی ان کا جیسا دوسرا بن نہ سکے۔

آخری دھماکہ :- لہٰذا اے بنانے والو! ہمارا تم سے بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ جس دن تم نے گراموفون بنایا تھا اسی روز تم نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کیوں نہ بنایا؟

حضرات! یہ ایک ایسا مطالبہ ہے کہ صنعت گردوں کی بازی گری بیچ چوراہے پر برہنہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ انسان پہلے اول درجے والی شئی نہیں بناتا۔ اپنے بنانے میں تدریجاً ترقی کرتا ہے۔ اس لئے رب نے سب سے پہلے ذات ستودہ صفات کو پیدا فرمایا کہ اب ان سے زیادہ علم و فضل والا کوئی پیدا ہی نہ ہوگا اسی لئے میں نے عرض کیا کہ اے لوگو! اگر اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا کمال دیکھنا چاہتے ہو تو بدر کامل کو نہ دیکھو۔ بلکہ میرے مصطفٰے کا تلوا دیکھو۔

ایک لطیف نکتہ : لہٰذا اب اگر کوئی میرے سرکار میں کسی طرح کا کوئی نقص تلاش کرتا ہے تو وہ سرکار پر حملہ نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے کمالِ خالقیت میں عیب تلاش کر رہا ہے۔ اور تقریباً ہر عیبی کا یہی دستور ہے کہ وہ اپنی طرح دوسروں میں بھی عیب ڈھونڈا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ اور اس نے اپنے محبوب کو بھی نقائص سے بری فرمایا۔ اسی لئے سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں :-

وہ کمالِ حسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

(۲)

حضرات! اس سلسلہ کی اب دوسری کڑی ملاحظہ فرمائیے! کہ خلقِ اول کا دوسرا فلسفہ کیا ہے۔

محترم حضرات! ممبرِ رسول کا ایک خطیب و مقرر جب قوم کو خطاب کرتا ہے تو بسا اوقات وہ آقائے دوجہاں کی اس حدیثِ مبارک پر گفتگو کرتا ہے: یا ابا بکر لم یعرفنی حقیقۃً غیر ربی یعنی اے ابوبکر میری حقیقت کو میرے رب کے سوا کسی نے نہیں جانا۔ لاشک فیہ" نہ اس میں کوئی شبہ ہے نہ اس میں کوئی اور رائے۔ کائنات میں کون ایسا ہے جو حقیقتِ محمدی کو جان اور سمجھ سکے۔

بیدل عظیم آبادی نے کیا ہی پتے کی بات کہی ہے:

بیدل آں گوہرِ نایاب سُراغ
بمحیطیست کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ در آئینۂ ہوش
گل تو اں گفت مگر چیدنی نیست

لیکن بعض دانشوروں کی طرف سے اس عقیدے پر بظاہر ایک بہت ہی اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ سوال ملاحظہ فرمانے سے پہلے جماعت محدثین کا ایک بہت ہی لطیف تبصرہ ملاحظہ فرمائیں جو اسی حدیث مبارک سے متعلق ہے۔

حضرات! محدثین کرام کا ایک سوال ہے کہ مذکورہ بالا حدیث شریف میں سید الکونین روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے آج

ابوبکر ہی کو کیوں مخاطب فرمایا۔ آخرش ابوہریرہ، عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ ابن عباس، وغیرہ جیسے صحابۂ کرام کیوں نہ مخاطب ہوئے چنانچہ محدثین کرام ہی خود اس کا جواب عطا فرماتے ہیں اگر حضرت ابوہریرہ مخاطب ہوتے تو یہ شبہ رہ جاتا کہ ابوہریرہ مخاطب ہیں ہوسکتا ہے شیر خدا علی مرتضیٰ نے سمجھا ہو۔

ایسے ہی اگر حضرت علی مخاطب ہوتے تو یہ شبہ باقی رہ جاتا ممکن ہے عثمان غنی نے سمجھا ہو۔ اور اگر حضرت عثمان غنی مخاطب ہوتے تو پھر شبہ کی گنجائش باقی رہ جاتی۔ ہوسکتا ہے فاروق اعظم نے سمجھا ہو اور اگر فاروق اعظم مخاطب ہوتے تو اس کا امکان رہ جاتا ہوسکتا ہے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین نے سمجھا ہو۔ لیکن آقائے دوجہاں روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر صدیق کو مخاطب فرما کے تمام ہی شکوک و شبہات کے دروازے کو یکسر بند فرما دیا۔

چونکہ انبیاء و رسل کے بعد نوع انسان میں سب سے بڑا مرتبہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا ہے۔ لہٰذا یہ بات آفتاب سے زیادہ روشن ہوگئی کہ جب سیدنا ابوبکر صدیق حقیقت محمدی کو نہ سمجھ سکے تو پھر دوسرا کون سمجھ سکتا ہے۔

چنانچہ غالب جیسا قادر الکلام شاعر بھی اس کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

حضرات! محدثین کرام کی لطیف گفتگو سماعت فرمانے کے بعد اب دانشوروں کے اس سوال کو ملاحظہ فرمائیں جو اس حدیث پر وارد ہوتا ہے۔ یعنی حدیث مبارک کا یہ کہنا ہے کہ حقیقتِ محمدی کو خدا کے سوا کسی نے نہیں جانا! اسی کو ایک خطیب و مقرر اسٹیج پر کہتا ہے لیکن اہلسنت کی

بلند پایہ درس گاہوں میں جائیے۔ مثلاً خود الہ آباد کی عظیم المرتبت مرکزی و معیاری درسگاہ دارالعلوم غریب نواز میں تشریف لائیں جس سے متعلق میرا اپنا ایک شعر ہے ؎

جیسے ہیں میرے خواجہ اونچے ویسے ہی عمارت عالی ہے
ہے جو بھی یہاں وہ رازی ہے جو بھی یہاں وہ غزالی ہے

کہنا یہ ہے کہ یہاں درس نظامی کے جملہ علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں۔ تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، گرامر، معانی وبیان، علم العروض والقوافی، علم کلام، علم المیراث، منطق وفلسفہ وغیرہ اب آپ اسی درسگاہ میں تشریف لائیں جہاں طلبہ کو منطق وفلسفہ کا درس دیا جاتا ہے، استاذ طلبہ کو انسان کی حقیقت سمجھا رہا ہو" ماھو الانسان" انسان کیا ہے۔؟ استاذ انسان کی حقیقت سمجھاتا ہے کہ انسان جوہر ہے، جسم ہے، جسم نامی ہے، حسّاس ہے، متحرک بالارادہ ہے، دریابندہ معقولات ہے۔ چنانچہ منطق کی ابتدائی کتابوں سے لے کر آخر تک یہی سوال ہوتا ہے کہ ماھو الانسان، انسان کیا ہے؟

چونکہ منطقی اشیاء کے حقائق سے گفتگو کرتے ہیں۔ لہٰذا ماھو الانسان کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ اس کا یہی جواب دیا جاتا ہے کہ انسان عرض نہیں جوہر ہے، جسم ہے، بڑھنے والا جسم ہے، حساس ہے، ارادے سے متحرک ہوتا ہے، معلومات کو ترتیب دے کر نہ معلوم ہونے والے مجہولات کو حاصل کرتا ہے۔

مثلاً منطقیوں کا طریق استدلال یہ ہے کہ العالم متغیر وکل متغیر حادث۔ عالم متغیر ہے۔ اور ہر متغیر حادث ہے۔ یعنی عالم میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آج جہاں اجڑی ہوئی زمین ہے کل وہیں باغ وباغیچہ تھا۔ کل جہاں چمنستان ولالہ زار دیکھا آج وہیں اجڑا ہوا دیار

ہے۔ لہٰذا بدیہی طور پر نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جب عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہے تو عالم حادث ہے۔ اسی کو کہتے ہیں معلومات کو ترتیب دے کر مجہولات کو حاصل کرنا۔ اور یہی انسان و حیوان کے درمیان خطِ امتیاز اور حدِ فاصل ہے۔ ورنہ حیوان بھی جوہر ہے، جسم ہے، جسمِ نامی ہے۔ حساس ہے، متحرک بالارادہ ہے لیکن وہ معلومات کو ترتیب دے کر مجہولات کو حاصل نہیں کر پاتا۔

حضرات! آج تک آپ نے یہ سنا ہوگا کہ ملک کے کسی گوشہ میں "بیلوں" نے بطورِ احتجاج ہمارے خلاف کوئی میٹنگ کی ہو۔ کہ انسان ہم پر بہت ظلم کرتا ہے۔ ہل میں بھی استعمال کرتا ہے اور بیل گاڑی میں بھی۔ لہٰذا اس ایجنڈے پر کانفرنس بلائی جائے تاکہ ہم سے ایک ہی کام لیا جائے، دوسرا کام نہ لیا جائے۔ اور وہ بھی ہماری مرضی کے مطابق۔

مبدا فیاض نے تو یہ عقل و شعور صرف انسانوں کو عطا فرمایا ہے۔ [1]

حضرات! گفتگو یہ چل رہی تھی کہ اسٹیج کے خطیب کا یہ کہنا ہے کہ خدا کے سوا کسی نے حقیقتِ محمدی کو نہ سمجھا۔ اور فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے حقیقتِ انسانی کو دریافت کرلیا۔ اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اجن و فرشتہ سے نہیں تھے۔ بلکہ نوعِ انسانی ہی سے تھے۔ لہٰذا اب یہ کہنا کیسے درست ہوگا کہ خدا کے سوا کسی نے حقیقتِ محمدی

---

[1] حضرات! مجھے اس بحث میں الجھنا نہیں چاہیے تھا۔ اس سے صرف عربی درسگاہ کے مبتدی طلبہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہی ہمت کرکے اتنے حصے کو اپنی تقریر کا جز بنا سکتے ہیں۔ معذرت کیش: ضیائی

کو نہیں سمجھا۔ جبکہ فلاسفہ نے حقیقتِ انسانی کو دریافت کرلیا۔ اور سرکار بی نوع انسان سے تھے۔

حضرات! یہی وہ مقام ہے جہاں خلقِ اول کا فلسفہ سمجھ میں آتا ہے۔ بہت ہی ہوشمندی و دانائی سے سماعت فرمائیں کہ اس عقدۂ لاینحل کی گرہیں کھلنے جارہی ہیں۔ وہ سوال جو پہاڑ سے زیادہ بھاری بھرکم معلوم ہو رہا ہے۔ ابھی وہ تارِ عنکبوت (مکڑی کے جالے) سے بھی کمزور اور نرم و نازک ثابت ہوگا۔

حضرات! یہ سولہ آنہ صحیح ہے اور یہیں اس کا بھرلور اعتراف ہے کہ فلاسفہ اور مناطقہ نے حقیقتِ انسانی کو جان لیا۔ مگر وہ یہ تو بتائیں کہ کس انسان کی حقیقت کو جانا؟

اب مجھے کہہ لینے دیجئے! انھوں نے اس انسان کی حقیقت کو جانا جو آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے پیدا ہوا ہے۔ اربعہ عناصر جس کی سرشت، ضمیر و خمیر میں شامل ہے اور میرے سرکار اس وقت پیدا ہوئے جب کہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا کا وجود ہی نہ تھا۔ ان سبھوں کا وجود تو سرکار ہی کے صدقے میں ہے۔ اسی لئے انھیں باعثِ ایجادِ عالم کہا جاتا ہے۔ آخر لولاک لما خلقت الافلاک کا مفہوم کیا ہے؟ یہی ہے خلقِ اول کا فلسفہ کہ رب نے سب سے پہلے پیدا فرماکے اس حقیقت کو آشکارا کردیا کہ فلاسفہ نے اس انسان کی حقیقت کو جانا جو آگ، پانی، مٹی اور ہوا کا بنا ہوا ہے۔ اور میرا محبوب تو باعثِ ایجادِ عالم ہے۔ اس وقت پیدا ہوئے جب میرے سرکار کے نور کے سوا کچھ نہ تھا ؎

تو اصلِ وجود آمدی از نخست
دگر ہرچہ موجود شد فرعِ تست

چنانچہ حدیث قدسی ہے. سرکار ارشاد فرماتے ہیں اول ما خلق اللہ نوری وکل الخلائق من نوری وانا من نور اللہ ۔ اللہ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا فرمایا اور میرے نور سے ساری مخلوقات کو۔ اور مجھ کو اپنے نور سے۔

جب نورِ الٰہی کی حقیقت کو سمجھنا انسانی دسترس سے باہر ہے تو پھر کس کی مجال جو حقیقت محمدی کو سمجھ سکے۔

حضرات! اس کا فلسفہ تو اختتامی گفتگو پر عرض کروں گا کہ ساری مخلوق نور مصطفٰے سے پیدا کی گئی. اس کا فلسفہ کیا ہے؟ ابھی تو خلق اول کا فلسفہ چل رہا ہے۔

(۳)

حضرات! خلق اول کا تیسرا فلسفہ سماعت فرمائیں۔

آپ نے بہت سے علماء اور خطباء سے سنا ہوگا کہ معراج میں سرکار اتنی بلندیوں سے پرے گذرے کہ کبھی مکان میں نظر آئے، اور کبھی لامکاں میں ۔ اس پر ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواہ فلسفہ قدیم ہو یا فلسفہ جدید۔ ہر ایک کا کہنا یہ ہے کہ جسم کو مکان چاہیے، خلاء محال ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ جسم ہو اور مکان نہ ہو۔

حضرات! بظاہر یہ سوال بہت ہی اہم ہے لیکن اگر آنے والی گفتگو کو بغور سماعت فرمائیں تو اس کی حیثیت تارعنکبوت جیسی بھی نہ رہ جائے گی مکڑی کا جالا کم از کم نظر تو آئے گا مگر یہ سوال محض ایک خواب وخیال ہو کے رہ جائے گا۔

محترم حضرات! اس کا جواب سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آپ مکان کو سمجھئے۔ فلاسفۂ یونان کا یہ کہنا ہے کہ آسمان سات ہیں۔ اور وہ آخری آسمان کو فلکِ اطلس یا فلک الافلاک کہتے ہیں۔ فلک اطلس

کے معنی سادہ آسمان جس پر کوئی ستارہ نہ ہو۔ یہ جتنے بھی ستارے نظر آتے ہیں یہ سب آسمان اوّل ہی کے نہیں ہیں بلکہ دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے کے ہیں۔ چنانچہ سورج یہ چوتھے آسمان کا سیارہ ہے۔ فلاسفہ کے یہاں مکان کی تعریف تو یہ ہے کہ جسم حاوی کی سطح باطن جو جسم محوی متمکن کی سطح ظاہر سے مماس ہو مگر میں آپ کو فلسفی اصطلاحات کی پہیلیاں سمجھانے نہیں بیٹھا ہوں بلکہ اونچے سے اونچے مضامین کو پانی پانی کر کے سمجھانے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ لہٰذا اس مفہوم کو اپنی زبان میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

پھر اسی نقطۂ آغاز پر آجائیے کہ جسم کو مکان چاہیے۔ خلا محال ہے لہٰذا یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ سرکار لامکاں سے گذر رہے۔

حضرات! فلاسفہ کے یہاں آسمان کی ترتیب سات ہے۔ اور ساتواں آسمان گویا مکان کی آخری چوہدی ہے۔ لہٰذا اب سفر معراج میں سرکار کا جانا ملاحظہ فرمائیں۔

ہاتھ کو آسمان نما بنا کر گویا کہ پہلا آسمان ہے، جب تک جسم مصطفیٰ اس سے گذرتا رہا گویا مکان سے گذرا۔ اب اسے پار کیا۔ اب یہ دوسرا آسمان ہے۔ جب تک اس سے گذرتا رہا مکان سے گذر رہا ہے۔ اب اسے بھی پار کر لیا۔ اب یہ تیسرا آسمان ہے! جب تک اس سے گذرتا رہا مکان سے گذرتا رہا۔ اب اسے بھی پار کر لیا۔ اب یہ چوتھا آسمان ہے جب تک اس سے گذرتا رہا مکان سے گذرتا رہا اسے بھی پار کر لیا۔ اب یہ پانچواں آسمان ہے، جسم مصطفیٰ مکان سے گذرتا رہا اسے بھی پار کر لیا۔ اب چھٹے سے گذر رہا ہے مکان سے گذر رہا ہے۔ اسے بھی پار کر لیا۔ اب ساتویں آسمان سے گذر رہا ہے مکان سے گذر رہا ہے۔ اب اسے بھی پار کر لیا۔

حضرات! اب ساتویں آسمان کے بعد مکان نہیں ہے اسی کا نام

"لامکان" ہے۔

آپ جیسے علم دوست اور دانشور ضرور یہ کہیں گے کہ مشتاق نظامی تمہاری اس گفتگو سے ہم نے مکان ولامکان تو سمجھ لیا مگر وہ جوں کا توں باقی رہ گیا کہ جسم کو "مکان" چاہیے۔ تمہاری اس تقریر سے اس کا جواب تو ملا نہیں۔

حضرات! یہی ہے خلقِ اول کا فلسفہ یعنی اللہ نے سب سے پہلے میرے مصطفےٰ کو پیدا فرمایا، تو گویا اس وقت پیدا فرمایا کہ ابھی آسمان بھی نہ پیدا ہوا تھا، اسے ابھی خلعتِ وجود سے نوازا نہ گیا تھا، تو کیا پتہ چلا میرے سرکار مکان کے پیدا ہونے سے پہلے پیدا ہوئے۔ پھر فرمائیے! جب مکان کا وجود ہی نہ تھا تو سرکار کہاں پیدا ہوئے؟ معلوم ہوا کہ لامکاں میں پیدا ہوئے۔ لہٰذا اب کوئی استحالہ واشکال باقی نہ رہ گیا۔ گویا مکان بھی مکان ہے مصطفےٰ کا اور لامکاں بھی مکان ہے مصطفےٰ کا، تو جب لامکاں میں پیدا ہوئے تو وہ بھی ان کا مکان ٹھہرا۔ تو گویا اپنے مکان ہی تو جارہے ہیں۔

اے نادانو! تم اپنے مکان جاؤ تو کوئی تعجب نہیں۔ اور سرکار ایک رات اپنے مکان چلے جارہے ہیں، تو کلیجہ تمہارا پھٹا جارہا ہے۔ گویا خدا وہ ہے جس کا کوئی مکان نہیں اور مصطفےٰ وہ ہیں "مکان بھی ان کا مکان ہے اور لامکاں بھی ان کا مکان ہے۔ اسی لئے تو سیدی امام احمد رضا خاں علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

وہی لامکاں کے مکیں ہوئے سرِ عرش تخت نشیں ہوئے
وہ نبی ہے جس کے ہیں یہ مکاں وہ خدا ہے جس کا مکاں نہیں

فالحمد للہ علیٰ ذالک والصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ۔

(۴)

حضرات! خلقِ اول کا چوتھا فلسفہ ملاحظہ فرمائیے :۔

یہ ہمارے مولانا ولی محمد صاحب خطیب جامع مسجد باسنی ناگور تشریف فرما ہیں ۔ حج کا ارادہ فرمایا ، مہمانوں کا ہجوم ، الوداع کہنے والوں کی بھیڑ بھاڑ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلے ، موقع شناس مالی دروازے پر کھڑا ہو گیا ، مالی ، مولانا کا مزاج آشنا تھا وہ جانتا تھا کہ مولانا پھول پودوں کے بہت شائق ہیں ۔ نوع بنوع پھولوں سے باغیچے کو باغ و بہار بنا رکھا ہے اس نے کہا کہ حضور خون پانی ایک کر کے ، نہ جانے کہاں کہاں کی خاک ، چھان کر گلاب کا ایک ایسا پودا لایا ہوں کہ پورے صوبے میں اسکی مثال نہ مل سکے ۔ مولانا نے قیمت پوچھی ۔ اس نے کہا چار آنہ ۔ مولانا نے شروانی میں ہاتھ ڈالا ، چونی نکالی اور اس کے حوالہ کر دیا ۔

گلاب کا پودا لے کر مولانا باغیچہ میں آئے ۔ تھوڑی سی زمین کھودی اور پودا اس میں نصب کر دیا ۔ گلاس سے پانی چھڑکا ۔ حفاظت کے لئے انھوں نے چوہدری بنا کر لڑکوں سے کہا ، دیکھیں تو سفرِ حج پر جا رہا ہوں لہٰذا تم لوگ اس کی نگرانی کرنا ، دھوپ کی تمازت سے سوکھ نہ جائے پانی سے وقتاً فوقتاً سینچتے رہنا ۔ کوئی جانور چرنے نہ پلئے ۔ دیکھ بھال کرنا ۔ غرض کہ اس کی نگہداشت و نگرانی سے غافل نہ رہنا ۔

بچوں نے بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا " والد محترم " مطمئن رہیے اس کی حفاظت و نگرانی میں کوئی کسر باقی نہ رکھیں گے ۔

مولانا حج کے لئے رواں دواں ہوئے ۔ تین ساڑھے تین مہینے کے بعد واپس آئے ۔ نماز نفل ادا کی ۔ گھر اور محلہ پڑوس والوں کی کھجور اور آب زم زم سے ضیافت کی ۔ لبیک کا بیک آغاز سفر یاد آیا ۔ اٹھ کھڑے ہوئے ۔ بچوں سے پوچھا بتاؤ وہ گلاب کا پودا سلامت ہے یا سوکھ گیا

لڑکوں نے عرض کیا، والد گرامی پوچھئے مت، خود چل کر دیکھ لیجئے۔ حاجی صاحب باغیچہ میں تشریف لے گئے اور فرمایا ننھے منے پودے کو نصب کر کے گئے تھے۔ اب وہ پھیل کر کئی گز زمین گھیر چکا ہے۔ غنچے دیکھے کھل اٹھے کلیاں دیکھیں مسکرا دیا، پھولوں پر نظر ڈالی فرط مسرت سے پھول گئے۔ بے اختیار زبان سے نکلا۔ ارے یہ میرا گلاب ہے۔

میرا اتنا کہنا تھا کہ زمین چیخ اٹھی۔ حاجی صاحب! ایسا ظلم نہ کیجئے ابھی آپ کا تازہ تازہ حج ہے، باسی بھی نہ ہوا۔ انصاف سے کام لیجئے۔ چونی آپ کی تھی اور کلیجہ میرا۔ چونی بہت کچھ ہو گئی اور کسی کا کلیجہ کچھ بھی نہ ہو۔ نشتر میرے ہی کلیجے پر لگائے گئے۔ اسے نصب کرنے کے لئے اک میرا ہی کلیجہ رہ گیا تھا ہتھیلی پر کیوں نہ جمالیا آپ نے۔ کلیجہ میرا، اور گلاب تنہا آپ کا۔ خطا معاف گلاب تنہا آپ ہی کا نہیں میرا بھی ہے۔ زمین کا اتنا کہنا تھا کہ ہواؤں کے ایک تیز جھونکے نے زمین کی دھول اڑا دی۔ نادان! صرف تیرا ہی حق نہیں میرا بھی حق ہے۔ اگر تو نے اسے کلیجہ پر لگایا ہے تو میں نے اسے جھولے بھی جھلائے ہیں۔ کبھی نسیم سحر بن کر، کبھی باد صبا بن کر، کبھی دبے قدموں سرگوشی کے انداز میں، کبھی واشگاف طور پر۔ ہوا کا اتنا کہنا تھا کہ دور سے شبنم آنسو بن کر ٹپک پڑی۔

"اے گلاب پر اجارہ داری قائم کرنے والو! ایسا ظلم نہ کرو یہ گلاب تنہا تمہارا نہیں میرا بھی ہے۔ اگر تم نے جھولے جھلائے تو اس کے رخسار پر گرد بھی ڈالی ہے۔ تو نے اگر جھولے جھلائے ہیں تو سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہوتے منھ میں نے دھلائے ہیں، وضو میں نے کرایا ہے۔ طلوع فجر سے پہلے وضو کرایا تاکہ یاد خدا کرے۔

سورج بولا ارے نادانو! اگر میری حرارت و گرمی اسے نہ ملتی تو اس کی ہریالی کیسے باقی رہتی۔ اس کے چہرے زرد پڑ جاتے۔ چاند نے کہا

اگر میری ٹھنڈی چاندنی نہ ملتی تو خشک ہو گیا ہوتا۔

غرض کہ گلاب کا ایک پودا نہ جانے کتنے احسانات سے دبا ہوا ہے زمین کہے میرا گلاب، ہوا کہے میرا گلاب، شبنم کہے میرا گلاب، سورج کہے میرا گلاب، چاند کہے میرا گلاب، اور مولانا فرمائیں تنہا میرا گلاب۔

محترم حضرات! ننھا منا پودا بار احسان سے دبا ہوا ہے۔ سر نہیں اٹھا سکتا کسی سے آنکھیں نہیں ملا سکتا۔

حضرات! اب خلق اول کا فلسفہ ملاحظہ فرمائیں۔ اگر کہیں خدا میرے سرکار سے پہلے آسمان کو پیدا فرماتا۔ زمین پیدا ہوتی۔ چاند ستارے کا وجود ہوتا، تو زمین سینہ تان کر میرے سرکار سے کہتی کہ میرا کلیجہ نہ ہوتا تو قدم کہاں رکھتے؟ آسمان بولتا میری چھتری نہ ہوتی تو سایہ کہاں سے پاتے، چاند و سورج بولتے، میری روشنی نہ رہتی تو اندھیرے میں کیسے چلتے۔ میرے مصطفٰے کا ایک وجود گرامی ہوتا اور آنکھ ملانے والے نہ جانے کتنے ہوتے۔

پروردگار نے پہلے میرے سرکار کو پیدا کر کے ان کا سر اونچا کر دیا اور ان کے قدموں میں سب کی گردن جھکا دی۔ تاکہ میرے سرکار سے کوئی اظہار برتری نہ کر سکے۔ بلکہ "رحمتِ تمام" یہ کہہ کر گذر جائے کہ

ع محمد نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا

اب گویا ساری کائنات کا کاندھا ہے اور میرے آمنہ کے لال کا تلوا۔ ساری کائنات ان کے بارِ احسان سے دبی ہوئی ہے جو وفا آشنا ہوں گے کبھی ان سے آنکھیں ملا کے بات نہ کر سکیں گے۔ البتہ جو احسان فراموش اور محسن کش ہوں گے وہ کاندھا ملانا بھی چاہیں گے اور بڑے بھائی کا رشتہ جوڑنا بھی چاہیں گے۔

اب اے لوگو! انسانوں کی آبادی میں ڈھونڈو! کون وفا آشنا

ہے اور کون احسان فراموش و محسن کش ! ایک شعر سطح ذہن پر ابھر آیا اسے بھی سماعت فرمالیں۔ شاید کہ اس سے لذّت یاب ہوں ؎

اے وفا نا آشنا میں ان وفا داروں میں ہوں !
کھاتے ہیں اہل وفا جس کی وفاؤں کی قسم !

حضرات ! حدیث مبارک کا درمیانی ٹکڑا یہ تھا کہ میرے نور سے ساری مخلوق پیدا ہوئی۔ اس سلسلہ میں آپ کو یہ زحمت دوں گا کہ کسی بھی گفتگو سے پہلے آپ ایک ضابطہ ذہن نشیں فرمالیں۔

اصطلاح کی زبان میں اسے مشتق اور مشتق منہ کہتے ہیں۔ اب آپ اپنی زبان میں سماعت فرمائیں۔ ایک شے وہ ہے جو چند چیزوں سے بنی ہوئی ہے۔ اور دوسری وہ جس سے وہ شی بنی ہے۔ یعنی ایک وہ ہے جو تیار شدہ ہے اور دوسری وہ ہے جس سے پہلی شئی تیار ہوئی ہے۔ جیسے مکان اور بلڈنگ۔ مکان بنا ہوا ہے۔ اینٹ، پتھر، لوہا، سیمنٹ چونا یہ سب اس کا میٹرل ہے جس سے مکان بنا ہے۔

حضرات ! ضابطہ یہ ہے کہ جو شئی جس سے بنائی جائے گی جہاں جہاں بنی ہوئی پائی جائیگی وہاں وہاں اس کا بھی پایا جانا ضروری ہے جس سے وہ بنی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ مکان پایا جائے اور اس کا میٹرل نہ پایا جائے۔ گھڑی پائی جائے اور اس کا پُرزہ نہ پایا جائے۔

بس اس قانون و ضابطہ کے تحت اب آپ اس حدیث کا مفہوم سماعت فرمائیں۔ سید الکونین، مالک دارین ارشاد فرماتے ہیں :

اوّل ما خلق اللہ نوری کل خلائق من نوری وانا من نور اللہ۔

حضرات ! اسے آپ اس طرح سمجھیں۔ مثلاً سونا، ایک دھات ہے۔ آپ اس سے سیکڑوں، ہزاروں، چیزیں تیار کریں جس کی شکل و

صورت جداگانہ جس کے نام الگ الگ چوڑی، زنجیر، آئرن، ہار، انگوٹھی گھڑی، بٹن، طشتری، گلاس، چمچے غرض کہ سب کی شکل الگ، نام علٰحدہ لیکن آپ کو کہنا یہی پڑے گا، سونے کی چوڑی، سونے کی زنجیر، سونے کا آئرن، سونے کا ہار، سونے کی گھڑی، کہنا یہ ہے کہ شکلیں بدل گئیں، نام بدل گیا، مگر سونا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

ایسے ہی مٹی بنتی کا گھڑا، مٹی کا گلاس، مٹی کی صراحی، مٹی کی طشتری، مٹی کی ہانڈی۔ چونکہ یہ ساری چیزیں مٹی ہی سے بنی ہیں لہٰذا جہاں اس سے تیار شدہ شئ بولی جائے گی وہاں وہاں بھی مٹی پائی جائے گی۔

بس ایسے ہی میرے سرکار نے فرمایا کہ ساری مخلوق میرے نور سے پیدا ہوئی۔ لہٰذا عالم خلق کا کوئی ایسا گوشہ وذرہ نہیں ہے کہ جہاں خلق پایا جائے اور نور مصطفٰے نہ پایا جائے۔

وہ عرش ہو یا کرسی، لوح ہو یا قلم، پستی ہو یا بلندی، آسمان ہو یا تحت الثریٰ غرض کہ جہاں جہاں خلق ہے وہاں وہاں نور مصطفٰے ہے۔

ان اصول و ضابطہ کو دیکھتے ہوئے کون ایسا ہے جو یہ کہہ کر گذر جائے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حاضر و ناظر نہیں ہیں۔ اسے حاضر نہ کہا جائے تو تم ہی بولو، اسے اب اور کیا کہا جائے۔ اسی لئے عارف باللہ، سرکار آسی علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں ؎

جو شئ تیری نگاہ سے گذرے درود پڑھ
ہر جزو کل ہے مظہر انوارِ مصطفٰے

کائنات کی کوئی ایسی شئ نہیں جو نورِ مصطفٰے سے خالی ہو۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

بشریت

ہم سیّد عالم روحی فداہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر اطلاق بشری کرتے ہیں ــــ مگر آج کی تقریر میں آپ لوگوں کو یہ سمجھنا ہے کہ بشر اور ہے "مثل بشر اور" چاند اور ہے مثل چاند اور، شیر اور ہے مثل شیر اور ـــــ رب نے بشر نہیں کہا، مثل بشر کہا ہے ــــ بس اسی نکتہ کو سمجھنے کے لئے دل کا دروازہ کھول لیجئے تاکہ یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ مثل، عین پر دلالت کرتا ہے یا غیر پر۔

موضوع خشک اور خالص علمی ہے اس لئے آپ کی بھرپور توجہ کا طلب گار ہوں۔

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَکَفیٰ وَسَلَامٌ عَلٰی حَبِیبِہِ الَّذِی اصطَفٰی

اَمَّا بَعد

فاعوذ باللہ مِنَ الشیطٰن الرَّجیم ہ

بسم اللہِ الرحمٰن الرَّحِیم ہ

قُل اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثلُکُم یُوحیٰ اِلَیَّ

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے "سرکار دو عالم کا مقامِ بشریت" آج کے غیر سنجیدہ اور بگڑے ہوے ماحول کا یہ ایک بہت ہی ابھرا ہوا سوال ہے۔ نماز، روزے، زہد و تقویٰ، اتباع شریعت بدعات و منکرات سے اجتناب و گریز کے پردے میں آقائے دوجہاں سے کاندھا ملانے اور ان سے بھائی چارہ کا رشتہ جوڑنے کی، ایک مکمل سازش اور منظم اسکیم چل رہی ہے۔ الٹا چور کو توال کو ڈانٹے کے تحت الزامات کی جو بوچھار ہم پر ہے، کہ ہم رسول اللہ کو بشر نہیں کہتے۔ اس حقیقت کو تو ہم آگے چل کر واضح کریں گے۔

لیکن سردست چند ایسی باتیں ذہن نشیں فرمائیے، کہ آخر بشریت کا موضوع اٹھایا کیوں گیا؟

حضرات! یہ بائی چانس اور کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے، بلکہ اس کے پس پردہ مشن چلانے والے گرگوں کا ذہن کام کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسا بنیادی مسئلہ ہے کہ اس سے بدعقیدگی اور گمراہی کے نہ جانے کتنے سوتے پھوٹ پڑے ہیں۔

ہم اس کا یقین رکھتے ہیں کہ اگر رسول خدا کو بس ایک معمولی بشر یا اپنے جیسا بشر تسلیم کر لیا گیا تو میلاد، سلام و قیام، علم غیب، معراج، حیات النبی وغیرہ جیسے مسائل از خود دفن ہو جائیں گے۔ چنانچہ آج جو اسکی مہم چلائی جارہی ہے کہ رسولِ خدا کی حیثیت ایک زمین دار اور گاؤں کے چودھری جیسی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے کہ جب سید عالم روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنا جیسا تسلیم کر لیا گیا تو پھر جس طرح ایک زمین دار اور چودھری کا میلاد نہیں ہوتا، اس کے لئے علم غیب نہیں مانا جاتا۔ اس پر موت طاری ہونے کے بعد اسے زندہ نہیں مانا جاتا۔ اس کی معراج نہیں مانی جاتی۔ بس ایسے ہی رسول خدا کو اگر اپنا جیسا تسلیم کر لیا گیا تو سارے کے سارے مسائل از خود بیوندخاک ہو جائیں گے۔ نہ اس پر مناظرہ ہوگا نہ مباحثہ۔ بس تمام انسانوں کے لئے جو کمالات وصفات مانے جاسکتے ہیں وہی جناب رسالت مآب کے لئے بھی تسلیم کئے جائیں گے۔

اس لئے یہ ایک امر ناگزیر ہے کہ ہماری زبان وقلم کی توانائیاں علمی وفکری کاوشیں جو کتاب وسنت سے مربوط ہوں وہ اپنے حریف کے مقابل اس طرح آمنے سامنے آجائیں کہ عشق رسول کی سرمستیوں، و سرشاریوں میں ہمارا قلم روشنائی کی بوند نہیں بلکہ توپ کا گولہ اگل رہا ہو۔ اور یہ زبان تیر ونشتر کا کام کر رہی ہو۔

ہوسکتا ہے ان جملوں کو سننے کے بعد کسی کا چہرہ اتر گیا ہو۔ چہرے اور پیشانی پر برہمی کی لکیریں ابھر آئی ہوں مگر میں ان سے معذرت کا طلب گار ہوں۔ ان سے کہدیجئے ہمارے اور آپ کے لئے قرآن اصل الاصول ہے۔ اگر کہیں بھی ہم میں اور آپ میں ذہنی وفکری اختلاف رونما ہو جائے۔ تو آپس کی تو تو، میں میں چھوڑ کے ہم قرآن کے قریب آجائیں اور اسی کو اپنا حکم تسلیم کرلیں کہ دشمنان رسول سے متعلق یہ سنت

الٰہیہ کیا ہے۔

میں آپ کو اس تفصیل میں تو لے جانا نہیں چاہتا مگر جب بات آ ہی گئی ہے تو اسے بالکل تشنہ چھوڑ دینا بھی مناسب نہیں ورنہ شکوک و شبہات کے نت نئے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اور اگر راہ کا یہ روڑا دور نہ کیا گیا تو ہم جس بات کو ذہن نشیں کرانا چاہتے ہیں بہت ممکن ہے کہ یہی گوشہ اسے قبول نہ کرنے کی راہ میں حائل ہو جائے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں آپ پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ دشمنان رسول نے جب کبھی محبوب کبریا کی عظمت و احترام اور عزت و وقار سے کھیلنے کی ناپاک کوشش کی ہے، تو خدا نے اس سلسلہ میں ان کی حوصلہ افزائی کی ہے یا سخت سے سخت الفاظ میں ان کی سرزنش کی گئی ہے۔ اگر قرآن کو اپنے نرخرے سے نہیں مانا ہے تو دلوں کا دروازہ کھول دیجئے۔ اور حکم الٰہی سننے کے لئے تیار ہو جائیے اور اس کا اندازہ کیجئے کہ جلال باری نے ایسے دریدہ دہنوں اور گستاخوں کی کس سخت لب و لہجے میں خبر لی ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۝

اور ہر ایسے کی بات نہ سننا جو بڑا قسمیں کھانے والا ذلیل بہت طعنے دینے والا بہت اِدھر کی اُدھر لگاتا پھرنے والا بھلائی سے بڑا روکنے والا حد سے بڑھنے والا گنہگار درشت خو اس سب پر طرہ یہ کہ اس کی اصل میں خطا۔ ولید نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ایک جھوٹا کلمہ کہا تھا "مجنون" اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اسکے دس واقعی عیوب ظاہر فرما دیئے۔

حضرات! یہ وہ قرآنی شواہد ہیں جنھوں نے دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کر دکھایا۔ محسوس ہوا جب کوئی بدزبان و گستاخ محبوب پر حملہ آور ہوتا ہے، تو یہ حملہ براہِ راست صرف محبوب ہی پر نہیں ہوتا بلکہ ایک چاہنے والے کی غیرتِ عشق کو چیلنج ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک غیور و عاشقِ صادق ایسے مواقع پر تماشائی بن کر، "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" کی تصویر بنا نہیں رہتا۔ آج ایک جوان بیٹے کے سامنے اگر کوئی اس کے بوڑھے باپ پر لکڑی اٹھائے، تو یہ بیٹا جس کی رگوں میں باپ کا خون دوڑ رہا ہے وہ تماشائی بن کر کھڑا نہ رہے گا بلکہ وہ لاٹھی جو باپ کے سر پر آنے والی ہے اسے اپنے کلیجے پر لے گا۔ اور لپکتے ہوئے اپنے باپ کو پیچھے کر کے خود سینہ سپر ہو جائے گا۔ آخرش یہ نوجوان کس درسگاہ کا تعلیم یافتہ ہے، کس یونیورسٹی کا ڈپلومہ حاصل کئے ہوئے ہے؟ اور کس اسکول و کالج والوں نے اسے ٹریننگ دی ہے کہ جب کوئی باپ پر حملہ آور ہو تو اس جنگ کو تم اپنے سر لے لینا۔

حضرات! یہ بالکل انگوٹھا چھاپ ہے، نہ اس نے اسکول میں داخلہ لیا اور نہ ہی کالج کی صورت دیکھی، نہ اس کے پاس کہیں کی سند ہے، نہ ڈپلومہ۔ یہ وہ ہے جس کے سامنے "کریا اچھر بھینس برابر" اس نے کہیں پڑھا لکھا نہیں بلکہ یہ اسی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے کہ باپ پر حملہ بیٹا اپنی ذات پر حملہ تصور کرے۔

بس ایسے ہی ایک مسلمان کی فطرت بھی آپ کو سمجھنی پڑے گی۔

"ایمان"، یہ کوئی معمولی سا لفظ نہیں ہے۔ یہ جس کلیجہ میں اترتا ہے اپنے جملہ لوازمات سرمستی، سرشاری، جاں بازی و جاں نثاری، وارفتگی و دیوانگی بے خودی و خود داری کے ساتھ اترتا ہے۔

غرض کہ ایمان ایک ایسا کیف آور روحانی چارہ ہے جسے قبول کرنے

ہی انسانیت کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ اب یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کا یہی وہ جذبۂ عشق تھا جو غزوۂ بدر و احد، غزوۂ تبوک و خندق وغیرہ میں کام آیا۔ نہ بیوی کا حسین مکھڑا دیکھا اور نہ بچوں کا گلاب جیسا شاداب چہرہ، نہ مال و دولت دیکھا نہ باغ و باغیچہ، بلکہ وہ عشق مصطفےٰ کے نشے میں ایسے چور رہتے کہ دنیا ومافیہا سے مستغنی و بے نیاز تھے۔ وہ مہمات میں اپنے محبوب کی رضا چاہتے۔ اگر جان کی بھی بازی آگئی تو اس سے سر مو کترائے نہیں، بلکہ آگ کے شعلوں میں کود پڑے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق ٭ عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

حضرات! اگر عشق رسول کی یہ سرمستی و سرشاری صحابہ کرام کو حاصل نہ ہوتی تو غزوات کے پے در پے معرکے سر نہ ہو پاتے۔ آپ ہرگز ہرگز اس بھول میں مبتلا نہ ہوں کہ ان جنگوں میں صحابہ کرام کے فنون سپہ گری کام آئے۔ یا ان کی قوتِ بازو کی کرشمہ سازیاں تھیں کہ ایک سے ایک جنگ جو اور دیو ہیکل کافروں کا سر قلم کر لیا۔ اور متعدد غزوات میں اس طرح ان کا صفایا کیا جیسے کوئی گاجر مولی کاٹے میں ہرگز ہرگز اسے ماننے کے لئے تیار نہیں

حضرات! تاریخ کی یہ سطر آپ کے بھی گوشۂ ذہن میں ہو گی کہ کسی جنگ میں صحابۂ کرام نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم آپ کے دشمن سے کس طرح نبرد آزما ہوں گے؟ ان کی تعداد زیادہ، ان کے پاس اونٹ اور گھوڑے زاید، ان کی تلوار تیز اور دھار دار ہیں ہمارے پاس چند ٹوٹی ہوئی تلواریں ہیں۔ آخرش یہ میدان کیسے سر کیا جائے گا۔؟

آقائے کائنات نے فرمایا یہ سامنے کھجوروں کے درخت تمہارے کس دن کام آئیں گے؟ ان کی شاخیں توڑ لاؤ اور انھیں سے تلوار کا کام لو یہ سنتے ہی صحابۂ کرام ٹوٹ پڑے۔ اب نہتے ہاتھوں میں کھجور کی شاخیں تھیں

مجھے اجازت دیجئے کہ میں دریافت کروں آپ سے کہ اب اس کے بعد تو صحابۂ کرام کو رسول خدا سے یہ عرض کرنا چاہئے تو تھا یا رسول اللہ! آہنی تلوار کے مقابل یہ کھجور کی شاخیں کیا کام آئیں گی؟ مگر صحابۂ کرام اسے بخوبی جانتے تھے کہ جو سوال ہم رسول اللہ سے کریں گے کیا اس حقیقت کو خود رسول خدا نہیں جانتے؟ آخر ش وہ رسول جو دانائے کل ہے وہ بھی تو جانتا ہے کہ تلواروں کے مقابل شاخوں کی کیا حقیقت؟ مگر اسے جانتے ہوئے رسولِ خدا نے فرمایا

ع کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اب یہ شاخ شاخ نہ رہ گئی، بلکہ اب یہ انسانوں ہی کا نہیں لوہے کی تلواروں کا بھی سر قلم کرے گی۔ لوہا ایک طرف، فرمانِ مصطفےٰ ایک طرف اسی موقع کے لئے حفیظ جالندھری نے کہا ہے ؎

نہ تیغ و تیر پر تکیہ نہ خنجر پر نہ بھالے پر
بھروسہ تھا تو اک سادہ سی کالی کملی والے پر

حضرات! میرا کہنا یہی تھا کہ صحابۂ کرام نے تلواروں، برچھے، بلم بھالے ہی کے سہارے لڑائی نہیں لڑی بلکہ وہ عشقِ رسول تھا جو انھیں اس میدانِ کارزار میں لاتا اور سرخروئی و سرفرازی اور کامیابی و کامرانی کی دولتِ لازوال سے نوازتا۔

مجھے کہہ لینے دیجئے حضرت حنظلہ صحابیٔ رسول ہیں۔ آج ان کی شادی کی پہلی رات ہے، نئی نویلی دولہن کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ بس اسی اثناء میں رسولِ خدا کا منادی الجہاد، الجہاد کی صدا لگاتا ہے۔ الجہاد یہ آواز حضرت حنظلہ کے کان کے پردے سے ٹکرائی۔ مادی عشق کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اچانک بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

بیوی نے شوہر کا دامن تھاما۔ مجھ سے وہ کون سی غلطی ہو گئی جو یکا یک اٹھ گئے۔ اگر کوئی خطا ہوئی ہو تو معاف کر دو۔

حضرت حنظلہ نے بھرائی آواز میں کہا، تم سے کوئی خطا نہیں ہوئی۔ میرے محبوب حقیقی نے مجھے بلایا ہے۔ ان کا منادی جہاد کا اعلان کر رہا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ میرے سرکار جہاد کی تیاری میں ہوں۔ اور میں دنیاوی و مادی لذتوں سے ہمکنار رہوں۔ اب وقت آگیا ہے کہ جہاں محبوب کا پسینہ گرے وہاں حنظلہ کا خون جگر بہے۔ میں انھیں کے عشق کے ساگر میں نہاتا اور تیرتا ہوں۔ ڈوبتا اور ابھرتا ہوں۔ وہی میری دنیا وہی میری آخرت، وہی میری آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کے لئے سکون، جگر کے قرار اور وہی یہاں اور وہاں کی جنت ہیں۔

میری رفیقۂ حیات! سہاگ والی آنکھوں اور بھیگی ہوئی پلکوں سے میرا سلام لو۔ ڈر رہا ہوں کہیں ان کی بارگاہ تک پہنچنے میں تاخیر نہ ہو جائے کشور عشق اور اقلیم محبت کا یہ بہت بڑا جرم اور گناہ ہے۔ میری رگوں میں جو خون بہے اس کی ایک ایک بوند ان کی وفاداری کا نشہ ہے۔ کہیں میری تاخیر سے ان کا آبگینۂ دل پاش پاش نہ ہو جائے۔ یہ عشق کی بہت بڑی محرومی و ناکامی ہے۔

رفیقۂ حیات! اب میرا دامن چھوڑ و! کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے جرم تاخیر کا کفارہ نہ ادا کر سکوں۔ اور اس کا خمیازہ دین و دنیا دونوں بھگتنا پڑے۔

اچھا! میرے تڑپتے دل، لرزتے ہونٹ اور اشکبار آنکھوں کا سلام لو۔ میں نے نکاح کے صرف چند کلمات ہی نہیں پڑھے تھے بلکہ زندگی کے ایک اس طویل سفر میں بہت دور تک چلنے کا پیمان وفا باندھا تھا۔ بس اسی طرح دامن اسلام سے وابستہ ہونے کے لئے میں نے چند کلمے ہی نہیں پڑھا تھا بلکہ اپنے مصطفیٰ سے بھی کچھ عہد و پیمان کیا تھا شاید کہ آج اس امتحان کا وقت آگیا ہے۔

رفیقۂ حیات ! اب میرا دامن چھوڑ دو۔ میں پہلے کسی کا غلام ہوں پھر کسی کا شوہر۔ اس نکاح سے پہلے ایمان لاتے ہی میں اپنے سرکار سے کچھ تو کچھ وعدہ کر چکا ہوں۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ عرب کے جوانوں میں میری عہد شکنی اور بے وفائی کا چرچا کیا جائے؟

میں جانتا ہوں کہ تم ایسا ہرگز نہ چاہو گی تمہیں معلوم ہے کہ ہم اہل عرب اپنا سب کچھ دے سکتے ہیں مگر وعدہ خلافی نہیں آسکتی جس پر ہماری تاریخ کا ماضی شاہد عدل ہے۔ ہم اپنا سب کچھ کھو سکتے ہیں ہمارا دہ فوجی سرمایہ و اثاثہ ہے جو ہمارے تفاخر کا نشانِ امتیاز ہے ہم اسے مٹنے نہیں دیں گے۔

چھوڑ و! کہیں میرے محبوب کا منادی دروازہ کی کنڈی نہ کھٹکھٹائے بتاؤ۔ پھر ہم کون سا منھ لے کر حاضر ہوں گے اور انھیں کونسی صورت دکھائیں گے۔ یہ کوئی اور نہیں بلا رہا ہے، محبوب خدا بلا رہا ہے جسکی مٹھی میں خدا نے خدائی دیدی ہے۔ وہ ہماری زندگی کا مالک ہے، قبر کا ساتھی، حشر کا ساتھی جہاں کوئی کام نہ آئے، وہ کام آئے۔ بھلا ایسا محبوب کسے ملتا ہے۔

رفیقۂ حیات ! اب مجھے جانے دو۔ رات ڈھل رہی ہے مجھے نہ پاکر کہیں میرے محبوب کا چہرہ نہ اتر جائے۔ میں اسے کس طرح برداشت کر سکوں گا۔

بیوی نے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرات سے الوداع کہا۔ حنظلہ نے ان کے آنسوؤں کو اپنے دامن اور اپنی آستینوں میں جذب کر لیا اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے کہ رفیقۂ حیات میں اس راہ کا مسافر ہوں کہ اگر بچ گیا تو غازی اور اگر مر گیا تو شہید۔ اگر بچ گیا تو پھر ملوں گا ورنہ قیامت میں ایک دوسرے کو مصطفٰے کے سہارے ڈھونڈ لیں گے۔

حضرات! آپ نے دیکھا کہ اگر وقت آگیا تو صحابۂ کرام نے اپنی جان تک قربان کر دیا۔ پیچھے مڑ کر نہ مال دیکھا نہ اولاد، نہ گھر دیکھا نہ دروازہ۔

یہی وہ عشق رسول تھا جس کی کارفرمائی کے نتیجے میں اسلام اتنی تیزی سے جزیرۂ عرب میں پھیلا کہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابۂ کرام کی تعداد تھی میں واقعہ کو تشنہ نہیں چھوڑنا چاہتا اسلئے اس کی آخری کڑی کو بھی ملاحظہ فرمالیں۔

بہرحال حضرت حنظلہ نے سرکار کی بارگاہ میں حاضری دی، قدمبوس ہوئے اور اسلامی لشکر کے ساتھ اپنی جواں سال امنگوں کو لئے رواں دواں ہوئے۔ یہ اسلامی لشکر ایسا ہی بڑھتا تھا جیسے سمندر کی موجیں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی ہوں۔

چنانچہ جنگ ختم ہونے کے بعد آقائے دوجہاں نے حسب معمول شہیدوں کی نعش کا پتہ لگوایا تاکہ تجہیز و تکفین کے بعد ان کے آخری مراسم ادا کئے جائیں۔

اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی کہ حنظلہ نہ تو شہیدوں میں ہیں اور نہ غازیوں میں۔ سرکار نے پھر صحابۂ کرام کو حکم دیا کہ دوبارہ ڈھونڈو۔ پھر میدانِ جنگ کا گوشہ گوشہ، چپّہ چپّہ ڈھونڈا گیا مگر حضرت حنظلہ نہ مل سکے تب آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلّم نے آسمان کی جانب سر اٹھایا اور اچانک مسکرا دیئے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ اب جاؤ پھر تلاش کرو۔ چنانچہ اب حضرت حنظلہ کی نعش مل گئی۔ صحابۂ کرام نے لاکر حضور کے قدموں میں رکھ دیا مگر سارے صحابہ کرام یہ دیکھ کر حیران تھے کہ حضرت حنظلہ کی نعش پانی سے شرابور تھی۔ جیسے کسی تالاب سے حضرت حنظلہ کو نکالا گیا ہو۔ بالآخر صحابۂ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ ماجرا کیا ہے اور ہم کیا دیکھ رہے ہیں

آقائے دوجہاں نے اس نوجوان کی خوش بختی پر تبسم فرمایا اور کہا کہ اے صحابہ جب یہ جہاد کو آئے تو ان کی وہ رات شادی کی پہلی شب تھی۔ منادی کی آواز سن کر فوراً چلے ان پر غسل واجب تھا اور اسی حال میں

جہاد میں شریک ہو گئے۔ لہٰذا یہ ان پر انعامِ الٰہی ہے کہ فرشتے انھیں آسمان پر لے گئے اور وہاں ملائکہ کے جھرمٹ اور فرشتوں کی گود میں نہائے ہیں یہ پانی یہاں کا نہیں وہاں کا ہے۔ اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حنظلہ کو غسیل الملائکہ فرمایا۔ چنانچہ سرکار کا عطا کردہ خطاب اتنا مقبول ہوا کہ اب تاریخ اسلام انھیں حنظلہ کم اور غسیل الملائکہ زیادہ جانتی ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

حضرات! یہی وہ عشقِ رسول تھا اور جذبۂ وارفتگی جسے دیکھ کر کفارِ عرب نے اپنی بے نیام تلواروں کو نیام میں ڈال لیا۔ اور وہ جنگ جو قوم جو جنگ کے ارادے سے نکل پڑی تھی اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

آئیے اور تاریخ کا ورق لٹیے اور اس واقعہ کو سماعت فرمائیے کہ ایک بار کسی جنگ ہی کے موقع پر کافروں نے اپنا ایک وفد اسلامی لشکر میں اسلئے بھیجا تاکہ تعداد وغیرہ کا صحیح اندازہ ہو سکے نیز یہ معلوم ہو سکے کہ ہمارے مقابل اسلامی لشکر کا نظام کیسا ہے۔ اور ان کی تیاری کیسی ہے اس دور میں طرفین کی طرف سے ایک دوسرے کو اس طرح کی اجازت حاصل تھی کہ ایسا وفد بھیجا جا سکے اور اسی کو "مقدمۃ الجیش" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کافروں کا ایک وفد اسلامی لشکر میں اسی غرض سے آیا اور ٹھیک اس وقت پہونچا جب کہ سید عالم روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرما رہے تھے اور جاں نثار صحابہ کرام ارد گرد ہالہ بنائے کھڑے تھے اور وارفتگی شوق کا یہ عالم تھا کہ جب آقائے دوجہاں ہاتھوں کا وضو فرماتے، اور انگلیوں سے وضو کا جو پانی ٹپکنا چاہتا تو صحابہ کرام اس کی کوئی بوند اس کا کوئی قطرہ زمین پر نہ گرنے دیتے بلکہ لپک لپک کر اسے اپنی ہتھیلیوں پر لے لیتے اور اس کی کیفیت یہ تھی کہ اس پانی کو لینے میں جذبۂ مسابقت اتنا غالب تھا کہ سبقت لے جانے میں کہیں ایک دوسرے سے لڑ نہ جائیں

حدیث مبارکہ کا مفہوم یہی ہے۔ اور اس پانی کو "اپنی آنکھوں "اپنے چہروں اور سینوں پر ملتے اور جو صحابہ کرام براہ راست اس پانی کو نہیں پاتے تو اپنی ہتھیلی ان صحابہ کی ہتھیلی سے مل لیتے جن کی ہتھیلی پر وہ پانی لگا ہوتا۔ یا اس کی تری ہوتی پھر وہ اسے اپنی آنکھوں اور چہروں پر مل لیتے۔

کافروں کا آیا ہوا وفد جنون عشق اور وارفتگی شوق کا یہ پرکیف منظر حیرت بھری نگاہوں سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور اس کے بعد بہت خاموشی سے واپس چلا گیا۔ ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد نہ تو اس نے بالاستیعاب مجاہدین کی تعداد شمار کی اور نہ ہی زرہ و بکتر دیکھا اور نہ تیر و تلوار، نہ اونٹ و گھوڑے۔

انتظار کرنے والوں نے بڑی عجلت میں پوچھا بتاؤ تم نے اسلامی لشکر کو کیسا پایا؟

وفد نے جواب دیا، ان کی تعداد ہم سے بہت کم ہے شکستہ اور ٹوٹی تلواریں ہیں، اونٹ اور گھوڑے بہت کم ہیں۔ ان سب کے باوجود ہم تمہیں آگاہ کئے دیتے ہیں کہ ہم ان سے جیت نہیں سکتے۔ ان کے مقابل ہماری شکست مقدر ہو چکی ہے۔

لوگوں نے حیرانی سے پوچھا، ایسی کیا بات ہے وہ ہر چیز میں ہم سے کم ہیں اور پھر بھی ہم نہیں جیت سکتے۔؟

وفد نے کہا ہاں۔ کچھ ایسا ہی ہے۔ آخر ش تم نے کیسے فیصلہ کر لیا

وفد نے جواب دیا۔ ہم ٹھیک اس وقت پہنچے جب کہ مسلمانوں کا پیغمبر نماز کے لئے وضو کر رہا تھا۔ اور ان کو ماننے والی قوم ان کے ارد گرد حاشیے پر اس طرح کھڑی تھی جیسے شمع پر پروانے ٹوٹ رہے ہوں۔ ان کا نبی اپنی خاموش اداؤں سے وضو کر رہا تھا اور ان کے ملنے والے سرفروش شیدائی اپنے "نبی" کے وضو کا پانی لپک لپک کر اس طرح ہاتھوں میں لے

رہے تھے کہ پانی کا کوئی قطرہ زمین پر گرنے نہ پاتا ۔ ہم محوِ حیرت بنے اس قوم کا یہ والہانہ کردار دیکھ رہے تھے اور گویا اچانک نہاں خانۂ دل سے یہ آواز آئی کہ جو قوم اپنے "نبی" کے وضو کا پانی زمین پر گرنے نہیں دیتی بھلا وہ اپنے پیغمبر کا خون زمین پر گرنا کیسے برداشت کر سکتی ہے ؟ جو پانی اس کے بدن سے چھو جائے جب اس کا احترام اتنا ہے تو خون جو اسکی رگوں میں دوڑ رہا ہے اس کے احترام کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے ۔ ؟

اے لوگو ! یاد رہے ہوشیاروں سے لڑنا بہت آسان ہے مگر دیوانوں سے لڑنا ناکوں چنے چبانا ہے ۔ ہوشیاروں کی صفوں میں تہ و بالا مچا دینا ، ان کی قطاروں کو تتر بتر کر دینا کبھی کوئی عجوبہ نہیں ، لیکن دیوانوں سے نپٹ لینا ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہے لیکن دوستو ! محمد ہوشیاروں کو لے کر نہیں آئے ۔ گویا دیوانوں کا ٹڈی دل لشکر ساتھ لائے ہیں

میں آج ان ریاکار نمازیوں سے پوچھنا چاہتا ہوں جو گلی گلی کوچہ کوچہ گاؤں گاؤں ، قریہ قریہ ، نگر نگر ، ڈگر ڈگر نماز اور کلمے کی نمائش کرتے پھر رہے ہیں ۔ کہیں ایک لاکھ ، کہیں ڈیڑھ لاکھ نام نہاد اجتماع تسبیح ہاتھ میں ، مسواک جیب میں ، ایک انگل باہر تاکہ دور سے بھی دیکھنے والا یہ سمجھ جائے کہ جب مسواک جیسی سنت کو یہ نہیں چھوڑتا تو دوسری سنتوں کو نظر انداز کیسے کر سکتا ہے ۔ ؟

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تم اتنی بڑی تعداد میں اکٹھا ہوتے ہو ، اہل قبلہ و کلمہ گو مسلمانوں پر کفر و شرک کا فتویٰ لگا کر کافر و مشرک بناتے ہو گویا تم کفر کی مشین گنوں اور رائفلوں سے لیس ہو کر وہاں آتے ہو ۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے جی کھول کر مسلمانوں کو تو کافر بنایا مگر کسی عالمی یا صوبائی اجتماع میں غیر مسلموں کو بھی مسلمان بنایا ؟ کلمہ پڑھایا ؟ مزارات کے گنبد ڈھانے اور قبروں کو مسمار کرنے کا تو تم نے بہت سے منصوبے بنائے لیکن

گرجا و کلیسا کے خلاف بھی تم دو جملے بولے ؟ یا تمہارا اتنا بڑا اجتماع دیکھنے کے بعد تمہارے زہد و تقویٰ و پارسائی سے متاثر ہو کر کوئی داخلِ اسلام ہوا ؟ یہ تو نہ ہوا، البتہ جہاں جہاں تمہارا اجتماع ہوا وہاں فرقہ وارانہ فساد ضرور پھوٹ پڑے۔ بے گناہ کا قتل عام ہوا، نالیوں میں پانی کے بجائے خون بہا جس پر مالیگاؤں، بھیونڈی، گودھرا اور جبل پور ایسے نہ جانے کتنے تمہارے منحوس قدموں کے روندے ہوئے شہر آج بھی اپنی داستانِ غم سنا رہے ہیں انھیں دولتِ ایمان وعمل تو نہ دے سکے مگر اپنے پیچھے خون و خرابہ کی چنگاریاں ضرور چھوڑ آئے۔ وہی کچھ دنوں سلگتی رہتی ہے اور بعد میں کوہ آتش فشاں بن جاتی ہے۔

پھر یہ تو بتاؤ ! تمہاری یہ کون سی انسانیت و شرافت ہے کہ جہاں تم کبھی ایک لاکھ کی تعداد میں گئے وہاں کے لوگوں نے تمہارا آؤ بھگت کیا۔ پھر جب تمہارے آنے کے بعد وہیں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا بے گناہ قتل کئے گئے، تم بھولے سے ان کی ہمدردی میں اخبارات ورسائل کو دو سطر کا بیان تک نہیں دئیے۔ کہیں پر بھی تمہارا ریلیف فنڈ نہیں لگتا۔ اسی مقام پر اجتماع کے لئے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیتے ہو کئی ہزار پیشاب خانے اور بیت الخلاء بنوائے جاتے ہیں جن کی عمر صرف چند گھنٹوں کی ہوتی ہے مگر وہیں اس کے ساتھ تم یہ بھی کہتے ہو کہ وہاں کے غیر مسلموں نے تمہارا ساتھ دیا منسٹروں اور لیڈروں نے تمہارا ہاتھ بٹایا مگر تمہارے آنے کے بعد جب وہیں فساد برپا ہوتا ہے تو تم ایک اخباری بیان تک نہیں دیتے۔ اجتماع پر تو لاکھوں روپئے بے دریغ خرچ کر دیتے ہو مگر وہاں کے مظلومین و مجروحین اور تباہ حال مصیبت زدہ، خانماں برباد اور فاقہ کش انسانیت کے لئے کانی کوڑی تک نہیں خرچ کرتے۔ نہ تمہارا ریلیف کیمپ لگتا ہے اور نہ ہی کوئی تمہارا دلی کا وفد اور نمائندہ

وہاں پہنچتا ہے۔ کیا دنیا میں صرف یہی ایک کام رہ گیا ہے کہ کروڑوں روپئے اجتماع میں خرچ کرو پھر اس کے بعد میٹھی نیند سو جاؤ۔ اور پیچھے پلٹ کر ہرگز نہ دیکھو کہ کل جہاں تمہارا اجتماع تھا وہاں دھواں کیسا اٹھ رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے ہے

تمہیں کالی گھٹا کا بھی نہیں پہچاننا آیا!
نشیمن سے دھواں اٹھتا ہے تم کہتے ہو ساون ہے

حضرات! مجھے اپنی اس مختصر سی گفتگو میں یہ بتانا تھا کہ عشق رسول ہی تمہارا ایک سرمایہ اور محبت رسول ایک پونجی ہے جس نے ہر دشوار گذار اور کٹھن سے کٹھن راہ کو طے کرنے میں توانائی بخشی ہے اور یقیناً ہر دشوار وادی میں عمل تسخیر ثابت ہوئی ہے۔

ناقابل عبور پہاڑوں کے کلیجے کو گھوڑوں کی ٹاپ سے روندنا اور بپھرے ہوئے دریائی موجوں میں گھوڑوں کو اتارنا اور چھلانگ لگانا یہ انسانی توانائی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ عشق اور محبت رسول ہی کا حوصلہ ہے۔ اس لئے اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ میرے سرکار نے صحابۂ کرام کو پہلے میدانِ جنگ میں نہیں اتارا بلکہ ان کے سینے میں اولاً اپنی محبت اور اپنے عشق کا چراغ روشن کیا۔ بس عشق ہی ان کا ایک ایسا ہتھیار تھا جو ہر میدان میں کام آیا۔ خواہ وہ غزوۂ بدر رہا ہو، احد، حنین ہو یا تبوک یا غزوۂ خندق۔

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اس فلسفہ کو بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ لشکر کفار کے مقابل اگر ہم نے عسکری دستے کو تلوار و تیر کے مقابل صرف تیر دیدیا تو برابر کی بھی جنگ نہ ہو سکے گی۔ کیوں کہ وہ ہم سے تعداد میں بھی زیادہ ہیں۔ بظاہر مال و دولت میں بھی۔ لہٰذا ان مادی طاقتوں سے ہٹ کر انھیں کوئی ایسی بھی طاقت اور ایسا ہتھیار ملنا چاہیے

جن کا وزن ان مادی طاقتوں سے کئی گنا زیادہ ہوا ور وہ عشق ہی کا انوٹ ہتھیار ہے جو سب پر بھاری بھرکم ہے ۔ آقائے دوجہاں صلے اللہ علیہ وسلم کی یہی وہ حکمت عملی تھی جو صحابہ کرام کے حق میں توپ و تفنگ کا کام کر گئی، نہ آدمیوں کا ریلا دیکھا نہ ہتھیاروں کا انبار، جذبۂ عشق سلامت رہا تو ہر آگ میں چھلانگ مار کر کود پڑے ۔

حضرات! ان تاریخی شواہد کے بعد بھی کیا کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ صرف سجدے کئے جائیں تسبیح کے دانے ہلائے جائیں اور عشق رسول کا چراغ بجھا دیا جائے ۔ پیارے اگر عشق ہی سلامت نہ رہا تو یہ کھو کھلے سجدے ہی کیا کام آئیں گے ۔

ہم تو تاریخی شواہد میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میرے سرکار نے نہ تو پہلے کلمہ پڑھوایا اور نہ سجدہ کروایا بلکہ سب سے پہلے اپنے کو منوایا ۔ چنانچہ تاریخ اسلام کا دور آغاز دیکھو! جب اعلان نبوت کے بعد سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے کلمہ کی دعوت کے لئے قبیلۂ قریش کو دعوت دی اور کوہِ فاران کی چوٹی پر بلایا ۔ اور یہ سب کے سب اکٹھا ہو گئے تو آقائے کائنات نے پہلے ان سے یہ نہیں کہا کہ تم پہلے پڑھو لا الہ الا اللہ ۔ ہر چند کہ پڑھنا یہی ہے لیکن سب سے پہلے سوال یہ کیا ، کہ اے لوگو! تم میرے بارے میں کیا کہتے ہو ؟ سب نے بیک زبان ہو کر کہا اے محمد آپ سے زیادہ ہم نے کسی کو صادق و سچا نہیں پایا ۔ امین و دیانت دار نہیں پایا ۔ پاک وصاف نہیں پایا ۔ وغیرہ ۔

مگر اتنے ہی پر اللہ کے رسول نے خاموشی نہیں اختیار کی پھر دوسرا سوال کیا محض اسلئے کہ یہ تو ماضی کی گواہی ہے ۔ ممکن ہے مستقبل کے بارے میں ان کے دل میں کوئی گندگی ہو ۔

سرکار نے فرمایا: اچھا یہ بتاؤ! اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کے اس جانب

سے فوج آرہی ہے جو تم لوگوں کو ہلاک کر دے گی تو کیا تم اسے مانو گے؟

پھر لوگوں نے کہا اے محمد! اگر چہ ہم لوگ اس فوج کو نہیں دیکھ رہے ہیں لیکن آپ کو اتنا سچا مان چکے ہیں کہ اپنے ماتھے کی آنکھ کو جھٹلا دیں گے لیکن آپ کے منھ کی زبان کو جھٹلا نہیں سکتے۔

جب ماضی اور مستقبل دونوں کی گواہی لے لی، تب آقائے کائنات نے فرمایا کہ اے لوگو! جب میں تمہیں دھوکہ نہیں دے سکتا تو ساری کائنات کے پالنہار کو کیسے دھوکہ دے سکتا ہوں۔ لہٰذا میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ انسانیت کی بہت بڑی تذلیل و تحقیر ہے کہ خود تم اپنے ہاتھوں سے پتھر کے ٹکڑوں میں ناک و نقشہ بناؤ، نقشہ و نگار نکالو، اسے بناؤ، سنوارو، سجدہ کرنے لگو، یہ انسانیت کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟ لہٰذا اس پروردگار کو سجدہ کرو کہ جس نے تم میں اس کے بنانے اور سجانے کی صلاحیت بخشی ہے۔

بس اتنا سننا تھا کہ تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں اور سب نے کہا کہ اے محمد! تم ہمارے آبا و اجداد کے دین سے ہٹانا چاہتے ہو۔؟

اب آپ ذہن پر زور دیجئے کہ نبی نے لوگوں کو کلمہ کی دعوت دینے کے لئے بلایا تھا مگر پہلے کلمہ کی دعوت نہیں دی گئی بلکہ پہلے اپنے کو منوانے کی کوشش کی گئی۔ تبلیغ کا نقطۂ آغاز بتاتا ہے کہ پہلے کلمہ، روزہ اور نماز نہیں ہے بلکہ سرکار کو ماننا ہے۔

دوسرا نکتہ: حضرات! یہیں ایک بات اور سمجھ میں آئی کہ رسول اللہ نے کافروں کو اسلئے بلایا تاکہ انھیں کلمہ کی دعوت دی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کلمے کی دعوت مسلمانوں کو نہیں کافروں کو دی جاتی ہے۔ اب اگر آج کوئی آپ میں آئے اور یہ کہے کہ ہم لوگ آپ کو کلمہ کی دعوت دینے آئے ہیں تو گویا بالفاظ دیگر یہ لوگ آپ حضرات کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے اور اگر مسلمان سمجھتے تو دعوت

کیوں دیتے۔ لہٰذا جو مسلمانوں کو کافر سمجھے اور کہے وہ خود کافر ہے۔ کلمہ پڑھانے کا مستحق نہیں بلکہ اسے خود کلمہ پڑھایا جائے۔ علاوہ ازیں اس اصول کو یاد رکھئے کہ سرکار کی "دو امتیں" ہیں۔ ایک امت دعوت۔ دوسری امت اجابت۔ جس نے کلمہ پڑھنے سے انکار کر دیا اور دعوت نہیں قبول کیا اسے امت دعوت کہتے ہیں۔ اور جس نے دعوت قبول کر لی اور کلمہ پڑھ لیا تو اسے امت اجابت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا کلمہ کی دعوت کا دروازہ امت دعوت پر کھلا ہوا ہے یعنی یہ دعوت کافروں کو دی جائے گی۔ اور جس نے قبول کر لیا اور پڑھ لیا وہ مسلمان ہو گیا تو اب ان کو کلمہ کی دعوت نہیں دی جائے گی

اصل گفتگو :-

میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آج میری تقریر کا عنوان ہے "سرکار دوعالم کی بشریت" لیکن میں تمہید کی ایک ایسی طویل راہ میں آگیا کہ اصل موضوع سے ابھی تک وابستہ نہ ہو سکا۔ اب اصل گفتگو سماعت فرمانے سے پہلے اس عنوان سے متعلق چند واقعات اور اس کے ضروری اشارات نوٹ فرمالیں، تاکہ گفتگو کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے۔

(۱) مقام سوال واستفسار میں ہم رسول اللہ پر اطلاق بشری کرتے ہیں:

(۲) اطلاق بشری اور ہے اور اسے روزمرہ کی تحریر وتقریر میں مروج اور مستعمل کرنا اور ہے۔

(۳) اطلاقِ بشر اور ہے، اپنا جیسا بشر کہنا اور ہے۔

(۴) ہم میں آنا اور ہے ہم جیسا ہونا اور ہے۔

(۵) کبھی حق بے محل بولا جائے تو وہی کفر ہو جاتا ہے۔

(۶) نہ تو ہم انھیں خدا، معاذ اللہ کہتے ہیں اور نہ ہی اپنا جیسا ٹھیٹھ بشر کہتے ہیں۔

(۷) بشر اور ہے، مثلِ بشر اور ہے۔

اصل موضوع کے یہ چند دفعات ہیں۔ اگر آپ نے اسے محفوظ رکھا تو انشاء اللہ تعالےٰ عنوان کے سمجھنے میں دقت و دشواری نہ ہو گی۔

حضرات! سب سے پہلے آپ اس عنوان کی پہلی دفعہ ملاحظہ فرمائیں یعنی مقام سوال واستفسار میں ہم اطلاق بشر کرتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی اجنبی یا نہ جاننے والا آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ سوال کرے کہ کیا جناب محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم خدا تھے یا خدا کے بیٹا تھے۔؟ تو اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ نہ تو وہ خدا تھے اور نہ خدا کے

بیٹے۔ اسی لئے تو ہم اہلسنت میلاد شریف کی کثرت کرتے ہیں کہ جب بار ہا انھیں ابن عبد اللہ کہا جائے گا تو انھیں نہ تو اللہ کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اللہ کا بیٹا یعنی عبد اللہ کا بیٹا، بھلا اللہ اور اللہ کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔

اس فلسفہ کو میلاد شریف کی بحث میں ملاحظہ فرمائیں:۔

بہر حال مقصد گفتگو یہ ہے کہ پھر سائل نے سوال کیا اگر وہ اللہ اور اللہ کا بیٹا نہیں تو کیا فرشتوں میں سے تھے؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ ہر گز نہیں۔ وہ فرشتوں میں سے نہیں تھے۔ اگر وہ فرشتوں میں سے ہوتے، تو ان کی زندگی انسانی رشد و ہدایات کا معیار کیسے بن سکتی تھی؟ انھوں نے شادی کی تاکہ ان ازدواجی اور عیالی زندگی ہمارے کام آسکے اور فرشتے شادی بیاہ اور آل و اولاد سے مبرّا و منزہ ہیں۔

اچھا تو پھر کیا وہ جن میں سے تھے؟ اس کا بھی جواب وہی ہے کہ وہ جن میں سے نہیں تھے۔ اگر وہ جن میں سے ہوتے تو ان کاروانِ انسانیت کی قیادت کیسے کر سکتے تھے۔ آخر بش تو تھے کیا؟

اب اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ نوعِ بشر سے تھے۔ مقام استفسار میں اطلاقِ بشر کا معنی یہی ہے۔ لیکن اس اطلاق کو عام بول چال میں رواج نہیں دیا جائے گا۔ یہ ہمارے اصول کی دوسری قسم ہے۔ مثلاً شیرِ خدا علی مرتضیٰ سے کوئی دریافت کرتا کہ رشتہ میں رسول اللہ آپ کے کون ہوتے ہیں تو علی مرتضیٰ کو یہی جواب دینا پڑتا کہ ہم دونوں چچا زاد بھائی ہیں۔ عبد اللہ کے بیٹے سرکار ہیں اور ابو طالب کا بیٹا میں ہوں یہ مقام سوال و استفسار کا جواب ہے لیکن علی مرتضیٰ نے اسے رواج نہیں دیا یعنی ہر چند کہ ایک دوسرے کے چچا زاد بھائی تھے مگر علی مرتضیٰ کا یہ غایت درجہ ادب و احترام ہے کہ پوری زندگی میں کبھی بھائی کہہ کے پکارا نہیں۔ انھوں نے جب بھی عرض کیا تو کہا یا رسول اللہ ، یا نبی اللہ ، یا حبیب اللہ وغیرہ۔

سیدنا علیؓ مرتضیٰ کے اس پاکیزہ کردار نے امت مسلمہ کو نہ صرف ادب آشنا ہی کیا بلکہ عملاً اس کی زندہ جاوید مثال پیش کر دی۔ اور یہ بتا دیا کہ جب میں بھائی ہو کر انہیں بھائی نہیں کہہ سکتا تو پندرہ صدی کا نام نہاد ملا انہیں کیونکر بڑا بھائی کہہ سکتا ہے اور اس کے چیلے چاپڑ بھائی کا رشتہ کیسے جوڑ سکتے ہیں؟ اور اپنے قابل تقلید عمل سے یہ بھی واضح کر دیا، کہ جب کبھی ایمان اور خون کے رشتے کا تقابل ہوتا ہے تو خون کا رشتہ مغلوب اور ایمان کا رشتہ غالب آجاتا ہے۔ خون کا رشتہ دب جاتا ہے اور ایمان کا رشتہ ابھر آتا ہے۔

مقصدِ گفتگو یہی ہے کہ مقام استفسار میں "اطلاق بشر اور ہے اور اس کو رواج دینا اور ہے۔ اطلاق اور رواج میں بُعد المشرقین ہے۔ گویا اطلاق ایک وقتی ضرورت کی تکمیل کا نام ہے۔ اور ایسے موقع و محل پر اسے رواج دینا تنقیص و توہین ہونے کا باعث ہے۔ اسی لئے متعینہ اصول کی پانچویں دفعہ یہ ہے کہ اگر حق کو بے محل بولا جائے تو اسے حق نہیں کہا جا سکتا بلکہ بسا اوقات کفر ہو جاتا ہے۔ آج ہمارے حریف کا ہم سے یہی تو مطالبہ ہے کہ جب رسول اللہ نوعِ بشر تھے تو "مشتاق نظامی" ہمیں روکنے والا کون ہوتا ہے؟ ہم بشر کو بشر کہیں گے۔

حضرات مجھے کہہ لینے دیجئے، اگر حق بولنے کا اس طرح ہیضہ ہو گیا ہے تو القاب کا خون ناحق نہ کیجئے اور میرے ایک سوال کا جواب دیجئے۔ پورا مجمع مجھے بتائے کہ ساری کائنات کا خالق کون ہے۔؟ ہمیں امید ہے کہ سب کا جواب یہی ہوگا کہ "اللہ" گویا چاند تارے، بلندی و پستی، آسمان و زمین، عرش و کرسی، لوح و قلم، جنت و دوزخ، جن و فرشتے، طیور و وحوش چرندے پرندے، غرضیکہ سب کا خالق وہی ہے۔ یہ ایک ایسا حق ہے اور ایسی حقیقت ہے کہ جس کو کسی شبہہ کی گنجائش نہیں۔ مگر ایک شخص مقام

حمد" میں یہ کہتا ہے، ارے وہی اللہ جو خالق خنزیر ہے، سور کا خالق ہے بظاہر وہ حق بول رہا ہے مگر یہ کلمہ کفر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت کے اظہار و بیان کے لئے تجھے سور کا چہرہ تو نظر آیا مگر بدر کامل کیوں نہ دیکھا؟ ہلال کو کیوں نہ دیکھا، آخر شِ قوس و قزح کی رعنائیاں، آسمان و پہاڑ کی بلندیاں، زمین اور زمین دوز پستیاں، عنادل کی نغمہ سرائیاں، سپیدۂ سحر کی جلوہ پاشیاں، کلیوں کی چٹک، جگنو کی چمک، ستاروں کی دمک، پھولوں کی مہک، شاخوں کی لچک، پانی کی خنک، بادل کی گرج اور بجلی کی تڑپ، اس قدر پھیلے ہوئے مظاہر قدرت و مناظر فطرت میں تجھے اللہ تعالےٰ کی خالقیت کا جلوہ نظر نہ آیا؟ اگر دیکھا، تو صرف سور کا چہرہ دیکھا معلوم ہوا جیسا تھا ویسا ہی دیکھا۔

بس اے محترم حضرات! مجھے کہہ لینے دیجئے کہ ہر چند کہ خدا خالق خنزیر ہے لیکن "مقامِ حمد" میں کسی کا یہ کہنا کیا وہی خدا ہے جو خالق خنزیر ہے ہمجملے کا تیور بول رہا ہے کہ یہاں اس مالک حقیقی خدا وحدہٗ لاشریک کی تعریف اور حمد و ثنا مقصود نہیں ہے بلکہ تنقیص الوہیت اس کا مدعا اور مطمح نگاہ ہے۔ لہٰذا فقہا فرماتے ہیں یہ کلمہ کفر ہے۔

ایسے ہی اب یہاں بھی کہہ لینے دیجئے کہ میرے سرکار کے نہ جانے کتنے القاب و خطابات ہیں جن کی کوئی نظیر اور مثال نہیں۔ وہ یٰس، طٰہٰ مزمل، مدثر، شفیع محشر، ساقی کوثر، حبیب کبریا، خاتم النبیین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین ایسے بے شمار خطابات کے ہوتے ہوئے اپنی عام بول چال، تقریر و تحریر میں بشر البشر کہے تو وہ حق نہیں بول رہا ہے بلکہ تنقیص نبوت کر رہا ہے۔

وجہ کیا ہے؟ جب اپنے مولانا کی باری آئے تو اشرف علی اشرف علی نہیں حسین احمد حسین احمد نہیں کہتا، قاسم نانوتوی اور رشید احمد

گنگوہی نہیں کہتا بلکہ حکیم الامت الشیخ الاسلام، حجۃ الاسلام، قطب العالم بولتا ہے۔

کیا وہ اشرف علی نہیں ہے؟ حسین احمد نہیں ہے؟ قاسم نانوتوی نہیں ہے؟ رشید احمد گنگوہی نہیں ہے مگر ان سب کے باوجود نام نہیں لیا جارہا ہے القاب وخطابات بولے جارہے ہیں۔ یہاں بھی نام ہی لیجئے اور کہئے کہ ہم حق بول رہے ہیں۔ آخر ش وہ کونسا داعیہ ہے جس نے ان کے حضور عقل کو سلامتی بخشی اور آقائے کائنات کی بارگاہ میں اسی عقل کو سلام پر چڑھایا۔ ؎

اتنا نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

حضرات! حاصل گفتگو یہی ہے کہ اگر کسی حق بات کو بے محل بولا جائے تو اسے حق گو نہیں کہا جاتا بلکہ کفر بولنے والا کہا جاتا ہے بس ایسے ہی بے شمار القاب وخطابات کے ہوتے ہوئے خطابات نہ بولے جائیں محض بشر بشر کہا جائے۔ اس سے نیت کا پتہ چل گیا کہ سرکار کے علوئے مرتبت کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ توہین نبوت اور تنقیص رسالت کا ارادہ ہے اور اسے اچھی طرح وہ جانتے ہیں کہ سرکار کی توہین کرنے والا مسلمان نہیں بلکہ کافر ہوجاتا ہے۔

حضرات! ان کی سب سے بڑی اور بہت ہی اہم دلیل ہے کہ وہ ہمارے چہرہ مہرہ میں ہیں لہٰذا ہم ان کو اپنے جیسا نہ کہیں تو کیا کہیں۔

آئیے ہم ان کے اس مفروضہ کا بخیہ ادھیڑ دیں تاکہ حقیقت شناس اور خردمندوں کی نگاہ میں ایسے برہنہ و ننگے ہوجائیں کہ ان کے من گڑھت مفروضات کی قلعی کھل جائے۔ اب آپ پر واضح ہو کہ

میں اس حقیقت کو بے نقاب کرنے جا رہا ہوں کہ جب وہ ہمارے چہرے مہرے میں ہیں تو انھیں اپنا جیسا نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔

اچھا آپ لوگ یہ بتائیے کہ آپ کی آبادی میں کوئی ڈاکٹر ہے یا نہیں؟ ہاں ہے۔ وکیل ہے کہ نہیں؟ ہاں ہے۔ پھر ایسا کیجئے۔ خدانخواستہ آپ لوگوں میں سے کوئی بیمار نہ ہو لیکن اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو ڈاکٹر کے یہاں جا کر اسے ڈاکٹر نہ کہئے۔ وہ بھی تو کان والا اور آنکھ والا ہے۔ دو ہاتھ اور دو پاؤں والا ہی ہے۔ آپ ہی جیسے چہرے مہرے والا ہی ہے۔ اب آپ اسے بجائے ڈاکٹر کہنے کے یہ کہئے کہ اے میرے ہی جیسا آدمی مجھے دیکھ لے۔ تو ڈاکٹر آپ کا علاج نہ کرے گا بلکہ بڑی سنجیدگی سے وہ یہ کہے گا کہ ڈسپنسری خالی کر دیجئے۔ سیدھے قبرستان چلے جائیے۔ اب آپ کے علاج کا وقت باقی نہیں رہ گیا۔

ایسے ہی اگر آپ کا کوئی مقدمہ ہو آپ مؤکل اور آپ کا کوئی وکیل ہو تو اسے وکیل نہ کہئے بلکہ یہ کہئے اے میرے ہی جیسا آدمی میرا مقدمہ دیکھ لے۔ تو وکیل آپ کو جواب دے گا اگر دماغ کی چول کھسک گئی ہے تو رانچی یا آگرہ کے پاگل خانے چلے جاؤ۔

میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ڈاکٹر سے کونسی ایسی غلط بات کہی یا کون سی گالی دی جو وہ آپ کو قبرستان بھیج رہا ہے اور وکیل کو آپ نے کیا برا کہا جو آپ کو پاگل خانہ بھیج رہا ہے۔ یقیناً آپ جیسے زیرک و دانا حضرات نے اسے بخوبی سمجھ لیا ہوگا کہ ایک ڈاکٹر سے علاج اس بنیاد پر نہیں کرایا جاتا کہ وہ بھی دو ٹانگ والا، دو آنکھ والا، دو کان والا، یا ہمارے ہی جیسا چہرے مہرے والا ہے۔ اگر چہرے مہرے ہی کی بنیاد پر علاج کرانا ہے تو راستے میں نہ جانے کتنے چلتے پھرتے راہی نظر آئے ہوں گے۔ آپ انھیں سے کہہ دیتے میرا مرض دیکھ لو۔ مجھے انجکشن لگا دو

کوئی مکسچر پلا دو، میں بیمار ہوں۔ مگر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ اسی طرح کسی بھی راہ کے مسافر سے کہدیتے کہ مقدمہ دیکھ لو۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ محض اس لئے کہ ڈاکٹر سے علاج کا رشتہ و تعلق اس لئے نہیں جوڑا کہ وہ دوکان والا ہے یا چہرہ مہرہ والا ہے بلکہ اس کی بنیاد اس کی سند اور اس کا ڈپلومہ ہے۔

حیرت کلیجہ پیٹ رہی ہے، تمہاری اس بوالفضولی، یا وہ گوئی اور ہرزہ سرائی پر کہ جسے تم نے خود پڑھایا اس کی فیس ادا کی اور اس کو تم نے یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرائی اسے تم اپنا جیسا بشر نہیں کہتے حالانکہ وہ بھی دو ٹانگ والا ہے، دو آنکھ والا ہے، چہرہ مہرہ والا ہے ڈاکٹروں کو ڈاکٹر کہتے ہو، وکیل کو وکیل کہتے ہو۔ منصف کو منصف اور جج کو جج کہتے ہو۔ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ڈاکٹر، وکیل منصف اور جج یہ سب تمہارے ہی چہرے مہرے والے ہیں انھیں اپنا جیسا نہیں کہتے، ان کی ڈگری بولتے ہو، اور سید الکونین، روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم جنھوں نے درسگاہِ الوہیت میں تعلیم پائی۔ جیسا کہ سرکار نے خود ارشاد فرمایا ہے عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ۔ پروردگار نے انھیں بے شمار ڈگریوں اور خطابات سے نوازا۔ تم ان کی اس ڈگری کا احترام نہیں کرتے۔ بشر بولتے ہو الیٰسین نہیں بولتے، شفیع محشر و ساقیٔ کوثر نہیں بولتے۔

دنیا کی یونیورسٹی نے جو ڈگری دی ہے تم اس کا احترام تو کر سکتے ہو مگر کائنات کے خالق و مالک نے اپنے محبوب کو درسگاہِ الوہیت سے جو ڈگریاں عطا فرمائیں تم اس کی قدر کرنا نہیں جانتے تم اس کی قدر شناسی کا حق نہیں ادا کرتے۔ بس صرف بشر ہی یاد رہ گیا ہے۔ یہ سر نہیں تمہارا شر ہے۔ یہاں سے تمہاری ذہنی پراگندگی

اور دل کی گندگی کا صحیح اندازہ ہو گیا۔

حضرات! یہاں پہنچ کر میں اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر مساوات و برابری کے لئے چہرہ مہرہ ہی سب کچھ ہے تو اب ان کے چہرہ کی حقیقت کو واضح کر دی جائے تا کہ بھری دوپہر میں نہیں رات کی بھیانک تاریکی میں بھی ان کا مکروہ و گندہ چہرہ نظر آجائے۔ اچھا اب سنبھل کر بیٹھ جائیے:

ہم چند حضرات مثلاً حضرت مولانا ضیا جالوی، مفتی عبدالحلیم اشرفی اور مولانا اشرف رضا قادری، خطیبُ الہند مولانا حسن رضا خاں ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے وطن مالوف "بانتھ اصلی" جا رہے ہیں۔ مظفر پور پہنچ کر کار کر لی گئی جو سنسناتی چلی جا رہی ہے۔ "سید پور" پہنچنے کے بعد میری آنکھ گھڑی پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ میں نے حضرت ضیا جالوی سے کہا کہ کار روکئے۔ وقت کافی بیت چکا ہے۔ جناب کو چائے پلائی جائے۔ بڑی حیرت سے حضرت ضیا نے کہا کہ حضرت کیا آپ بانتھ اصلی پہلی بار جا رہے ہیں؟ ارے اب کتنے قدم رہ گئے ہیں یہ آیا، وہ آیا۔ پھر یہاں ہوٹل کی چائے وہاں "کاشانۂ رضا"، گھر کی چائے۔ وہاں لوگ منتظر ہوں گے، تشریف لے چلیں وہیں چائے پی جائے گی۔

چنانچہ کار بڑھی اور ساڑھے دس بجے ہم لوگ کاشانۂ رضا" پہنچے۔ جیسے ہی ہم لوگ وہاں پہنچے۔ مولانا کے ماموں نے اپنی گھڑی دیکھی اور دبی زبان میں فرمایا ساڑھے دس بج رہے ہیں آپ لوگوں نے تو چائے پی لی ہوگی۔

بھلا اب آپ ہی بتائیے جب معزز میزبان ہی کہہ رہا ہو کہ آپ لوگوں نے چائے پی لی ہوگی تو کون ایسا مہمان ہوگا کہ جو یہ کہدے

کہ نہیں پی ہے۔

حضرات! بس ایک جملے میں صبح کا ناشتہ جاتا رہا۔ ہم لوگوں نے خیال کیا، کوئی بات نہیں۔ بارہ بجنے ہی والے ہیں۔ جی بھر کے دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد "جالے" سے حضرت ضیاجالوی کے صاحبزادے مولانا غلام مقتدر کار لے کر آئے۔ حضرت بہت دنوں کے بعد اس علاقے میں تشریف لائے ہیں۔ مسرّت ہوئی۔ ہمارے وطن "جالے" تشریف لے چلیں۔ کار حاضر ہے۔ وہاں کے لوگ مشتاقِ زیارت ہیں۔ کرم ہوگا اگر تشریف لے چلیں۔

دارالعلوم غریب نواز الٰہ آباد کے فارغ التحصیل پھر حضرت ضیاؔ کے خلفِ رشید، بات کیسے ٹالی جائے۔ ہم بھی تیار ہوگئے۔ کار جالے کی طرف روانہ ہوگئی۔ "جالے" کے لوگوں نے یہ خیال کیا کہ یہ حضرات "کاشانۂ رضا" میں دوپہر کا کھانا کھاچکے ہوں گے۔ اس لئے کوئی تیاری نہیں کی گئی۔ مدرسہ کا معائنہ کیا۔ احباب سے ملے اور ٹھیک ساڑھے تین بجے کاشانۂ رضا پہنچے۔

اب یہ لوگ سمجھے کہ جب مولانا حضرات "جالے" گئے ہیں، تو دوپہر کا کھانا وہیں کھاچکے ہوں گے۔

لیکن اس حقیقت کو پروفیسر عبدالسّلام نے بڑی خوبصورتی سے یوں ادا کیا۔ حضرت اب تو بہت ناوقت ہوگیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت کھانا کھانے سے طبیعت خراب ہوجائے۔ میں نے بھی عرض کیا۔ پروفیسر صاحب اگر یہاں کی آب وہوا کا یہی اثر ہے کہ ۳½ بجے کھانے والا، بیمار پڑجائے تو ہم پروگرام پر آئے ہیں ہاسپٹل کا داخلہ لینے نہیں آئے ہیں۔

دوسرے جملہ میں دوپہر کا کھانا غائب ہوگیا۔ اب ہم لوگ

نمازِ عصر کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ " ددری سے مفتی عبدالحلیم صاحب کے چھوٹے بھائی محمد تسلیم رضوی کی کار آگئی کہ آپ نے مدرسہ فیض الرضا کا افتتاح کیا تھا مگر اس کے بعد آنا نہیں ہوا۔ لہٰذا چل کر مدرسہ کا معائنہ اور عمارت دیکھ لیجیے۔

اب مولانا اشرف رضا کے ساتھ ددری کے لئے روانہ ہو گئے۔ سب سے فارغ ہونے کے بعد ٹھیک ساڑھے دس بجے شب باتھ اصلی پہنچے۔ پہنچتے ہی ابوالکلام نے کہا حضور تاخیر بہت ہو گئی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دیہاتی مجمع واپس چلا جائے۔ لہٰذا پہلے تقریر بعد میں کھانا میں نے کہا بہت مناسب ہے یہی بہتر ہو گا۔

چنانچہ ساڑھے چار بجے صبح سلام و قیام اور دعا پر جلسہ ختم ہوا اس کے بعد مولانا عبدالرزاق نے فرمایا حضرت مجھے معلوم ہے کہ آج شب کانپور میں آپ کا پروگرام ہے۔ چنانچہ آرڈر کے مطابق مظفر پور سے جانے کے لئے کار آگئی۔ اب آپ فرمائیے کہ کھانا کھائیں گے، یا پروگرام میں تشریف لے جائیں گے۔ میں نے عرض کیا بہت اہم پروگرام ہے کھانا نہیں کھاؤں گا، مظفر پور جاؤں گا۔

چنانچہ ہم سبھی لوگ کار میں بیٹھ کر مظفر پور کی طرف چل پڑے جیسے ہی میز بانوں سے کار کچھ دور آگے نکلی حضرت ضیا رجالوی جو ہماری جماعت کے شہرہ آفاق ادیب و قلمکار ہی نہیں بہت خوش طبع و خوش مزاج ہیں مسکراتے ہوئے فرمایا حضرت ایک بات کہیں، کہ کان کھڑے ہو گئے۔ بھوکا پیاسا تو تھا۔ سوچا کہ ضیار صاحب، کچھ ناشتہ پانی کرائیں گے۔ میں نے کہا ضرور ارشاد فرمایئے

حضرات یہ ساری کاوش ذہنی اور جوڑ توڑ بس اسی ایک جملے کے لئے ہے جسے میں اب عرض کرنے جا رہا ہوں۔ حضرت ضیار نے

فرمایا۔ آج صبح سویرے نہ جانے ہم لوگوں نے کس منحوس کی صورت دیکھی تھی کہ دن بھر کھانا نصیب نہیں ہوا۔

حضرات! یہ کوئی منطقی اصطلاح نہیں ہے کہ جسے سمجھنے کے لئے ذہن پر دباؤ ڈالنا پڑے۔ بلکہ میرے اپنے خیال میں پورے ملک کا یہی دستور ہے کہ ایسے مواقع پر یہی کہا جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اس کا ایسا منحوس چہرہ ہے کہ اگر صبح صبح اسے دیکھ لیا جائے تو صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، سہ پہر کی چائے اور رات کی بریانی سب غائب ہو جائے۔

آبادیوں اور محلوں میں بعض بعض لوگ بہت مشہور رہوتے ہیں اگر صبح صبح گھر سے نکل کر کہیں دور کا سفر کرنے والا ایسے منحوس کو دیکھ لے تو پھر گھر واپس چلا جاتا ہے۔ یا تو بالکل سفر کا ارادہ ترک کر دیتا ہے یا کچھ دیر کے لئے سفر ملتوی کر دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ ایسے منحوس چہرے والے ہیں کہ ان میں سے جس کسی کو دیکھ لو دانہ پانی سب غائب ہو جائے تو آقائے کائنات ایسے چہرے مکھڑے والے ہیں کہ جو کبھی ایمان کی نظر سے ان کا چہرہ دیکھ لے وہ صحابیٔ رسول کہا جائے۔ اور غیر مسلم اس موہنی اور دل بھاتی صورت کو دیکھ لے تو دولت ایمان سے مالا مال ہو جائے گویا ایسا چہرہ کہ غیر مسلم دیکھے تو مومن ہو جائے۔ اور مومن دیکھے تو صحابی، یاد رہے صحابی کہہ رہا ہوں وہابی نہیں۔

حضرات! اب تو ان کے منحوس چہرے کی قلعی کھل گئی میں چاہتا تو نہیں تھا لیکن ان کی ضد، ہٹ دھرمی، کجروی اور کج فکری مجبوراً مجھے اس راہ پر لائی۔

چہرے سے متعلق مجھے ایک بات یاد آگئی جو بہت ہی مناسب

اور برمحل ہے۔ توجہ کا طلب گار رہوں۔

ایک بار بنارس میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا جس میں دلّی کے ایک بھاری بھرکم، لحیم شحیم شاعر بھی شریک تھے۔ مشاعرے کے بعد وہ کہیں چائے اور پانی کے لئے چلے گئے۔ اب آج کل مشاعروں میں گروپ کا رواج ہے جن میں شرکائے مشاعرہ کے فوٹو لئے جاتے ہیں سب کی تصویریں لی گئیں۔ میں حکایت نقل کر رہا ہوں جواز کا فتویٰ نہیں دے رہا ہوں۔ فوٹو کھینچنا کھنچوانا دونوں حرام ہے۔

بہر حال جب دلّی کے وہ شاعر واپس آئے تو کسی منچلے نوجوان نے کہا کہ حضرت آپ کہاں چلے گئے تھے۔ آپ کے انتظار میں کیمرہ رکھا ہوا ہے، تشریف لے چلیں تاکہ دستورِ مشاعرہ کے تحت آپ کا بھی فوٹو لیا جائے۔ شاعر نے پوچھا ہمارا فوٹو لے کر کیا کروگے؟ جوان نے کہا جب کسی بچہ کو ڈرانا ہوگا تو آپ کا فوٹو دکھلا دیا کریں گے۔

معلوم ہوا کہ کوئی صورت ایسی بھولی بھالی، پرکشش، دل آویزا اور دل فریب ہوتی ہے کہ بس جی چاہتا ہے کہ اسے دیکھتے ہی رہ جاؤں۔ اور بعض ایسی منحوس و مکروہ اور ڈراؤنی شکلیں ہوتی ہیں کہ اگر وہ خواب میں نظر آجائیں تو خوف کے مارے نیند اچاٹ ہوجائے۔

حضرات! جب چہرے ہی کی بات آئی ہے تو ایک بات اور سماعت فرمائیں۔ ابھی میں نے عرض کیا کہ میرے سرکار کا چہرہ وہ ہے کہ ایمان کی نظر سے دیکھنے والا صحابی کہا جائے اب اس مقام پر صحابیت کو سمجھئے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی تاثیر کا اندازہ ہو۔ جو میرے پروردگار نے

اس میں ودیعت کر رکھا ہے۔ یہ بڑا نازک مقام ہے، ہیں آپ کی بھرپور توجہ چاہتا ہوں۔ مثلاً ایک نصیبے والا مشرف باسلام تو ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اسے آقائے دوجہاں کی زیارت نصیب نہیں ہوئی اسے کیا کہا جائے گا مسلمان۔ لیکن ایک روز احساس بیدار ہوا، ایمان نے انگڑائی لی کہ زمانہ رسول اللہ کا ہے مگر میری بدنصیبی کہ ابھی تک میں زیارت نہ کر سکا بس اٹھا اور عشق کا قدم آگے بڑھایا حتی کہ مدینہ منورہ پہونچا اور ٹھیک ایسے وقت محبوب کبریا کی بارگاہ میں پہونچا کہ آقائے دوعالم اپنا تیز قدم بڑھاتے حجرۂ عائشہ کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ پردیسی نے سلام عرض کیا، اور سرکار دوجہاں نے سر اٹھا کر جواب دیا بس ایک لمحہ کے لئے اس کی نگاہ رسول کے چہرے پر پڑ گئی۔ عجب اتفاق ہے نہ تو اب سے پہلے دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے بعد پھر دوبارہ دیکھنا نصیب ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اب اسے کیا کہا جلئے گا۔

حضرات! اب صرف مسلمان یا مومن ہی نہیں بلکہ اس کو صحابیٔ رسول کہا جائے گا۔ خیال فرمائیے دو چار دن نہیں رہا، دو چار گھنٹے نہیں رکا، سرکار کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھی، کسی جہاد میں شریک نہیں ہوا۔ بس ایک لمحہ کے لئے ایمان کی آنکھ سے ایمان دینے والے کے چہرہ کو دیکھ لیا۔

اللہ اکبر! ایسا مسعود و مبارک چہرہ کہ اب اس چہرہ کو دیکھتے ہی صحابی ہو گئے۔ اب اس کے بعد مقام صحابیت کا اندازہ کیجئے۔

حضرات! قادرِ مطلق اگر اپنی قدرت کاملہ سے کسی ایسے مرد مسلمان کو ہزار برس کی عمر عطا فرمائے اور وہ ضروریاتِ زندگی

سے فراغت کے بعد، زندگی کا ہر لمحہ یادِ الٰہی میں گذارے، قرآن کی تلاوت، فرائض و واجبات کی ادائیگی، نوافل کی کثرت، سنن و مستحبات سے رغبت، غرضیکہ فتویٰ کی پابندی اور تقویٰ سے رضا مندی، غرض کہ صبح و شام یادِ نبی میں مستغرق رہے ایسا آدمی وقت کا عارف باللہ ہو سکتا ہے، ولیٔ کامل ہو سکتا ہے، قطب و ابدال ہو سکتا ہے، غوث و خواجہ ہو سکتا ہے لیکن اگر نہیں ہو سکتا تو صحابی نہیں ہو سکتا۔

معلوم ہوا کہ ہزار برس کی عبادت اور سجدے ایک طرف اور وہ نظر ایک طرف، جو محض ایک لمحہ کے لئے سرکار کے چہرۂ زیبا پر پڑ گئی ہے۔ یہاں آنکھ تجلیٔ الٰہی اور حسنِ مصطفوی کے مقابل مصلیٰ اور تسبیح حائل ہے، وہاں براہِ راست آنکھوں آنکھوں میں پلایا جاتا ہے۔ بس نظر سے نظر مل گئی اور تاریکیوں کی کایا پلٹ گئی۔

اللہ اللہ! ایسا چہرہ جسے دیکھتے ہی جنت الفردوس آنکھوں کے سامنے آجائے اور کہاں وہ منحوس چہرہ جسے دیکھنے کے بعد ملنے والا ناشتہ و کھانا بھی غائب ہو جائے۔

اے نادانو! تم اپنا منحوس چہرہ لے کر آقائے کائنات سے مقابلہ کرنا چاہتے ہو۔ اور دریدہ دہنی و کج فکری کا یہ عالم کہ تم کہتے ہو کہ دو آنکھیں ہماری اور دو آنکھ مصطفےٰ کی بھی۔ لہٰذا ہمارا اور ان کا فرق ہی کیا۔ مجھے معاف کرنا! اگر مساوات و برابری کا دار و مدار صرف دو آنکھوں ہی پر ٹھہرا تو کبھی اسی آنکھ کو لے کر الّو کے سامنے کھڑے ہو جاؤ اور اس سے بھی یہی کہو کہ دو آنکھیں تیری اور دو آنکھیں میری، پھر میرا تیرا فرق ہی کیا۔ جیسا میں ویسا تو۔ جیسا تو ویسا میں۔ لیکن یہ سنتے ہی جناب آگ بگولا اور چراغ پا

ہو جائیں گے اور یہی کہیں گے دیکھا "مشتاق نظامی" کو مجھے الّو کے سامنے کھڑا کر رہا ہے۔ پھر مجھے کہہ لینے دیجئے کہ تیرا حوصلہ کب سے اتنا بڑھ گیا کہ تو میرے مصطفےٰ کے منھ لگنا چاہتا ہے۔

حضرات! یہ تو چہرے مہرے کی بات تھی۔ آب آیئے اور اس حقیقت کو سمجھئے کہ قرآن نے بشر نہیں کہا مثلِ بشر کہا ہے تاکہ دستور کی "ساتویں دفعہ" واضح ہو جائے۔

دوستو! اگر فکری بصیرت، بالغ نظری، اور کاوش ذہنی سے کام لیا جائے تو اس کے سوال کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے غور فرمائیے قرآن نے کیا کہا ہے اے پیارے تم کافروں سے کہدو کہ میں ظاہری شکل وصورت میں تم سے ملتا جلتا بشر ہوں۔ قرآن اپنے محبوب سے یہ نہیں کہلا رہا ہے کہ پیارے تم یہ کہدو کہ جو تم ہو وہی میں ہوں یعنی جو تمہاری حقیقت ہے وہی میری بھی ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ بالفاظ دیگر یہ کہلایا جا رہا ہے کہ تم یہ کہدو کہ تم بشر ہو اور میں مثلِ بشر۔ گویا آیت میں "مثل" نے ان کو منھ توڑ جواب دیدیا اور ان کے منھ میں خاک جھونک دی کہ نادانو! تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ 'مثل' نے پردے کو اٹھا دیا کہ مصطفےٰ تمہارے جیسے ٹھیٹھ بشر ہوتے تو قرآن یوں کہلواتا:

"پیارے تم کہدو جو تم ہو وہی میں ہوں یا جو میں ہوں وہی تم ہو" مگر حاشا وکلا ایسا نہیں ہے بلکہ یہ کہدو کہ تم بشر ہو اور میں مثل بشر ہوں۔ یعنی مثل کی دلالت عینیت پر نہیں ہوتی بلکہ غیریت پر ہوتی ہے۔ گویا بشر اور مثل بشر اور۔

اب آپ اسے ایک مثال میں سمجھئے۔ مثلاً میرے ہاتھ میں ایک رومال ہے اس پر دھاگہ سے گلاب کا پھول کڑھا ہوا ہے۔ آپ

سب لوگ انصاف سے فرمائیے کہ یہ رومال والا پھول صورت میں
گلاب کے پھول سے تو ضرور مل رہا ہے لیکن آپ اسے پھول کہیں گے
یا مثل پھول۔ جواب یقیناً یہی ہوگا کہ مثل پھول ۔ کیا معلوم ہوا :
صورت میں مل جانے سے دونوں کی حقیقت ایک نہیں ہو جاتی
آپ کی عقل کا اگر فیصلہ یہ ہے کہ وہ پھول جو چمنستانوں اور لالہ زاروں
میں کھلا ہے اس کی حقیقت اور ہے اور جو رومال پر دھاگہ سے
کڑھا ہوا ہے اس کی حقیقت اور ہے۔

معلوم ہوا بشر اور ہے مثل بشر اور۔ چاند اور ہے مثل
چاند اور۔ آیت میں پروردگار نے آپ کو بشر نہیں کہا مثل بشر
کہا ہے۔

ایک خالص علمی اور درسگاہی گفتگو: حضرات! یہ گفتگو اگرچہ کٹھن اور سخت ہے
لیکن اگر میں نے سمجھا لیا اور آپ نے سمجھ لیا تو اس سے اس
عنوان کی پچہتر فیصدی الجھی ہوئی گفتگو کی گرہیں کھل جائیں گی۔
تلاوت کی ہوئی آیت مبارکہ میں خداوند قدوس نے اپنے
پیارے محبوب کو بشر سے تشبیہ دی۔ اب ایک ضابطہ سمجھئے
(یہ ہمارا ضابطہ ہے ان کا مغالطہ نہیں ہے)

ضابطہ یہ ہے کہ تشبیہ کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری
ہے (۱) مشبہ۔ (۲) مشبہ بہ۔ (۳) وجہ شبہ۔

مشبہ اسے کہتے ہیں جسے تشبیہ دی جائے اور مشبہ بہ
اسے کہتے ہیں جس چیز سے تشبیہ دی جائے اور وجہ شبہ ان
دونوں کے درمیان ایک مخفی اور چھپی ہوئی حقیقت ہے یعنی
جس کی وجہ سے تشبیہ دی گئی۔ مثلاً زید آیا تو آپ نے فرمایا

شیر آیا۔ یعنی زید کو شیر سے تشبیہ دی گئی تو زید کو مشبہ کہیں گے اور شیر کو مشبہ بہ اور تشبیہ شجاعت وبہادری کی بنیاد پر دی گئی یہ دونوں کا قدر مشترک ہے۔ یعنی زید کو اس لئے شیر نہیں کہا گیا کہ وہ چار ٹانگ والا ہے، بڑے کلّے جبڑے والا ہے، چنگل و دراز ناخن والا ہے وغیرہ وغیرہ بلکہ شجاعت وبہادری کی بنیاد پر اسے شیر کہا گیا۔

ایسے ہی محبوب کے ہونٹوں کو کہا "گلاب کی پنکھڑی جیسا ہے تو ہونٹ مشبہ ہوا، گلاب کی پنکھڑی مشبہ بہ ہے اور نزاکت وجہ شبہ۔

یہ تشبیہ نرم و نزاکت کی بنیاد پر دی گئی ہے محبوب کے دانتوں کو موتی جیسا کہا، دانت مشبہ ہے موتی مشبہ بہ اور چمک وجہ شبہ۔

بس ایسے ہی میرے سرکار کو بشر سے تشبیہ دی گئی ہے سرکار مشبہ اور بشر مشبہ بہ اور بشریت وجہ شبہ۔

اب غور کرنے کا مقام ہے کہ وجہ شبہ کی اصلیت مشبہ میں پائی جاتی ہے یا مشبہ بہ میں؟ آپ جیسے علم دوست و دانشوروں پر یہ فضیلت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ وجہ شبہ کی اصلیت مشبہ بہ میں پائی جاتی ہے اور اس کی کوئی جھلک مشبہ میں نظر آتی ہے۔ یعنی زید کو شیر کہا تو شجاعت وبہادری کی اصلیت پہلے زید میں نہیں ہے بلکہ اس کی اصل شیر میں ہے اور زید میں بہادری کی جھلک آگئی ہے۔ بس اسی بنیاد پر تشبیہ دیدی گئی ہے۔ ایسے ہی ہونٹ کو گلاب کی پنکھڑی جیسا کہا تو اصل نزاکت ہونٹ میں نہیں ہے بلکہ گلاب کی پنکھڑی میں ہے۔ البتہ ہونٹ میں

نزاکت کی جھلک آگئی ہے۔ ایسے ہی دانت اور موتی۔ گویا اصل چمک موتی میں ہے دانت میں اس کی جھلک آگئی ہے۔

معلوم ہوا وجہ شبہ کی اصل مشبہ میں نہیں مشبہ بہ میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اب غور فرمائیں سرکار مشبہ ہیں بشر مشبہ بہ، اور بشریت وجہ شبہ۔

یہ تو حقیقت واضح ہوگئی کہ بشریت کی اصل مصطفےٰ میں نہیں پائی جارہی ہے بلکہ بشر میں ہے۔ لہٰذا ہم ایسے بشر ہیں کہ جملہ لوازمات بشریت ہمارے ساتھ ہیں۔ مثلاً بشر کے جسم کا سایہ ہونا، پسینہ میں بدبو ہونا، جمائی آنا، بدن پر مکھی بیٹھنا، غفلت کی نیند سونا وغیرہ لوازماتِ بشریت ہیں۔ مگر میرے سرکار بشر نہیں ہیں مثل بشر ہیں۔ اس لئے ان کے جسم کا سایہ نہیں۔ پسینہ میں بدبو کے بجائے خوشبو ہو، جمائی کا نہ آنا، بدن پر مکھی کا نہ بیٹھنا، غفلت کی نیند نہ سونا یہی وجہ ہے کہ سرکار سو کر اٹھے وضو نہ فرمایا اور نماز ادا فرمائی۔ سرکار سے عرض کیا گیا، یارسول اللہ! آپ نے بغیر وضو کے نماز ادا فرمائی تو میرے آقا نے فرمایا، میری آنکھیں بند رہتی ہیں مگر دل بیدار رہتا ہے۔ تم سوتے ہو، استرخار اعضا ہوتا ہے تمہارے بدن کا جوڑ جوڑ ڈھیلا ہوجاتا ہے حتی کہ تمہیں خبر تک نہ ہوتی کہ ریاح خارج ہوئی یا نہیں؟

اصل میں نیند ناقص وضو نہیں ہے بلکہ نیند کی وہ غفلت جس سے اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ ریاح خارج ہوئی یا نہیں۔ اس لئے شریعت نے نیند ہی کو ناقض وضو قرار دیا ہے۔

یہ ہم میں ٹھیٹھ بشر کی بشریت ہے اور مصطفےٰ جیسے مثل بشر کی وہ بشریت ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اگر وہ ہمارے ہی جیسے

ٹھیٹھ بشر ہوتے تو ان کے بھی پسینہ میں بدبو ہوتی ؟ کنکریوں پر قدم رکھتے تو چبھن محسوس ہوتی مگر چبھن تو درکنار، کنکریوں نے موم ہوکر ہمیشہ کے لئے اپنے کلیجہ پر نقش قدم لے لیا۔ اسی کو عارف باللہ سرکار آسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

نہ میرے دل، نہ جگر پہ نہ دیدۂ تر پر
کرم کرے جو نشانِ قدم تو پتھر پر

لہٰذا معلوم ہوا کہ سرکار میں بس چہرے مہرے کی جھلک آگئی ہے اسے خوب ذہن نشین کر لیجئے کہ بشریت کی اصل ہم میں ہے سرکار میں نہیں۔

علاوہ ازیں ایک اور ضروری نکتہ ملاحظہ فرمائیں :

ہمارا وجود ایک ہے مگر اسی ایک وجود کے تین نام ہیں، آدمی، انسان، بشر۔ آدمی کہنے سے ہمارا سلسلۂ نسب معلوم ہوتا ہے یعنی ہم اولاد آدم ہیں۔ اسی لئے ہمیں آدمی کہا گیا۔ اور انسان کہنے سے ہماری حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ چونکہ یہ لفظ حقیقتِ انسانی پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ منطقی اشیاء کی حقیقتوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ لہٰذا منطق کی ابتدائی کتابوں سے لے کر آخری کتابوں تک آپ جہاں کہیں دیکھیں گے منطقی یہی سوال کرتا ہے "ماھو الانسان" یعنی انسان کیا ہے ؟ آخر وہ یہ کیوں نہیں کہتا "ماھو الآدمی، آدمی کیا ہے"۔ "ماھو البشر، بشر کیا ہے"۔

چونکہ اسے انسانی حقیقت بتانی ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے۔ اس لئے نہ تو وہ آدمی کہتا ہے چونکہ اس کی دلالت نسبت پر ہے۔ اور نہ ہی وہ بشر کہتا ہے چونکہ اس کی دلالت چہرے مہرے پر ہے اور بشرہ سے مراد چہرہ مہرہ ہے۔

اب آیت کے قریب آجائیے اور غور فرمائیے کہ قرآن حکیم جو مماثلت و مشابہت دے رہا ہے آدمیت و انسانیت سے نہیں اگر لفظ آدمی کہا جاتا تو معنی یہ ہوتے کہ جیسے تم اولادِ آدم ویسے ہم بھی اولادِ آدم ہیں۔ اگر آیت میں لفظ انسان ہو تو معنی یہ ہوتے کہ ہم تمہاری حقیقت میں مشابہ ہیں۔ جی نہیں یہ سب کچھ میں نہیں ہماری مشابہت صرف چہرے مہرے اور ناک و نقشہ میں ہے۔

اپنا جیسا! اس کے باوجود اگر وہ اسی بات پر تلے ہوئے ہیں کہ ہم چہرے مہرے ہی کی بنیاد پر انھیں اپنا جیسا ہی کہیں گے تو اس کی ضرب دامن رسالت ہی تک نہیں پہنچتی۔ یہ وار نہ جانے کس کس کو گھائل کرے گا اور اس تیر کے نشانے پر نہ جانے کتنوں کا کلیجہ زخمی ہوگا۔

حضرات! آج ایک غیر مسلم آپ سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ مسلمانو! قرآن کو کتنے لوگوں نے مل کر بنایا۔ اور ترتیب دیا تو آپ کا سادہ اور سنجیدہ جواب یہ ہوگا کہ اسے انسانوں نے نہیں بنایا۔ نہ انسانی ذہن و فکر کی پیداوار ہے بلکہ یہ مُنَزَّل آسمانی کتاب ہے۔ یہ خدا کا کلام ہے مخلوق نہیں، غیر مخلوق ہے۔ جس طرح اور بہت سی صفاتِ الٰہی حادث نہیں، قدیم ہیں۔ ایسے ہی وہ کلام نفسی بھی قدیم ہے۔

مگر اب وہ غیر مسلم دوسرا سوال کرتا ہے۔ اچھا میں نے مانا کہ تم میں سے کسی نے بنایا نہیں۔ یہ آسمان سے اتری کتاب ہے تو پھر یہ بتاؤ کیا ہر مسلمان کے گھر اتار دی گئی۔

اب آپ اس کا کبھی بھی سلجھا ہوا جواب دیں گے؟ جی نہیں

یہ ہر گھر میں نہیں اتری بلکہ کلام اللہ کا ہے اور زبان رسول اللہ کی۔ اب وہ تیسرا سوال کرتا ہے، کیا وہی رسول جو تمہارا جیسا ہے؟ تو پھر اسے کہہ لینے دو اور وہ کہتا ہے کہ جب تمہارا پیغمبر تمہارے ہی جیسا ہے تو اس کا کلام بھی تمہارے ہی جیسا ہونا چاہئے۔ اور پھر اس کی گفتگو بھی تمہاری ہی جیسی ہونی چاہئے؟

لہٰذا اب ہمیں کہہ لینے دو کہ آخرش وہ کون سا خط امتیاز ہے کہ ہم بولیں تو ہماری بات کہی جائے اور وہ بولیں تو اسے سورۂ والضحیٰ کہا جائے، سورۂ یٰس و سورۂ رحمٰن کہا جائے۔ دستور حیات اور قانون زندگی کہا جائے۔

اے عقل کے دشمنو! اگر تم نے چہرے کی بنیاد پر اپنا ہی جیسا کہا ان کی زبان مجروح کر دی تو زبان نبوت ہی مجروح نہیں ہوئی بلکہ کلام الٰہی بھی مجروح ہو جائے گا۔ لہٰذا اے نادانو! اگر تم دنیا سے کلام الٰہی کی تقدیس منوانا چاہتے ہو تو قرآن کی تقدیس سے پہلے زبانِ مصطفےٰ کی اس تقدیس کو منواؤ کہ زبان تو ہے مگر ہماری جیسی نہیں ہے۔

سوچو تمہارے ترکش کا تیر کس کو گھائل اور مجروح کر رہا ہے؟ بے لگام شرابی کی طرح ایسا نہ بولو جس سے خود تمہارے ہی مسلمات کی دھجیاں بکھر جائیں۔ رسول دشمنی میں تم اتنا بہک گئے ہو کہ اب قرآن پر بھی تم نے دست اندازی شروع کر دی۔ اسلاف واکابر نے تو اس کے ایک ایک نقطے کی حفاظت وصیانت کے لئے خون کا آخری قطرہ تک دیدیا۔ امام احمد ابن حنبل کی پشت مبارک پر کوڑے لگائے گئے۔ جیل کی آہنی سلاخوں میں ڈھکیل دیا گیا مگر پائے استقامت میں لغزش تک نہ آئی۔

ہزار ہا قربانیاں دے کر قرآن کے ایک ایک نقطے اور اعراب کی حفاظت کی۔ اور تم رسول اللہ کو اپنا جیسا بشر کہہ کے اصل سرمایہ ہی میں آگ لگا دینا چاہتے ہو۔

اس حقیقت کو یوں سمجھئے۔ کبھی کلام کے محاسن و برتری کا اندازہ متکلم سے ہوتا ہے اور بسا اوقات متکلم کی شناخت اس کے کلام سے ہوتی ہے۔ طریقے دونوں ہیں مثلاً مسئلۂ طلاق طلاق کا ایک مسئلہ لے کے بریلی شریف جائیں۔ سوئے اتفاق سیدی سرکار مفتیٔ اعظم ہند موجود نہ ہوئے اور آپ مایوس ہوئے لوگوں نے آپ سے کہا، مایوس نہ ہوں یہ درسگاہ کے منتہی طلبہ بیٹھے ہیں یہ بھی فتویٰ نویسی کا کام کرتے ہیں آپ ان سے فتویٰ لکھا لیں۔ بادل نخواستہ آپ نے لکھا تو لیا مہر بھی لگ گئی۔ لے کر چلے مگر دل مطمئن نہیں۔ اداس چہرے کے ساتھ جیسے دارالافتاء سے آپ نکلے حسن اتفاق تاجدار اہل سنت کی سواری آ گئی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک اٹھے۔ آپ نے حضرت کی بارگاہ میں استفتاء پیش کیا۔ سیدی سرکار حضور مفتیٔ اعظم ہند نے سوال دیکھا اور جواب کی صحت دیکھ کر الجواب صحیح لکھ دیا۔ اور اپنی مہر بھی لگوا دی۔ اب آپ بالکل مطمئن ہیں۔

اب آپ ہی فرمائیں کہ نہ تو سوال کی کوئی سطر بدلی اور نہ ہی جواب کا کوئی نقطہ بدلا۔ پہلے آپ غیر مطمئن تھے اور اب آپ مطمئن کیوں ہیں؟

معلوم ہوا شخصیت بدل گئی۔ پہلے ایک طالب علم کا جواب تو تھا اور اب جواب اس کا ہے جو فتویٰ نویسی کا سلیقہ سکھاتا ہے اور آداب فتویٰ نویسی بتاتا ہے۔

بس ایسے ہی اگر تم پیغمبر اسلام کو اپنا ہی جیسا کہتے رہے تو ان کے ہر قول وفعل، رفتار و گفتار پر اپنے ہی جیسے کی چھاپ لگتی جائے گی۔ پھر بتاؤ ان کا قول و فعل ہمارے قول و فعل کے حق میں میزان و ترازو کیسے بن سکے گا۔؟ ہم تو اپنے اعمال کو ان ہی کے اخلاق کی ترازو پر تولتے ہیں اور ان ہی کے کردار کے پیمانے میں ناپتے ہیں۔ اگر تم نے اپنا جیسا کہہ کر تیئس ۲۳ سالہ سیرت نبوی کے اس قیمتی خزانے کی قیمت گھٹا دی اور وزن گرا دیا تو تم ہی بتاؤ وہ کسوٹی کہاں سے لاؤ گے جس پر ہمارے تمہارے اخلاق و کردار کسے اور جانچے پرکھے جائیں، جو گناہ کو گناہ اور ثواب کو ثواب بتائے۔

الٹی منطق

جب رسول اللہ نے خود اپنے کو بشر کہا تو ہم کیوں نہ کہیں؟ اے عقل کے اندھو! یہاں پہنچ کر تمہاری توحید کی غاصبانہ ٹھیکیداری کہاں فروخت ہو گئی؟ توحید خالص کے بلند بانگ نعرے پھسپھسے کیوں ہو گئے؟

اے عقل کے دشمنو! تمہاری نظر میں تو ہم بھی کافر و مشرک ہیں۔ معاذ اللہ۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ ایک طرف سنت الٰہیہ ہے۔ اور دوسری جانب سنتِ رسول۔ خدا نے رسول اللہ کو خود انھیں کی زبان سے مثل بشر کہلوایا ہے۔ خود خدا نے نہیں فرمایا ہے۔ خدا نے تو قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ فرمایا۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور تواضع یہ فرمایا کہ میں تمہاری ظاہری شکل وصورت میں بشر ہوں اور خدا اسی مثل بشر کو کیا فرماتا ہے کہ مصطفےٰ میری طرف سے نور بن کر گئے۔

اسی لئے تم ہی فیصلہ کرو کہ سنت رسول مقدم ہے یا سنتِ الٰہ ۔ لہٰذا تم جیسے نام نہاد موحدین کو خود ہی کہنا چاہئے جو خدا فرما رہا ہے نورٌ کہو۔ یٰس کہو، طٰہٰ کہو۔ یہ الٹی منطق کیسی کہ سنّتِ الٰہ کو پس پشت ڈالا جارہا ہے اور جس چیز کو رسول خدا نے بطور تواضع یا تالیفِ قلوب کی خاطر فرمایا ہو اسے اچھالا جارہا ہے۔

توہینِ نبوت کی دبی ہوئی چنگاریاں اب اس قدر بھڑک اٹھی ہیں کہ تمہارے ہی ہاتھوں توحیدی سرمائے کو آگ لگ رہی ہے۔ اور پھر بھی تمہیں ہوش نہیں۔

حضرات! بات ناتمام رہ جائے گی اگر آیت کے شانِ نزول کی طرف اشارہ نہ کیا گیا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ قرآنی سورتوں کے نزول کے کچھ اسباب و وجوہ ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ آیت یا یہ سورۃ کب اتری، کس ماحول میں اتری، کس لئے اتری۔ اسی کے تعین کا نام شانِ نزول ہے۔

حضرات! اسے میں بارہا عرض کرچکا ہوں کہ کسی بھی آیت وسورۃ کو سمجھنے کے لئے اس کے شانِ نزول کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اب اس آیت سے متعلق بھی غور کیا جائے کہ یہ آیت کس ماحول میں نازل ہوئی۔

محترم حضرات! کفار مکہ آقائے دوجہاں کو دیکھ کر کتراتے ادھر ادھر سے گذر جاتے۔ قریب نہ آتے۔ تو ان کی تالیفِ قلوب گویا دل رکھنے کے لئے رب نے فرمایا، پیارے تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اور کسی شکل میں نہیں آیا۔ تمہاری ہی شکل و صورت میں آیا ہوں۔ کسی اجنبی لباس میں نہیں، لباسِ بشر میں آیا ہوں پھر مجھ سے کترا کے کنارے گذر جانے کے کیا معنی۔؟

گویا بشر کے معنی حقیقی نہیں مراد لئے جا رہے ہیں۔ ان کی تالیفِ قلوب کے لئے بطور مجاز کہلایا جا رہا ہے۔ حیرت ہے گرامر کا ناآشنا بھی حقیقت و مجاز بولتا ہے۔ خواہ اس کی اصطلاح سے واقف ہو یا نہ ہو۔ مگر بہت سے ایسے مواقع ہیں۔ جہاں حقیقت بول کر مجاز بولا جاتا ہے۔ مگر بہ گمان خویش یہ دانشکدوں کے رہنے والے نہ جانے کیوں یہاں حقیقت و مجاز کی اصطلاح بھول بیٹھے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھول جانے ہی میں کچھ ان کی مصلحت ہو گی۔

حضرات! جب بات آہی گئی ہے تو اپنی روزمرہ کی بول چال میں اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں۔

مثلاً ہم اور آپ بولتے ہیں کہ دریا بہہ رہا ہے۔ اچھا یہ بتائیے کہ دریا کہتے کسے ہیں؟ دریا کی تعریف کیا ہے؟

حضرات! گھبرائیے نہیں آپ کا امتحان لینا مقصود نہیں ہے بلکہ اندھیرے سے اجالے میں لانا ہے۔ دریا اس سطح زمین کا نام ہے جس پر سے پانی بہتا ہے یقین ہوا کہ دریا پانی کا نام نہیں ہے بلکہ زمین کی اس سطح کا نام ہے جس پر سے پانی بہتا ہے۔

اب آپ غور فرمائیں، آپ کیا فرماتے ہیں، دریا بہہ رہا ہے۔ دریا تو پانی کا نام نہیں بلکہ زمین کا نام ہے تو کیا زمین بہہ رہی ہے۔ زمین تو جہاں تھی وہیں ہے، بہہ تو پانی رہا ہے مگر آپ کہتے ہیں زمین بہہ رہی ہے۔ اسی کا نام مجاز ہے۔ یہاں اس کا معنی حقیقی مراد نہیں ہے بلکہ معنی مجازی۔ بس ایسے ہی آیت مبارکہ میں بشر کا معنی حقیقی مراد نہیں ہے بلکہ اس کا معنی مجازی مراد ہے۔ بطور حقیقت نہیں کہلایا جا رہا ہے بلکہ بطور مجاز کہلایا جا رہا ہے۔

اطمینانِ قلب کے لئے اسے ایک دوسری مثال سے سمجھئے:

مثلاً کئی دن مسلسل میرے پروگرام ہوئے۔ صبح دارالعلوم غریب نواز الہ آباد میں تپائی لگ گئی، مسند درست کر دی گئی۔ ڈیکس سامنے رکھ دیا گیا مگر مولانا ابوسفیان صاحب نے درسگاہ میں تشریف لانے کے بعد فرمایا۔ بچو! آج سبق نہیں پڑھاؤں گا۔ ایک طالب علم نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا، حضور! ایسی کیا بات ہے؟ مولانا نے جواب دیا۔ نظامی صاحب کے مسلسل پروگرام ہو رہے ہیں، برابر جاگنے اور آرام نہ ملنے سے رات اتنا تیز بخار آگیا کہ بدن سے شعلے نکل رہے تھے۔ یہ سنتے ہی ایک طالب علم نے عرض کیا، حضور پھر تو چار پائی جل گئی ہوگی، دری میں بھی آگ لگ گئی ہوگی؟

مولانا نے فرمایا ارے نادان! رات اتنا تیز بخار نہیں چڑھا تھا جتنا تیرا جملہ سننے کے بعد بخار تیز ہو گیا ہے۔

حضرات! آپ کچھ سمجھے، بدن سے شعلے نکل رہے تھے۔ طالب علم نے اس کا معنیٰ حقیقی مراد لینا چاہا یعنی جب آگ کے شعلے نکل رہے تھے تو چار پائی و بستر کا جل جانا یقینی ہے۔ کیونکہ بدن سے شعلے نکل رہے تھے۔

مولانا نے اس کے معنی مجازی مراد لئے یعنی اہل زبان جب بخار کی حدت اور تیزی بتانا چاہتے ہیں تو ان کا انداز بیان ایسا ہی ہوتا ہے کہ بدن سے شعلے نکل رہے تھے۔ جب کہ یہ معنی نہیں کہ بدن سے پھوٹ کر چنگاریاں نکل رہی تھیں بلکہ بطور مجاز بخار کی تیزی بیان کرنے کا یہ ایک مجازی طریقہ ہے۔

بس ایسے ہی آیت میں "بشر" کا معنی حقیقی مراد نہیں ہے بلکہ کفار مکہ جو دور دور تھے قریب نہ آتے۔ بطور مجاز "بشر" کہلا کر انھیں آفتاب ہدایت کے قریب لایا جا رہا ہے تاکہ وہ اس

سراج منیر سے مستفیض و مستنیر ہو سکیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ ضابطہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ "نبی" اپنے لئے بطور تواضع و انکسار جن الفاظ کو استعمال فرمائیں یہ حق امتی کو نہیں کہ وہ بھی نبی کے حق میں استعمال کرے۔ اگر نبی نے کفار مکہ کی تالیف قلوب کے لئے بطور تواضع وانکسار "بشر" کہدیا تو یہ حق دوسروں کو نہیں کہ وہ بھی بشر کہے۔

مثلاً ہم سب کے آقائے نعمت حضور سیدی سرکار مجاہد ملت خط لکھنے کے بعد جب دستخط فرماتے تو "فقیر محمد حبیبُ الرحمٰن" لکھتے اب حضرت کا ایک مرید خواہ کتنا ہی مزاج شناس وادب آشنا ہو وہ حضرت کو خط اس طرح لکھے۔

۷۸۶/۹۲ فقیر محمد حبیب الرحمٰن

میں خیریت سے ہوں آپ کی خیریت کا طلبگار،

تو میرے بھائی خطیب شہیر مولانا مشتاق احمد صاحب حبیبی فیض آبادی بڑی برہمی سے فرمائیں گے۔ پیر و مرشد کو کہیں اس طرح مخاطب کیا جاتا ہے۔ اس نے بڑی سادگی اور سنجیدگی سے جواب دیا کچھ میں اپنی طرف سے تھوڑے ہی لکھ رہا ہوں میں تو وہی لکھ رہا ہوں جسے حضور خود اپنے دستخط کے ساتھ تحریر فرمائے ہیں۔

مولانا حبیبی نے گرم لہجے میں فرمایا، تمہیں شعور نہیں، یہ حضرت کا اپنا حق تھا۔ وہ اپنے کو حقیر و فقیر لکھیں یا عاجز و مسکین لکھیں لیکن یہ ہمارا حق نہیں۔ ہم تو جب بھی لکھیں گے، شہید عشق فاتح عرب و عجم، استاذ العلماء، بحر العلوم، شیخ طریقت، حضور سیدی سرکار مجاہد ملت، ہی لکھیں گے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ پیر کا حق مرید ہڑپ نہیں کر سکتا۔ پیر کو

اپنے تئیں لکھنا ہے۔ مرید کو اپنے حدود میں لکھنا ہے۔

اگر کسی جماعت کا مقتدا اپنے کو ننگ اسلاف لکھے تو کیا وہ قوم سب کو اس کی اجازت دیگی کہ کوئی اس کو ننگ اسلاف لکھے؟ بلکہ وہ اس کا جواب یہی دیں گے کہ یہ ہمارے شیخ کا حق ہے کہ وہ اپنے کو ننگ اسلاف لکھیں۔ ہم تو انھیں القاب و آداب ہی سے یاد کریں گے۔

مجھے کہنے دیجئے! جو ضابطۂ اخلاق آپ کے اپنے پیر و مقتدا سے متعلق ہے اسے سید الانبیاء کی بارگاہ میں پہنچ کر بھول کیوں بیٹھے۔؟ یہی وہ دل کا چور ہے جو آپ کی گمراہی کا سبب بنا اس کی تفصیل "خون کے آنسو" میں ملاحظہ فرمائیں۔

نتیجہ کے طور پر اب مجھے ایک بات کہہ لینے دیجئے کہ جب یہ آیت کافروں کے لئے اتری اور اس کے مخاطب وہی ہیں تو اگر کافر بشر کہے تو وہ تو کافر ہی ٹھہرا لیکن ایک مرد مسلمان، کلمہ گو، اور دولت ایمان و عقیدہ سے مالا مال کبھی یہ گوارہ نہ کرے گا کہ انھیں بشر کہا جائے۔ بلکہ نت نئے آداب و القاب سے اپنے محبوب کو یاد کرے گا۔

تصویر کا دوسرا رخ :- آیت میں تو یہ کہلوایا گیا ہے کہ پیارے کہہ دو میں شکل و صورت میں تم سے ملتا جلتا بشر ہوں۔ لیکن اس حدیث کو یاد کیجئے، جب آقائے کائنات نے صوم وصال رکھا۔ اور صحابہ کو معلوم ہوا کہ میرے سرکار صوم وصال رکھ رہے ہیں۔ (صوم وصال پے در پے لگاتار بغیر افطار و سحر کے روزہ رکھنا) تو اپنے محبوب کی اتباع میں انھوں نے بھی صوم وصال رکھنا شروع کر دیا جس

کے نتیجے میں چہروں پر زردی اور اداسی چھا گئی اور اضمحلال نے قدم پکڑ لیا۔

سرکار نے صورتِ حال دریافت فرمایا۔ صحابہ نے جواباً عرض کیا۔ یا رسول اللہ! جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آپ صوم وصال رکھ رہے ہیں تو سرکار کی اتباع میں حصول برکات و بلندی درجات کی خاطر ہم نے بھی صوم وصال رکھنا شروع کر دیا ہے۔

یہ جواب سن کر سرکار نے فرمایا أیّکم مثلی تم میں میرے مثل کون ہے؟ اسے استفہام انکاری کہا جاتا ہے جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ تم میں میرے مثل کوئی نہیں۔

غور فرمائیں۔ کافر سامنے آیا تو فرمایا "مثلکم" میں تمہارے مثل ہوں اور صحابہ سامنے آئے تو فرمایا تم میں میرے مثل کوئی نہیں۔ انکار مثلیت ہے یہاں درجات و کوائف کا انکار ہے کہ تم میں میرے درجہ تک کوئی نہیں۔ یطعمنی ربی ویسقینی میرا رب مجھے کھلاتا ہے اور میرا رب مجھے پلاتا ہے۔ اور وہاں اقرار مثلیت۔ چہرہ مہرہ مراد ہے کہ میں اور کسی چہرے مہرے میں نہیں آیا۔ تمہارے ہی چہرے بشرے میں آیا۔

معلوم ہوا مثل کا اقرار بھی ہے اور مثل کا انکار بھی۔ مومن سامنے ہے تو انکار اور کافر سامنے ہے تو اقرار۔ لہٰذا اگر بشر کوئی بولے گا تو کافر نہ کہ مسلمان۔

حضرات! اس آیت کا مدعا بشر کہلوانا نہیں ہے بلکہ خدا کہنے سے روکنا منظور ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ برسرِ راہ اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا جائے۔

حضرات! میرے سرکار دو ایک معجزے لے کر نہیں آئے تھے۔ بلکہ پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک معجزہ ہی معجزہ تھے۔ انگلیوں کے اشارے سے چاند کا جگر شق کر کے دو ٹکڑے ہو جانا۔ ڈوبے سورج کا انگلیوں کے اشارے سے پلٹ آنا۔ ابوجہل کی مٹھی میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، سرکار کے حکم پر درخت کا حاضر خدمت ہو کر نبوت کی گواہی دینا۔ ہاتھوں کے اشاروں پر ستاروں کا ادھر سے ادھر ہو جانا۔ غرضیکہ شکل انسانی میں ایک ایسی بلند و بالا شخصیت جو سراپا معجزہ ہی معجزہ ہو، اندیشہ تھا کہ کہیں ان معجزات کی ہماہمی میں گم ہو کر کوئی خدا نہ کہہ بیٹھے۔ خدا نے کہا پیارے حقیقت نہ سہی بطور مجاز ہی کہدو کہ انا بشر مثلکم تاکہ اس اعلان کے بعد زبان بہکنے نہ پائے۔ اور مضبوط و مستحکم عقیدے میں کسی شگاف کے آنے کا اندیشہ نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس آیت کا مقصد بشر بشر کہلانا نہیں ہے بلکہ عقیدے کی سلامتی کو کج فکری و کج روی سے محفوظ رکھنا ہے۔

اس نکتہ پر لوگوں کی رسائی نہ ہو سکی اور وہ بشر بشر الاپنے لگے تو ذہنوں کی گندگی نوک زبان اور نوکِ قلم پر آگئی۔

حضرات! ہمارا کہنا یہ ہے کہ نہ تو اکھیں خدا کہا جائے اور نہ ہی اپنا جیسا بشر کہا جائے۔

ایسے محترم وجود گرامی جس کی مثال انبیاء و رسل میں نہ مل پاتی ہو، اسے بشر بشر کہنا، یہ بڑے درجہ کی گستاخی و بدبختی اور ایمان سے کوسوں دور ہونے کی کھلی ہوئی نشانی ہے۔ خدائے پاک ہر مسلمان کو اس طرح کی دماغی آلائشوں اور نجاستوں سے محفوظ رکھے اسی لئے علمائے اہلسنت نے آج کے ماحول میں سرکار کے مقام بشریت

کو علی العموم اپنا موضوع بنا رکھا ہے تاکہ ڈگمگاتے اور پھسلتے قدم سنبھل جائیں۔

حضرات! بات یہ چل رہی تھی کہ اس آیت کا مقصود بشر کہلوانا نہیں ہے بلکہ خدا اسے رد کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ و نمرود سرکش کی وہ گفتگو یاد کیجئے جو آپ کے بھی گوشۂ ذہن میں محفوظ ہوگی۔ نمرود نے جب معاذاللہ دعوائے الوہیت کیا تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے اس کی اس طرح گفتگو ہوئی۔

"اے ابراہیم تمہیں مجھے خدا ماننے میں کیا تکلف ہے"۔ حضرت ابراہیم نے پہلا معارضہ پیش فرمایا میرا رب وہ ہے جو مردہ کو زندہ کرتا ہے اور زندوں کو موت دیتا ہے۔

نمرود نے بے ساختہ کہا، ابراہیم یہ کوئی ایسی بات نہ ہوئی کہ تمہارے رب میں پائی جائے اور مجھ میں نہ پائی جائے۔ اگر خدا ہونے کی دلیل یہی ہے تو زندگی اور موت میرے بھی ہاتھ میں ہے دیکھو یہ زندہ ہے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہوں اور اسے پھانسی کا حکم ہے اسے بری کر کے زندگی دیئے دیتا ہوں۔ اس طرح مارنا اور جلانا میرے بھی ہاتھ میں ہے۔ اب مجھے رب ماننے میں کون سی شئے مانع اور حائل ہے۔

حضرت ابراہیم اس کی کج فکری اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ نادان موت وحیات کا صحیح مفہوم بھی نہیں جانتا۔

اصول مناظرہ کے تحت ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ حضرت ابراہیم اسے موت وحیات کا حقیقی معنی سمجھاتے۔ لیکن اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں یہ گفتگو لفظی جھڑپ اور الفاظ کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر اپنی مقصدیت کو کھو نہ بیٹھے۔ اس لئے انھوں نے گفتگو

کا رخ اس طرح بدل دیا کہ اب اس سے فکری و نظری بات نہ کی جائے بلکہ ایسا عملی مطالبہ کیا جائے کہ وہ اسے کر کے دکھا نہ سکے۔

چنانچہ فوراً آپ نے فرمایا اچھا اگر تو خدا ہے تو میرا رب وہ ہے جو آفتاب کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اور وہ مغرب میں غروب کرتا ہے۔ تو صرف ایسا کر کے دکھا دے کہ آفتاب کو بجائے مشرق کے مغرب سے نکال دے۔ یہ سنتے ہی نمرود مبہوت ہو گیا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور بغلیں جھانکنے لگا۔ چونکہ یہ مطالبہ فکری نہ تھا جس پر عقل کے گھوڑے دوڑائے جاتے بلکہ یہ کر کے دکھانے کا تھا جسے سن کر وہ حواس باختہ ہو گیا کہ اب یہاں تو بحث و مباحثہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے اسے عملاً کر کے دکھانا ہے۔

ایک مناظر اور ہادی کا فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ جو محض مناظر ہے وہ عقلی دلائل سے مخاطب کو مبہوت تو کر سکتا ہے کہ اس کی زبان گنگ ہو جائے۔ اور عقل پر تاریکی چھا جائے مگر یہ کچھ ضروری نہیں کہ اسے قبول کرنے کے لئے دل کا دروازہ بھی کھل جائے مگر ایک ہادی کا منصب محض اپنے مدمقابل کو خاموش کر دینا نہیں ہوتا، بلکہ اسے اس طرح پیش کیا جائے اور ایسی گفتگو کی جائے کہ اس سے محض عقل ہی چوٹ نہ کھائے بلکہ دل کا دروازہ بھی کشادہ ہو جائے۔

بہر حال اس واقعے کو تاریخ عالم نے ہمیشہ کے لئے اپنے صفحۂ قرطاس پر ثبت کر لیا تھا۔ اب مدتوں بعد مقام صہبا میں ایک ایسا وقت آیا جسے مولانا بشیر احمد صاحب سیالکوٹی علیہ الرحمہ کی زبان میں سماعت فرمائیں جب کہ حضرت علی مرتضیٰ کے زانو پر سرور عالم نے سر مبارک رکھ کر آرام فرمایا۔ حتیٰ کہ نیند آ گئی۔ اللہ اکبر! شیر خدا علی مرتضیٰ کا نصیبہ کتنا بلند تھا۔ "علی" کے زانو پر آج "نبی" کا سر ہے۔ سرکار نماز عصر سے

فارغ ہو چکے تھے اور علی مرتضیٰ ابھی ادا نہ کرسکے تھے۔ آفتاب ڈوبنے کے قریب آگیا۔ گویا آفتاب اپنی خاموش زبان میں اشارہ کر رہا تھا کہ علی! اب بھی غنیمت ہے۔ بہت ہی آہستگی سے اپنا زانو ہٹالو۔ تاکہ نبی کی نیند بھی نہ اچاٹ ہو اور تمہاری نماز عصر بھی قضا نہ ہونے پائے۔ مگر علی رمز آشنا تھے وہ اس بھید کو جانتے تھے کہ وہ تو آسمان کا آفتاب ہے اور میرے نصیبہ کی بلندی سے میرے زانو پر آفتاب نبوت جلوہ بار ہے۔ علی کبھی آسمان کے آفتاب کا چہرہ دیکھتے اور کبھی آسمانِ نبوت کے آفتاب پر فریفتہ ہوتے۔ حتی کہ اسی کشمکش میں آفتاب بالکل ڈوبنے سے قریب آگیا۔ اب اس کی آخری گگر ہے۔ پھر بھی وہ کہہ رہا ہے علی! اب بھی غنیمت ہے کہ اللہ اکبر کہہ کے کھڑے ہو جائیے۔ اگر مجھے دیکھتے ہوئے نیت باندھ لی تو اگرچہ میں ڈوب ہی کیوں نہ جاؤں پھر بھی تمہاری نماز ادا ہی کہی جائے گی۔ قضا نہ ہوگی مگر علی مرتضیٰ، اس حقیقت سے بہت اچھی طرح سے واقف تھے کہ اگر آفتاب ڈوب گیا تو یہی نہ ہوگا کہ نماز عصر جاتی رہی۔ ارے نماز کی تو قضا ہے لیکن اگر زانو ہٹانے کے بعد مصطفےٰ کی نیند جاتی رہی تو اس کی قضا کہاں سے لاؤں گا؟ بس اسی وقفہ میں آفتاب ڈوب گیا۔ آفتاب کے ڈوبتے ہی علی مرتضےٰ کی آنکھوں سے آنسو کے قطرات رخسار مصطفےٰ پر گر پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھیں کھول دیں۔ علی کا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔ دریافت فرمایا اے علی، اداسی کیوں. کس نے تم کو رلایا؟

عرض کیا یا رسول اللہ! نمازِ عصر جاتی رہی۔ بس یہ سننا تھا کہ پورے جلال نبوت سے مقامِ صہبا میں سرکار نے کھڑے ہو کر فرمایا علی تیری خدمت میں رہے اور سورج ڈوب جائے۔ انگلیوں کا

اشارہ کرنا تھا کہ ڈوبا ہوا سورج پلٹ کے واپس آ گیا۔ حکم دیا، علی! اپنی نمازِ عصر ادا کر لو۔

اللہ اکبر! حضرت ابراہیم نے نمرود جیسے سرکش، اور ماؤف الدماغ سے یہی تو مطالبہ کیا تھا کہ میرا رب وہ ہے جو مشرق سے سورج طلوع کرتا ہے اگر تو خدا ہے تو ایک دن اس کے خلاف مغرب سے سورج کو طلوع کر دے۔ تاریخ عالم نے ابراہیم اور نمرود کی اس گفتگو کو بہت محفوظ رکھا تھا۔ آج اللہ کے رسول کا یہ کھلا ہوا معجزہ ہے کہ ڈوبا ہوا سورج مغرب سے طلوع فرما رہے ہیں۔

حضرات! ابراہیم خلیل اللہ نے مغرب سے آفتاب کو طلوع کرنے کو معیار الوہیت و ربوبیت قرار دیا۔ اندیشہ تھا کہ "نبی" کا یہ معجزہ دیکھ کر کہیں دنیا ان کو خدا نہ کہدے۔ قدرت نے اشارہ کیا پیارے انا بشر مثلکم کہدو تاکہ ضلالت و گمراہی میں پھنسی ہوئی دنیا ہدایت و نجات کا راستہ پا جائے۔

بتاؤ! ان واقعات و حالات کی روشنی میں تم کیا کہتے ہو۔ بشر کہلوایا جا رہا ہے اسے یا خدا کہنے سے روکا جا رہا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الالباب۔

حضرات! ایک ضابطہ اور بھی یاد رکھئے جس طرح ہمارے اور آپ کے مختلف لباس ہیں مثلاً بازار سے سبزی ترکاری لانے کا لباس یہ ہے کہ لنگی، بنیائن میں جھولا لے کر چلے گئے۔ لیکن کورٹ اور دفتر جانے کے لئے کوٹ پینٹ چاہیے۔ وغیرہ۔ اگر کسی بارات میں جانا ہے تو ہفتوں سے کپڑے کا اہتمام، درزی دھوبی سب کا دماغ چاٹ رہے ہیں۔ چونکہ برادری کی بھری محفل میں بیٹھنا ہے عزت و وقار کا سوال ہے۔

حضرت مولانا شبیہ القادری امیر سنی تبلیغی جماعت پوکھریرا تقریر فرما رہے تھے۔ کرتا صدری، بدن پر جبہ ہے، گلے میں رومال، سر پر عمامہ، تقریر کے بعد مولانا جس وقت دو بجے شب اپنے حجرے میں آئے اور آرام فرمانے لگے۔ اب تعویذ کی غرض سے جا ئیے، دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائیے۔ تو کیا مولانا اسی کرتا، پائجامہ، اور جبہ و دستار کے ساتھ باہر نکلیں گے۔ ہرگز ہرگز نہیں۔ معلوم ہوا اسٹیج کا لباس اور ہے سونے کا اور۔

ہمارے ملک کے آنجہانی پنڈت جواہر لعل نہرو جب باہری ملک کا دورہ کرتے تو لباس کچھ اور ہوتا۔ پارلیامنٹ آتے تو دوسرا لباس ہوتا۔ شکاریوں کے ساتھ جب شکار کرتے تو کاندھے پر بندوق اور شکاریوں کا لباس ہوتا۔ اب اگر ناآشنا شکارگاہ میں نہرو جی کو دیکھ کر دریافت کرے کہ یہ کون ہے؟ تو جاننے والے نے یہ جواب دیا کہ یہی تو ہمارے ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو ہیں۔ اس نے منھ بدکاتے ہوئے کہا، ارے یہی نہرو جی ہیں۔ ایسے ہی پھٹیچر تو ان کا کوئی خادم بھی نہیں۔ بندوق خود ہی کاندھے پر رکھے ہیں کوئی بندوق اٹھانے والا تک نہیں۔ اور زین کا لباس پہنے ہیں۔ تو اس نے یہی جواب دیا کہ نادان! اس وقت وزیر اعظم نہ تو امریکہ کے وہائٹ ہاؤس میں ہیں اور نہ نئی دلی کے پارلیامنٹ میں۔

ارے نادان! یہ شکارگاہ میں ہیں۔ شکاری لباس ہی ہوتا ہے۔ اور شکاری کو ہر وقت اپنی بندوق اپنے ساتھ رکھنا چاہیے۔ نہ جانے کب اور کہاں شیر سے پالا پڑ جائے۔ ہمارے اور آپ کے مختلف لباس ہوتے ہیں۔ اور ایک ہی لباس دیکھ کر فیصلہ بھی نہیں کیا جاتا۔

بس بلا تشبیہ وتمثیل ایسے ہی میرے سرکار کے بھی بہت سے لباس تھے۔

اے نادانو! اگر تم نے رسول اللہ کو کھاتے پیتے دیکھا، تو صوم وصال میں بغیر کھاتے پیتے کیوں نہ دیکھا، کہ مسلسل روزے پر روزہ۔ مگر نہ بھوک ستائے اور نہ پیاس۔ قریب آئے۔ معلوم ہوا کہ جس طرح حضرت جبرئیل صبح سے شام تک نہ جانے کتنی بار دربار رسالت میں حاضر ہوتے۔ کبھی کسی کٹھ ملّے سے سنا کہ جبرئیل تھک گئے۔ انھیں بھوک لگ گئی، وہ پیاسے ہو گئے۔ کیا سمجھے! ایک فرشتہ آتا ہے جاتا ہے لیکن نہ وہ بھوکا ہو نہ پیاسا ہو۔ نہ اسے نیند آئے۔ بس ایسے ہی جب رسول اللہ کو کھاتے پیتے دیکھا تو وہ ان کا لباس بشری تھا اور بن کھاتے پیتے دیکھا تو وہ ان کا لباس ملکوتی تھا۔ اور میں عرض کر چکا ہوں کہ ایک ہی لباس دیکھ کر فیصلہ نہیں کیا جاتا مختلف لباس دیکھو تب فیصلہ کی زبان کھولو۔ ورنہ یہی زبان خود تمہاری ہی گردن پر تلوار کا کام کرے گی۔

اگر تم نے مکہ اور مدینہ کی گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھا تو مقام سدرہ پر کیوں نہیں دیکھا؟

اگر تم نے حجرۂ عائشہ کی باتیں سنیں تو کبھی اس حجرہ میں کیوں نہ دیکھا کہ رسول اللہ کے حجرہ کی کنڈی اندر سے بند ہے۔ دروازہ پر سیدہ عائشہ آئیں۔ کنڈی کھٹکھٹائیں۔ اندر سے آواز آئی، کون ہے؟ جواب ملا انا عائشہ۔ میں عائشہ ہوں۔ دوبارہ آواز آئی کون عائشہ۔ جواب دیا۔ ابوبکر کی بیٹی عائشہ۔ سہ بارہ آواز آئی کون ابوبکر؟ جواب دیا گیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ابوبکر۔ آواز آئی کون محمد؟ یہ سن کر حضرت عائشہ تھر تھر کانپنے لگیں۔ اور الٹے

پاؤں پلٹ آئیں۔ جب سرکار کی یہ کیفیت جاتی رہی تو آقائے دوعالم نے کرم فرمایا اور تشریف لائے۔ حضرت عائشہ نے گذرا ہوا واقعہ عرض کیا، یارسول اللہ! جب میں نے کنڈی کھٹکھٹائی تو اندر سے آواز آئی کون؟ میں نے جواب دیا۔ عائشہ۔ پھر آپ نے دریافت فرمایا کون عائشہ۔ میں نے عرض کیا ابو بکر کی بیٹی عائشہ۔ پھر آپ نے فرمایا کون ابو بکر۔ میں نے عرض کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ابو بکر تو آپ نے فرمایا کون محمد۔ میں دہشت زدہ ہو گئی۔ بدن پر کپکپی طاری ہو گئی اور اسی حال میں الٹے پاؤں پلٹ آئی۔

آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے آج کچھ پردہ ہٹایا۔ فرمایا عائشہ لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل میرا ایک خصوصی وقت اپنے پروردگار کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس وقت کوئی نبی و فرشتہ پر نہیں مار سکتا گویا میں اور میرا خدا۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔

اے نبی کی ہمسری کا دعوی کرنے والو! اب کچھ تم ہی بتاؤ کہ وہ کون سا لباس ہے میرے مصطفٰے کا کہ حضرت عائشہ کی جانی پہچانی آواز نہیں پہچانی جارہی ہے۔

اے عقل کے دشمنو! اگر نبی ہماری ہی طرح ٹھیٹھ بشر ہوتے تو اس واقعہ کو سوچو، کہ ہجرت کی شب ہے۔ آج کی رات اللہ کے پیارے رسول کو مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرنی ہے۔ ادھر اللہ کا محبوب روانگی کی تیاری کر رہا ہے اور ادھر کفار کے "دارالندوہ" میں پیغمبر اسلام کے قتل کی مکمل سازش ہو رہی ہے اور اس کے سارے زاویے درست کئے جا رہے ہیں۔

محسوس ہوا! "ندوہ" جیسے نام کے ادارہ میں کچھ ایسا ہی

ہوتا ہے۔ کافروں نے اپنا منصوبہ مکمل کر لیا کہ کوئی صدر دروازے پر رہے گا، کوئی مشرق کی جانب، کوئی مغرب کی راہ پر اور کوئی جنوب کی طرف اور کوئی شمال کی جانب۔ ننگی تلواروں اور شمشیر برہنہ سے دولت کدۂ مصطفےٰ کو گھیر لیا گیا۔ اس طرح پوری چوحدی کی ناکہ بندی کر لی گئی۔ اور ادھر آقائے دوجہاں علیؓ مرتضےٰ کو لوگوں کی امانتیں سپرد فرما رہے ہیں کہ اے علیؓ تم آج میرے ساتھ نہ چلو۔ ورنہ کل صبح لوگ طعنہ دیں گے کہ محمد اس طرح بھاگ گئے کہ ہماری امانتیں بھی لے کر چلے گئے۔ لہٰذا فلاں فلاں کی امانت ایک ایک کے گھر جا کر صبح سب کو پہنچا دینا۔ اور ایسا کرو، میری چادر اوڑھ کر میری چارپائی پر سو جاؤ۔

یہ کہہ کر اللہ کے رسول صدر دروازے سے ہجرت فرما گئے۔ کفار مکہ کے بڑے بڑے سورما ننگی تلواریں لئے کھڑے رہ گئے۔ چھپ کر نہیں چوٹ بھاڑ کر نہیں، کسی چور دروازے سے نہیں، کافروں کی بھیڑ بھاڑ چیرتے ہوئے اس طرح نکل گئے کہ کوئی آپ کی کلائی نہ تھام سکا۔ کسی نے گریبان پر ہاتھ نہ رکھا۔ کسی نے آوازہ نہ کسا کہ اے محمد ہم سے بچ کر کہاں جا رہے ہو ہماری تلواریں تمہارے خون کی پیاسی ہیں جب تک تمہارا لہو نہ چاٹیں گے ہمارا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہو گا۔ کسی نے پاؤں پکڑ لیا ہوتا، کوئی پاؤں کی بیڑی بن جاتا مگر مصطفےٰ سب میں سے گئے اور سب سے بچ کر چلے گئے۔

اے عقل کے دشمنو! اگر جنگِ اُحد میں اسی نبی کے دندانِ مبارک شہید ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ ایک لباس تھا اور راب بتاؤ یہ کون سا لباس ہے کہ انسانوں کی کھلی آنکھوں سے بچ کر اس

طرح نکل گئے کہ کوئی دیکھ نہ سکا۔

معلوم ہوا سرکار نے بشریت کی چادر "علی" کو اڑھادی اور نور محض بن کر چلے گئے۔ آنکھیں چکا چوند کر گئیں۔ کوئی ہاتھ اپنی گرفت میں نہ لے سکا۔

اب جب کفار مکہ اندر داخل ہوئے تو علی کو چارپائی پر سوتے دیکھ کر اچھل پڑے کہ اب محمد کو اتنا بھی موقع نہ دیا جائے کہ اٹھ کر اپنی تلوار سنبھال سکیں۔

حضرت علی کے چہرہ پر سرکار کی چادر پڑی تھی اور چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ بعض لوگوں نے کہا سوتے میں قتل کر دو مگر ان کے تجربہ کاروں نے کہا کہ ہماری بہادری کے خلاف ہے کہ مقتول کا چہرہ تک نہ کھولا جائے۔

چنانچہ چہرہ سے چادر کھسکائی گئی دیکھا کہ بجائے محمد کے علی مرتضٰی سو رہے ہیں۔ کفار مکہ کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی کہ اگر ان کو قتل کیا تو ابوطالب سے کون جنگ مول لے گا۔ چنانچہ وہ سرکار کی تلاش میں باہر نکل آئے۔ اور تعاقب میں گھوڑے دوڑا دیئے۔

ایک نکتہ:۔ صبح کسی صحابی نے حضرت علی مرتضٰی سے پوچھا۔ آپ کو معلوم تھا کہ یہ وہ چارپائی ہے کہ اس پر سونے والے کا آج قتل ہو گا۔ پھر آپ سوئے یا نہیں۔ علی مرتضٰی نے جواب دیا آج سے اچھی نیند کبھی آئی ہی نہیں۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا ایسے میں نیند کب آسکتی ہے، جب اپنے قتل ہونے کا یقین ہو۔ علی نے جواب دیا لوگو! موت تو برحق ہے جب اسے

آنا ہوگا تو ایک لمحہ نہ آگے نہ پیچھے وہ تو آکے رہے گی۔ مگر اس موت کا کیا کہنا کہ "نبی" کی اطاعت میں "نبی" کی چارپائی پر آجائے۔

سبحان اللہ یہ تھا عشق اور اس کی سرمستی و سرشاری جس میں حضرت علی ڈوبے ہوئے تھے۔ اگر یہ جذبۂ عشق پیدا نہ ہوتا تو سنتے ہی معذرت طلب کرلیتے۔

اے علی! تم پر صبح و شام خدا کی رحمت برسے کہ تم نے عشق کو حیات سرمدی عطا کردی، اور رہروانِ عشق کے لئے جاں سپاری وجاں بازی کی راہ متعین کردی۔ کہ جب محبوب کا حکم آجائے تو جان جیسی متاعِ عزیز بھی خلل انداز نہ ہونے پائے۔ یہی وہ دولتِ گراں مایہ تھی جو شہید کرب وبلا کو تمہاری گود سے ملی تھی۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرات! میں ان بدنصیبوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب عام انسانوں کے بارے میں ایک ہی لباس دیکھ کر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تو رسولِ گرامی کے نہ جانے کتنے لباس ہیں تو ان سے متعلق فیصلہ میں کیوں اتنی عجلت سے کام لیا گیا؟

اس سلسلہ کی آخری بات آپ سے عرض کرکے رخصت ہونا چاہتا ہوں

حضرات! ان ظالموں کا کہنا یہ ہے کہ وہ بھی بشر، ہم بھی بشر پھر ہمارا ان کا فرق کیسا۔؟

مجھے عرض کرنا ہے کہ نام کے ایک ہو جانے سے حقیقت ایک نہیں ہو جاتی۔ مثلاً آپ اسے یوں سمجھئے کہ پورے ملک کا یہ دستور ہے کہ اگر حلوائی کی دکان پر ایک روپئے کی برفی خریدیے۔ تو وہ تول کر برفی آپ کو نہیں دے گا بلکہ کاغذ کے کسی ٹکڑے میں رکھ

کر دے گا۔ آپ لوگ یہ بتائیے کہ برفی کو کھا لینے کے بعد کاغذ آپ نے کیا کیا؟ کیا جیب میں رکھ لیا، کوٹ میں رکھ لیا، پینٹ میں رکھ لیا یا پھینک دیا۔ اب آپ فرمائیے جسے آپ نے پھینک دیا ہے وہ ہے کیا کاغذ۔

حضرات! ایک وہ بھی تو ہے جسے آپ نے الماریوں میں رکھا ہے، تجوریوں میں رکھا ہے۔ یعنی نوٹ۔ بتائیے یہ بھی کاغذ ہے یا نہیں۔ ہاں کاغذ ہے۔ حضرات! دونوں کاغذ ہی ہیں ایسا کیوں ہوا کہ ایک کو نالی میں پھینک دیا، سڑک پر ڈال دیا۔ پاؤں سے روندا جائے، نالیوں میں بہایا جائے۔ آخرش دونوں کاغذ ہی تو ہیں۔ کاغذ کاغذ برابر۔ بشر بشر برابر۔ لہٰذا عقل کے دشمنوں سے کہئے کہ جو کاغذ نالی میں بہ رہا ہے اسے تجوریوں میں رکھ دیجئے اور جو کاغذ تجوریوں میں رکھا ہے اسے نالیوں میں بہا دیجئے۔ کیونکہ دونوں کاغذ ہی تو ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اب یہی تو کہیں گے کہ جو کاغذ تجوری میں رکھا ہے وہ ایسا کاغذ ہے کہ اس پر بھارت گورنمنٹ کی مہر لگی ہوئی ہے۔ اور یہ بالکل سادہ ہے۔

تو پھر مجھے کہہ لینے دیجئے کہ نوٹ پر اگر بھارت گورنمنٹ نے اپنی مہر لگائی ہے تو کیا پروردگار عالم نے دو شانوں کے درمیان مہر نبوت نہیں لگائی ہے۔ لہٰذا جس پر بھارت گورنمنٹ نے مہر لگائی ہے اسے لوہے کی تجوری میں رکھا جاتا ہے اور جس پر خالق کائنات نے مہر لگائی ہے اسے دل کی تجوری میں رکھا جاتا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

حضرات! کیا نوٹ اپنے نام کی وجہ سے قیمتی ہے اس

لئے کہ وہ نوٹ ہے۔ ہرگز نہیں۔ اپنے نام کی وجہ سے نہیں کام کی وجہ سے قیمتی ہے۔

خدا نہ کرے، اگر قحط پڑ جائے، گرانی آسمان کو چھونے لگے، جس کے پاس نوٹ سلامت ہو وہ مہنگی بھی چیز خریدنے گا پانی خواہ کتنا ہی گراں ہو جائے مگر نوٹ والا خرید لے گا۔

حضرات! مجھے کہنے دیجئے۔ جس پر بھارت گورنمنٹ نے مہر لگائی ہے اس سے گنگ و جمن، ندی، نالے کا پانی خرید اجاتا ہے مگر جہاں پرور دگار عالم جل جلالہ نے مہر نبوت لگائی ہے ان سے گنگ و جمن کا نہیں بلکہ حوض کوثر کا پانی خریدا جائے گا۔

صلوٰۃ و سلاماً علیک یا رسول اللہ

یہ قصۂ لطیف ابھی ناتمام ہے
جو کچھ بیاں ہوا وہ آغازِ باب تھا

علمِ غیبِ مصطفیٰ

علیہ التحیۃ والثناء

وہ کوئی بناسپتی اور ڈالڈا ٹائپ نبی ہوگا جسے پیٹھ پیچھے کی خبر نہ ہو۔ میرے سرکار روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رب نے فرمایا: "پیارے تم جو کچھ نہ جانتے تھے میں نے وہ سب کچھ تم کو بتا دیا۔ جب سب کچھ بتا اور سکھا دیا تو اب نہ جاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ نکرہ جب تحت نفی واقع ہو تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔"

اسی لئے میرے سرکار خود فرماتے ہیں میں ساری کائنات کو ایسے ہی دیکھتا ہوں جیسے اپنی ہتھیلی۔

دیدۂ اعتبار ہو تو ورق الٹئے اور اس کے دلائل وشواہد کو ملاحظہ فرمائیے۔

نحمدہ ونصلی علی حبیبہ الکریم
امابعد
فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا

اور کوئی غیب کیا تم سے نہاں ہو بھلا
جب نہ خدا ہی چھپا تم پہ کروڑوں درود

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے علم غیب مصطفےٰ۔
یہ بھی ایک المیہ ہے، بڑی دل خراش اور دردناک تاریخ ہے کہ جو مسائل صدیوں پہلے ہمارے مسلمات میں سے تھے اس پر نہ کوئی رد وقدح تھی اور نہ ہی نقد و نظر۔ وہ محض مان لینے کا مسئلہ تھا لیکن اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہوگئی کہ وہ مسائل بھی سی لپیٹ میں آگئے۔ اسی میں مسئلہ علم غیب بھی ہے۔
موجودہ اور اس کی ملحق صدی سے پیش تر اس کا جائزہ لیجئے تو اس مسئلہ میں اختلافات کی کوئی جھلک نظر نہ آئے گی۔ یہ اس طرح کے مسلمات

میں سے ہے۔ جیسے چاند کو چاند کہنا اور سورج کو سورج۔ بس ایسے ہی مسئلۂ علم غیب مانا ہوا مسئلہ ہے لیکن حفظ الایمان کی برہنہ، گندی اور کفری عبارت کی تاویلات و توضیحات نے اسے اس قدر پیچیدہ بنا دیا کہ اختلافات کے نہ جانے کتنے سوتے پھوٹ پڑے۔ اور کیسے کیسے گوشے نکل آئے۔ یہ بھی ہنس کہ علمی موشگافیوں نے نئے دروازے کھولے ہوں بلکہ اکھاڑے کے پہلوانوں نے اپنی بازی گری کے کرتب و کمال دکھانے میں زمین و آسمان کے وہ قلابے ملائے ہیں کہ الامان والحفیظ۔

برا ہو اس ضد اور ہٹ دھرمی کا جو انسانوں کی آنکھ پر عناد و دشمنی کی وہ پٹی باندھ دے جس سے بھری دوپہر میں آفتاب کے وجود کا انکار کردے کچھ مسئلۂ علم غیب میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ ورنہ حد ہی تو ہے کہ کفر کی چمگادڑ جیسی آنکھ دن کے اجالے میں علم غیب نبی کا جلوہ دیکھے۔ اور نام نہاد مدعیٔ اسلام کلمہ پڑھنے کے باوجود علمِ غیب مصطفیٰ کا انکار کردے۔

ع کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟

اگر کفر کی سرشت و خمیر میں یہ رچا بسا نہ ہوتا تو ابوجہل جیسا دشمنِ رسول علم غیب کو دلیل نبوت کیوں بناتا؟

معلوم ہوا کہ یہ ایسا واضح اور منھ بولتا مسئلہ ہے کہ اسلام تو اسلام کفر بھی اس کا یقین رکھتا ہے کہ جو نبی ہوگا وہ غیب داں ضرور ہوگا۔ گویا جس طرح چاند کے لئے چاندنی اور آفتاب کے لئے دھوپ کا تصور ہے بس ایسے ہی نبی کے لئے علمِ غیب کا۔

چنانچہ دعوائے نبوت کے بعد" ابوجہل" نے یہی تو کہا تھا کہ اے محمد اگر نبی ہو تو یہ بتاؤ کہ میری مٹھی میں کیا ہے؟

سرکار نے منھ چھٹتے جواب نہیں دیدیا بلکہ آج جواب وہ دینا ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ رہ جائے۔ چنانچہ آقائے کائنات صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا میں بتاؤں کہ تیری مٹھی میں کیا ہے؟ یا جو تیری مٹھی میں ہے، وہ بتائے کہ میں کون ہوں؟

یہ سنتے ہی ابوجہل بھڑک اٹھا اور بولا یہ تو اس سے بھی اونچی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ لہٰذا اب میرا سوال وہ نہیں ہے کہ آپ بتائیں میری مٹھی میں کیا ہے بلکہ جو میری مٹھی میں ہے وہ بتائے کہ آپ کون ہیں؟ یہاں آپ کا ذہن بوجھل ہوگا کہ آخر اندازِ سوال کیوں بدلا جارہا ہے۔

حضرات! یہی تو مجھے کہنا ہے کہ آج آقائے کائنات روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو منکرین علم غیب کے تابوت میں اپنے عالم غیب ہونے کی آخری کیل ٹھونک دینا ہے۔ تاکہ اب اس کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ خیال فرمائیے! اگر آقائے کائنات ابوجہل کا سوال سنتے ہی جواب عطا فرما دیتے تو اس کا امکان تھا کہ ابوجہل جیسا باغی دلائی منھ چھٹتے یہ کہہ دیتا کہ اے محمد! جب میں سنگ ریزوں کو چن رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم چھپ کر کہیں سے دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا سارا سوال وجواب ملیامیٹ اور ستیاناس ہو جاتا۔ اس لئے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کا رخ بدل دیا تاکہ جواب کے بعد مجالِ انکار نہ رہ جائے۔

چنانچہ جب ابوجہل نے سوال کا رخ بدل دیا تو آقائے دوجہاں نے نگاہِ نبوت کا اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی کنکریوں نے یہ پڑھنا شروع کیا اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ کنکریاں ابوجہل کی مٹھیوں کی گرفت اور قید میں ہیں مگر کلمۂ شہادت آقائے کائنات کا پڑھا جارہا ہے۔

حضرات! یہ صرف عالمِ غیب ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اختیارِ نبوت واقتدارِ رسالت کی بھی روشن دلیل ہے۔

حضرات! مجھے ابتدائی گفتگو میں واقعہ دہرانا مقصود نہیں تھا کہ نبی کے لئے علم غیب ایسا واضح وبدیہی مسئلہ ہے کہ مزاج کفر بھی اسے قبول کرتا ہے مگر حیرت ہے ان مدعیان اسلام پر جو اپنی لمبی داڑھیوں ملبے کرتے اور نشان سجدہ کے ساتھ یہ اعلان کرتے پھر رہے ہیں کہ علم غیب خاصۂ خداوندی ہے اللہ کے دیئے سے بھی کسی بندے کو ماننا شرک ہے بلاحظ ہو فتاوی رشیدیہ جلد سوم ص ۳۷۔

علم غیب خاصۂ حق تعالیٰ کا ہے اس لفظ کو کسی تاویل سے دوسرے پر اطلاق کرنا ایہام شرک سے خالی نہیں۔

اسی مذکورہ کتاب کا ایک اور حوالہ ملاحظہ کیجئے۔

"یہ عقیدہ رکھنا کہ آپ کو علم غیب تھا صریح شرک ہے"، (فتاوی رشیدیہ جلد دوم ص ۱)

دیکھا آپ نے کس طرح خانقاہ گنگوہ سے علم غیب مصطفےٰ پر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم دونوں کے دھماکوں کی وحشت ناک آواز سنائی دے رہی ہے۔

بہر حال! آج کی گفتگو واقعاتی نہ ہو گی بلکہ اس مسئلہ پر ہمارے حریف کے جو بنیادی سوالات ہیں اس کے جوابات بھی حاضر کئے جائیں گے اور اس کی بھی کوشش کی جائیگی کہ ان اصول کو سمجھانے کے لئے کچھ ایسے مستند واقعات پیش کئے جائیں جن سے ان اصول وضوابط کی تائید وتوثیق ہو سکے۔

آپ ابتداً چند بنیادی باتیں ذہن نشیں فرمالیں :۔ گویا آپ یوں سمجھئے کہ اب یہیں سے میری تقریر کا آغاز ہو رہا ہے۔ وہ واقعہ محض اسلئے پیش کر دیا گیا تاکہ آنے والی گفتگو کو قبول کرنے کے لئے ذہن مستعد و تیار ہو سکے۔

حضرات! ہم اہلسنت رسول اللہ کو "عالم غیب" کہتے ہیں۔ اور خدا کو عالم الغیب۔ اسے سب لوگ اس طرح رٹ لیں کہ "عالم غیب و عالم الغیب" بالکل زبان زد ہو جائے۔

یہیں یہ بات بھی گوشۂ ذہن میں محفوظ رہے کہ ہمارا حریف زبان و قلم سے جب بھی ہم پر سوالات کی بوچھار کرتا ہے تو سامعین و قارئین کو یہ ذہن دیتا ہے کہ ہم اہلسنت آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب بایں معنی مانتے ہیں کہ عالم الغیب کا الف لام استغراقی وہی ہے جو علم باری و علوم الٰہی کے بیان و اظہار میں عالم الغیب پر داخل ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

ہم خدا کو عالم الغیب کہتے ہیں اور مصطفٰے کو عالم غیب۔ اب اگر عالم الغیب کی بنیاد پر ہمارا رد کیا جائے تو وہ ہمارا رد و بطلان نہیں بلکہ کسی مفروضہ عقیدے کی تردید ہے۔ جب وہ ہم پر الزام و بہتان ہے جو ہمارا عقیدہ نہیں تو ہمارا رد کیسے ہو؟

۲:- حضرات! دوسری بات یہ ذہن نشیں کر لیجئے کہ ہم اہل سنّت و جماعت اس بات کے قائل ہیں کہ رب تبارک و تعالےٰ نے اپنے محبوب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علوم غیبیہ عطا فرمایا اور سرکار نے لیا۔ گویا خدا نے دیا اور مصطفٰے نے لیا۔

۳:- اب تیسری بات یہیں پر یہ بھی محفوظ کر لیجئے کہ اس "دینے" "لینے" کے اظہار و بیان میں ہم حد درجہ حدود ادب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ یعنی ہمارے پاس نہ تو کوئی ایسی ترازو ہے جس پر علم مصطفٰے کو تولا جائے۔ اور نہ ہی کوئی ایسا پیمانہ ہے جس میں ناپا جائے۔ علم تو "مقولۂ کیف" سے ہے جسے نہ تو تولا جا سکتا ہے اور نہ ہی ناپا جا سکتا ہے۔ یہ، وہ، اِتنا، اتنا، ایں قدر، آں قدر ہماری نظر میں یہ سب علم نبی کے لئے فضول و بکواس ہے۔

لہٰذا ہمارا کہنا یہ ہے کہ نہ تو ہم خزانۂ الٰہی کو جانتے ہیں اور نہ ہی وسعتِ داماں مصطفٰے کو بس دینے والا خدا جانے۔ لینے والے مصطفٰے جانیں۔

اس باب میں شاید کہ اس سے اونچی اور پیاری کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی۔ مانئے اور ماننے کی طرح مانئے؛

ایک زرّیں اصول: آپ اسے یوں سمجھئے کہ بڑا چھوٹے کے علم پر حاوی اور محیط ہے۔ اسے گھیرے ہوئے ہے حتیٰ کہ چھوٹا معلومات اور علم کے جن باریک گوشوں سے نا آشنا و ناواقف ہے۔ بڑا ان تمام گوشوں پر بھی مطلع ہے۔ لیکن چھوٹا اپنے اس بڑے کے علم کو جو اس سے علم میں بڑا ہے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا یعنی وہ اپنے سے بڑے کے علم کو گھیر نہیں سکتا مثلاً آپ مجھ سے ہی اگر دریافت فرمائیں کہ مشتاق نظامی تو اپنے استاذ مجاہد ملت حضرت علامہ مولانا شاہ محمد حبیب الرحمٰن صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان کے علم کو بتاؤ کہ وہ کیا جانتے تھے اور کیا نہیں جانتے تھے۔ تو میرا سلجھا اور سنجیدہ جواب ہوگا کہ اگر میں ان کا علم اس طرح گھیر لیتا کہ ان کا جاننا اور نہ جاننا دونوں ہی جان لیتا تو پھر میں ان سے پڑھنے ہی کیوں جاتا؟ اس طرح تو ہم دونوں خود ہی علم میں مساوی اور برابر ہو گئے کہ ان کا جاننا بھی مجھے معلوم اور نہ جاننا بھی مجھے معلوم تو آخر میں ان سے پڑھتا اور سیکھتا کیا۔؟

البتہ!

البتہ علم میں بڑا اپنے سے چھوٹے کے علم پر آگاہ و مطلع ہوتا ہے اگر سیدی آقائے نعمت حضور مجاہد ملت سے میرے متعلق دریافت کیا جاتا کہ حضور مشتاق کا علم کیسا ہے تو وہ فرماتے کہ فلاں فن میں اچھا ہے، فلاں فن میں کمزور ہے۔ یہ جانتا ہے وہ نہیں جانتا۔ اب ہم کو یہ یقین

حاصل ہو گیا کہ بڑا چھوٹے کے علم کو جانتا ہے مگر چھوٹا بڑے کے علم کو نہیں جانتا۔

بس مجھے کہہ لینے دیجئے! کہ میرے سرکار اپنی امت کے ایک ایک فرد کا علم جانتے ہیں مگر امت کا کوئی فرد علم مصطفےٰ کو نہیں گھیر سکتا۔ امت تو امت ہے میرے مصطفےٰ "علوم اولین و آخرین" پر مطلع ہیں۔ چنانچہ اس کا فلسفہ اور تفصیل ہماری تقریر "خلق اوّل" میں ملاحظہ فرمایئے:۔

۴:۔ اور چوتھی بات یہ ملحوظ خاطر رہے کہ نبی اپنی امت سے صرف علم ہی میں ممتاز نہیں ہوتا بلکہ علم و عمل دونوں ہی میں ممتاز ہوتا ہے۔ امت کا کوئی فرد میرے سرکار سے عمل میں مساوی تو ہو ہی نہیں سکتا، بڑھنے کا کیا سوال ہے

۵:۔ پانچواں اصول:۔

یہ یاد رہے کہ نبی کا جو بھی علم ہے وہ سب خدا کا ہی دیا ہوا ہے، اگر نبی کے لئے ایک ذرہ کا علم ایسا مانا جائے کہ یہ وہ علم ہے جو خدا کے دیئے یا بتائے بغیر نبی کو حاصل ہے تو یہ شرک ہے۔

اس لئے ہمارا کہنا ہے کہ خدا کا علم ذاتی ہے اور مصطفےٰ کا علم عطائی۔ لہٰذا نبی کے لئے خواہ کتنے ہی علوم غیبیہ مانے جائیں اصول کے تحت شرک کی پرچھائیں تک نہ پڑ سکے گی۔

۶:۔ چھٹا اصول:۔

یہ یاد رہے کہ نبی کا علم دفعتہً واحدۃً نہیں ہے بلکہ تدریجاً ہے

۷:۔ ساتواں اصول:۔

جہاں کہیں بھی آیات قرآن و احادیث نبوی سے علم غیب کا انکار لازم آتا ہو وہاں سمجھ لیجئے کہ علم غیب ذاتی کا انکار ہے۔ اگر آپ ان بتائے

ہوئے اصولوں کو یاد رکھیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ مسئلہ علم غیب میں آپ کبھی ذہنی وفکری خطا میں مبتلا نہ ہوں گے۔

اگر آپ کو میرے یہ بتائے ہوئے اصول یاد رہے تو علم غیب مصطفیٰ کی بحث میں آپ کبھی تذبذب اور اندھیرے میں نہیں رہیں گے اور نہ ہی اس کے بھول بھلیوں میں مبتلا ہوں گے حریف خواہ کتنا ہی شاطر ہو آپ کو یہ اصول ہر تاریکی میں اجالے کا کام دیں گے۔

اصول تو اور بھی بہت سے ہیں لیکن آج کی تقریب میں مجھے علم غیب مصطفیٰ کے عنوان پر جو تقریر کرنی ہے یہ اصول اس کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہیں۔ لہٰذا میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

اب آئیے ہم ایکبار اپنے سبق کو دہرالیں یعنی آزمائش کریں کہ آموختہ یاد ہے یا نہیں؟ تب عنوان کو آگے بڑھایا جائے۔

حضرات! آپ جیسے دانشوروں کو خطاب کرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں کسی عوامی جلسے کو نہیں بلکہ دارالعلوم غریب نواز الہ آباد جیسی معیاری درسگاہ کے طلبہ کو ان کی درسگاہ میں خطاب کر رہا ہوں۔

حضرات! اس میں میرا فن لائق تحسین نہیں ہے بلکہ آپ کا ذوق سماعت، بالغ نظری، اور مضامین کے سمیٹنے کی بھرپور صلاحیت قابل ستائش ہے۔ آپ سچ جانئے اگر آپ جیسے حضرات ہمارے اسٹیج کو میسر آجائیں تو لطائف وظرائف اور قصے کہانیاں جو تضیع اوقات کا باعث ہیں، ہو، ہا اور بے محل نعروں کی جھنکار کے بجائے ہمارا اسٹیج آسمان چھوتی بلندیوں کو پہونچ جائے اور بہت ہی مفتخر اور مؤثر ہو جائے

بہر حال! میں کہہ رہا تھا کہ آئیے ہم لوگ اپنا آموختہ یاد کریں۔ میں نے ابتدائی گفتگو میں آپ کو چند اصول بتائے ہیں اسے سمیٹ کر ایک

پھر ذہن نشیں کرلیں۔

(۱) خدا کا علم ذاتی ہے، مصطفےٰ کا علم عطائی۔

(۲) خدا عالم الغیب ہے اور مصطفےٰ عالم غیب ہیں۔

(۳) خدا نے علوم غیبیہ عطا فرمایا اور سرکار نے لیا۔

(۴) چھوٹا بڑے کے علم کو نہیں گھیر سکتا۔ البتہ بڑا اپنے سے چھوٹے کے علم کو جانتا ہے۔

(۵) نبی اپنی امت سے صرف علم ہی میں ممتاز نہیں ہوتا بلکہ عمل میں بھی منفرد ہوتا ہے۔

(۶) نبی کے علوم دفعۃً واحدۃً نہیں بلکہ تدریجاً ہیں۔

(۷) جہاں کہیں علم غیب کا انکار ہے تو اس سے مراد علم غیب ذاتی ہے

(۸) مخلوق کا علم محدود و متناہی ہوتا ہے۔ خدا کا علم غیر محدود اور غیر متناہی ہے۔ لاحد له ولانہایة له۔

حضرات! میں نے پہلے ہی آپ سے عرض کیا تھا کہ اس عنوان پر محض واقعاتی گفتگو نہ ہوگی بلکہ اصولی و بنیادی گفتگو ہوگی۔ جسے اساسی و کلیدی حیثیت حاصل ہوگی۔

"نقل" سے پہلے آئیے ہم اس عنوان کو "عقل" کی ترازو پر تولیں کہ عقل کا کیا تقاضا ہے۔ آیا نبی کو غیب داں ہونا چاہیئے یا غیب داں نہیں ہونا چاہیئے۔

فرض کر لیجئے! کہ اگر نبی عام انسانوں جیسا ہی ایک انسان ہے تو دعوائے نبوت کے بعد اگر لوگوں نے دعویٰ کی دلیل چاہی کہ آپ اپنے دعویٰ پر دلیل پیش کرو۔ اور "نبی" ۸ بجے شب یہ کہدے کہ دیکھو ہم تمہیں اس کی خبر دیتے ہیں کہ آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں تو

دنیا صاف کہدیں کہ اے محمد! اسے تو ہم بھی اپنے ماتھے کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ بات وہ کہو جس پر تم مطلع ہو اور ہم مطلع نہ ہوں۔

معلوم ہوا انسان دعوائے نبوت میں کسی ایسی ذہنی طاقت کا مطالبہ کرے گا کہ جو نبی کے پاس ہو اس کے پاس نہ ہو۔

محسوس ہوا! عقل چاہ رہی ہے کہ دعوائے نبوت کے ثبوت میں نبی کے پاس کوئی ایسی طاقت اور کوئی ایسا علم ہو جس سے قوم کو جھکایا جا سکے۔ نبی کے مقابل اسے اپنی بے مائیگی اور تہی دستی کا شدت سے احساس ہو۔ نہ کہ جو خود اس کی معلومات میں ہوں۔ اس کی خبر دینے سے بھلا قوم کیسے مطمئن ہو سکتی ہے؟ تو کیا پھر نبی کو اس لئے نبی کہا جاتا ہے کہ اس میں عقل کی بہتات و کثرت ہوتی ہے؟ اگر عقل ہی کی زیادتی کی بنیاد پر کسی کو نبی مانا جا سکتا ہے تو کیا ہو گیا ہے۔ امریکہ اور روس کے سائنس داں منھ میں گھونگھنی اور دہی جمائے بیٹھے ہیں؟

انھیں اس اصول کی بنیاد پر مسلمانوں کو چیلنج کرنا چاہئے کہ جب تم عقل ہی کی زیادتی کی بنیاد پر کسی کو نبی مانتے ہو تو ہم میں کون سی کمی ہے ہم نے تو عقل ہی کی توانائیوں کی بنیاد پر چاند کو زیر کر لیا اور اب اس سے بھی آگے جانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ زہرہ، مریخ، عطارد، زحل مشتری ان میں سے کوئی بھی ہماری سائنسی طلسماتی اثر سے نہ بچ سکیں گے لہٰذا یہ سب ہماری عقل ہی کے کرشمے ہیں۔ اب تمہیں کیا تأمل ہے ہمیں نبی و رسول ماننے میں۔

واضح رہے اعلان تو درکنار اس خیال کے تصور ہی سے ان کے کلیجے کا خون پانی ہوتا جائے گا اور رات کی نیند حرام ہو جائے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم دعوائے نبوت کریں گے تو مسلمان کچھ نہ سہی اتنا تو کرے گا ہی کہ ایک انچ سے بھی کم زمین کھود کر اسمیں کوئی چیز

رکھ دے گا پھر اسے مٹی و دھول سے بند کر کے ہم سے سوال کرے گا کہ اگر تم نبی ہو اور اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہو تو بتاؤ کہ اس میں کیا ہے۔ جسے ہم نے مٹی کے نیچے دبا و چھپا رکھا ہے۔ ؟ تو بس یہیں اس کی قلعی کھل جائے گی وہ جانتا ہے کہ دعویٔ نبوت سے متعلق ہم سے علم غیب کی دلیل مانگی جائے گی۔ چونکہ جو نبی ہوتا ہے وہ غیب داں ہوتا ہے، فضاؤں میں اڑنا، بلندیوں پر پرواز کرنا، اور ہے۔ اور قبر کا حال جاننا، ماورائے آسمان کی خبر دینا یہ اور ہے۔ یہ ہمارا کام نہیں بلکہ نبی کا کام ہے۔

محسوس ہوا! اگر اس مسئلہ کو عقل کی ترازو پر تولا جائے تو عقل کا بھی یہی کہنا ہے کہ نبی کو غیب داں ہونا چاہیئے۔

اب اگر ان دلائل و شواہد کی روشنی میں ہم اہلسنّت

سوال: یہ کہتے ہیں کہ خدا عالم الغیب ہے۔ اور مصطفیٰ عالم غیب تو رسول دشمن، شاتم رسول کا بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ خدا کے لئے علم غیب مانو تو رسول خدا کے لئے علم غیب مت مانو ورنہ شرک ہو جائے گا۔ یعنی بندہ خدا کی صفت میں شریک ہو جائے گا۔ جسے شرک فی الصفات کہا جائے گا۔

حضرات! اب مجھے آپ پر یہ واضح کرنا ہے کہ یہ ضابطہ نہیں مغالطہ ہے۔ توجہ کا طلب گار ہوں، سنجیدگی اور متانت سے بیٹھئے۔

حضرات! اگر اسے ضابطہ مان لیا جائے کہ صفت کا جو لفظ خدا کے لئے بولا جائے اگر وہی لفظ بندہ کے لئے بولا جائے تو شرک ہو جائے گا تو کہیں دور نہ جائیے اسی پنڈال میں بیٹھے اس مسئلہ کو حل کئے دیتا ہوں۔

اب آپ لوگ میرے ایک سوال کا جواب دیجئے۔ اچھا یہ بتایئے

کہ خدا موجود ہے یا نہیں (بیک آواز سب نے کہا کہ موجود ہے)

حضرات! پھر میں آپ کو موقع دیتا ہوں کہ بہت سوچ سمجھ کر اور سنبھل کے جواب دیجئے عجلت نہ کیجئے، چونکہ ان کا شرک منہ پھاڑے کھڑا ہے کہیں ان کو ہڑپ اور ہضم نہ کرلے (شور، موجود ہے، اللہ موجود ہے)

اچھا جب آپ کا یہی اصرار ہے کہ خدا موجود ہے اور آپ ہی کا اصرار نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کہتی ہے کہ اَللّٰہُ موجودٌ۔ البارئ موجودٌ الصَّانع موجودٌ۔ الخالق موجودٌ۔ تو آپ سب لوگ مجھے یہ بتائیے کہ آپ لوگ بھی موجود ہیں یا نہیں؟ پورا مجمع بول اٹھا ہاں ہم لوگ موجود ہیں۔

کیوں جناب! اصول وضابطہ تو یہ ہے کہ صفت کا جو لفظ اللہ کے لئے بولا جائے اسے ہرگز ہرگز بندے کے لئے نہ بولا جائے ورنہ شرک ہو جائے گا۔ جیسے علم غیب، اگر خدا کے لئے بولا جائے تو ہرگز ہرگز رسول اللہ کے لئے نہ بولا جائے۔ ورنہ بندہ اور خدا ایک صفت میں شریک ہو جائیں گے۔

بس اب مجھے یہاں کہہ لینے دیجئے کہ جب موجود اللہ کی صفت ہو گئی کہ اللہ موجود ہے تو پھر آپ لوگ اپنے لئے ہرگز ہرگز نہ بولئے کہ ہم لوگ موجود ہیں۔ ہم موجود نہیں ہیں۔ معدوم ہو گئے، مٹ گئے، فنا ہو گئے۔ بولئے یہ آخر کیا طرفہ تماشہ ہے کہ موجود اللہ اور بندہ دونوں کے لئے بولا جائے اور دھڑلے سے کہا جائے کہ اللہ بھی موجود اور بندہ بھی موجود۔ تو نہ یہ شرک ہے نہ بدعت لیکن غیب اللہ اور بندہ کے لئے بولا جائے تو شرک ہو جائے کوہِ ہمالہ بن کر کھڑا ہو جائے:۔ ؎

اللہ رے خود ساختہ قانون کا نیرنگ\
جو بات کہیں فخر وہی بات کہیں ننگ

جس طرح علم غیب اللہ کی ذات نہیں اس کی صفت ہی تو ہے بس ویسے ہی "موجود" ذاتِ الٰہ نہیں صفت معبود ہی تو ہے۔ پھر کون سی وجہ

ہے کہ موجود بولا جائے اور غیب بولا جائے۔

حضرات! یہی میں نے کہا تھا کہ یہ ضابطہ نہیں مغالطہ ہے۔

جواب :-

ہوشمندی اور ذہنی توانائیوں کے ساتھ اس کا جواب سماعت فرمائیے۔ بات خالص علمی ہے لہٰذا آپ کی بھرپور توجہ چاہتا ہوں۔

حضرات! اس طریقۂ استعمال کو اصطلاح کی زبان میں اشتراک لفظی کہا جاتا ہے۔ یعنی لفظ دونوں جگہ ایک ہی بولا جا رہا ہے مگر معنی بدلے ہوئے ہیں یعنی لفظِ موجود اللہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور بندہ کے لئے بھی۔

دوستو! لفظ تو ایک ہے مگر معنی بدلے ہوئے ہیں اللہ کے موجود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ سے موجود، آج موجود، ہمیشہ کے لئے موجود۔ یعنی ایسا موجود جس پر عدم نہ طاری ہوا ہو اور نہ کبھی طاری ہو۔

ہمارے اور آپ کے موجود ہونے کے کیا معنی؟ کہ اب سے دوسو برس پہلے ہم لوگ موجود نہ تھے۔ صحیح ہے نہ بھئی؟ ہاں اگر کوئی موجود ہو تو کھڑا ہو جائے تاکہ ہم لوگ بھی ایسے بزرگ کی زیارت کرلیں۔ اور پھر موجود نہ رہیں گے۔ یعنی ہمارا وجود دو عدم انکار کے درمیان گھرا ہوا ہے یعنی موجود نہیں تھے موجود ہیں۔ پھر موجود نہیں رہیں گے۔

میرے پیارے اسی کو اصطلاح کی زبان میں اشتراکِ لفظی کہا جاتا ہے یعنی دونوں جگہ لفظ ایک بولا جائے مگر معنی بدلے ہوئے ہوں۔ ہاں اگر کوئی یہ کہدے کہ ہمارا وجود خدا ہی کے جیسا ہے کہ ہم ہمیشہ سے ہیں، آج ہیں، ہمیشہ رہیں گے۔ تو ہم بھی کہیں گے کہ یقیناً وہ شرک بول رہا ہے۔ اپنے کو اللہ کی اس صفت میں شریک کر رہا ہے جو اللہ تعالےٰ ہی کے لئے خاص ہے۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا ہے۔ دونوں جگہ موجود تو بولا جا رہا ہے مگر دونوں کے مفہوم ومعنی اور مرادیں واضح لکیر کھنچی ہوئی ہے۔

ضابطے کے نام پر مغالطہ دینا، عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنا، ہوا محل اور شیش محل اٹھانا، دھول کی رسّی بٹنا، ریت کی دیوار اٹھانا آپ جیسے نام نہاد دانشوروں کا کام ہے، فریب خوردگی و فریب دہندگی آپ کا موروثی حصّہ ہے۔ لیکن اصول و ضابطے کے نام پر سیسہ پگھلائی دیوار اٹھانا، ایسی دیوار کہ خراش تک نہ آئے یہ ہم اہل سنت کا بل بوتا ہے اور غلامانِ رضا کا دم خم ہے

اے دوستو! اگر آپ نے اس اصول کو سمجھ لیا تو مجھے کہہ لینے دیجئے بس یہی کچھ معاملہ مسئلۂ علم غیب میں ہے۔ "علم غیب" اللہ و رسول دونوں کے لئے بولا جاتا ہے مگر دونوں کے معنی اور مرادمیں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اللہ کے علمِ غیب کے معنی یہ ہیں کہ اس نے کسی سے پوچھا نہیں، اس کو کسی نے بتایا نہیں، اس کو کسی نے سکھایا یا پڑھایا نہیں۔ مگر میرے سرکار کا جتنا بھی علم ہے وہ سب کا سب خدا ہی کا بتایا ہوا اور دیا ہوا ہے۔

معلوم ہوا! کہ خدا کا علم ذاتی ہے۔ اور مصطفٰے کا علم عطائی۔ لہٰذا اب کسی حال میں اسے شرک نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے ابتدا میں جو چند اصول آپ کو بتائے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ خدا کا علم ذاتی ہے اور مصطفٰے کا علم عطائی۔

دوستو! مگر جس نے قسم کھائی ہو کہ کچھ بھی ہو جائے ہم رسول کے لئے علم غیب نہیں بولیں گے تو آپ اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا نہیں ڈال سکتے بس سمجھانا ہی ہمارا کام ہے۔ لہٰذا شاتمانِ رسول نے طے کر لیا، کہ کچھ بھی ہو جائے ہم علمِ غیب نہیں مانیں گے۔ چنانچہ آپ لوگ غور فرمائیں کہ انھوں نے الٹا سیدھا قرآن کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ تاکہ خون لگا کر شہیدوں میں شریک ہو جائیں۔

جب بات آ ہی گئی ہے تو ترجمے کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں تاکہ

جو میں نے کہا ہے "الٹا سیدھا ترجمہ" اس کی تصدیق ہو جائے :-

آیت نمبر ۱ ۔ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ٥ (آل عمران آیت نمبر ۵۴)

ترجمہ۔ اور مکر کیا ان کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔

(مولوی محمود الحسن)

اور فریب کیا اُن کافروں نے اور فریب کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ (شاہ عبد القادر دہلوی)

اور وہ (یعنی یہود قتل عیسیٰ کے بارے میں ایک) چال چلے اور خدا بھی (عیسیٰ کو بچانے کیلئے) چال چلا اور خدا خوب چال چلنے والا ہے۔ (مولوی فتح محمد جالندھری)

آیت نمبر ۲ ۔ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى ۔ (والضحیٰ آیت ۷)

ترجمہ۔ اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی۔ (مولوی محمود الحسن)

اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے خبر پایا سو رستہ بتلایا۔ (مولوی اشرف علی تھانوی)

اور رستے سے ناواقف دیکھا تو رستہ دکھایا۔ (مولوی فتح محمد جالندھری)

آیت نمبر ۳ ۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (النصر آیت ۳)

تو پاکی بول اپنے رب کی خوبیاں اور گناہ بخشوا اس سے (مولوی محمود الحسن)

تو اب پروردگار کی حمد و ثنا کرو اور اپنی خطاؤں کی معافی مانگو۔ (ابو الکلام آزاد)

آیت نمبر ۴ ۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ ۔ (پ ۲۱ س احزاب آیت ۱) اے نبی اللہ سے ڈرتے رہیے۔ (مولوی اشرف علی تھانوی)

آیت نمبر ۵ ۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ (پ ۲۱ س احزاب ع ۲۰ آیت ۲۸)

اے نبی اپنی بیبیوں سے فرما دیجئے۔ (مولوی اشرف علی تھانوی)

اے نبی کہہ دے اپنی عورتوں کو۔ (شاہ عبد القادر دہلوی)

حضرات! پھر آپ اسی نقطۂ آغاز پر آجائیے کہ گستاخان نبوت نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہم رسول کے لئے علم غیب نہیں مانیں گے۔ چنانچہ جب انھوں نے قرآن کا ترجمہ کیا تو عربی لفظ کے اردو لائے۔ چونکہ ترجمہ کی ذمہ داری قبول کر لی ہے اور ترجمہ اردو میں ہے اس لئے صراط کا ترجمہ ہے، رحمن ورحیم کا ترجمہ ہے، قل ہو اللہ احد میں قل کا ترجمہ ہے اور احد کا ترجمہ ہے۔

غرض کہ عربی کے نیچے عربی نہیں لاسکتے ورنہ ترجمہ کا حق ادا نہ ہوگا مگر حیرت یہاں سربگریباں ہے کہ جب قرآن نے کہا یاایھا النبی تو نبی کے نیچے نبی ہی لکھ دیا اس کا ترجمہ ہضم کر لیا۔ محض اس لئے کہ اگر نبی کا ترجمہ کر دیتے تو علم غیب کا ثبوت ہو جاتا۔ اور یہ طے کر چکے ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے ہم رسول کے لئے علم غیب نہیں مانیں گے۔

خدائے قدیر اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا رضی اللہ عنہ کی قبر پہ رحمتوں کے پھول برسائے جب انھوں نے قلم کی تلوار سنبھالی تو جتنے بھی فراعنہ تھے سب کے سر قلم کر دیئے۔

اب امام احمد رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ترجمہ سماعت فرمائیے:

ترجمہ آیت ۱ اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر چھپی تدبیر والا ہے۔

آیت ۲ اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی

آیت ۳ تو اپنے رب کی ثنا کرتے ہوئے اس کی پاکی بولو اور اس سے بخشش چاہو۔

آیت ۴ اے غیب کی خبریں بتانے والے (نبی) اللہ کا یونہی خوف رکھنا۔

آیت ۵ اے غیب بتانے والے (نبی) اپنی بیبیوں سے فرما دے۔

دُوسری مثال :- ایسے ہی جب شاتمان رسول نے سیرت نبوی پر قلم اٹھایا تو سارے ابواب قائم کئے۔ مثلاً ہجرت نبوی غزوات نبوت، اخلاق محمدی، وغیرہ وغیرہ مگر چونکہ غیب سے چڑھے ہوئے ہیں۔ کوئی کریلا سے چڑھتا ہے کوئی رس گلا سے، کوئی شب برأت کے حلوے سے اور کوئی امام حسین رضی اللہ عنہ کے کھوڑے سے۔ اگر مل جائے تو سب کا سب ہضم کر جائیں۔ حرام بھی کہیں اور چٹ بھی کر جائیں یہ تو خدا کی مشیت ہے کہ کسی کو حلال کھلاتا ہے کسی کو حرام۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب علم غیب کی باری آئی تو یہ سرخی لگائی پیشنگوئی۔ ان عقل کے ماروں سے کوئی پوچھے کہ جب ڈھکی چھپی اور غیب کی باتوں کو سرکار جانتے ہی نہ تھے تو "پیشنگوئی" کیسے دیدی۔

ارے نادان! اسی پیشنگوئی کے پیٹ میں بہت خاموشی سے علم غیب سو رہا ہے۔ تم نے پیش گوئی کی سرخی لگائی تو مگر یہ نہ سمجھ سکے کہ اسی میں علم غیب کا بھی ثبوت ہو رہا ہے۔

الفضل ما شهدت به الاعداء

اسے تو میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ یہ علم غیب سے چڑھتے کیوں ہیں؟ اگر میں بھول جاؤں تو بتا دیجئے گا۔ مختصر اتنا سمجھ لیجئے کہ اس طرح کی پیشنگوئی میں آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے تو ان کا خیال ہے کہ اگر علم غیب مان لیں گے تو ہمارے بارے میں جو خبر دی ہے وہ صحیح ہو جائے گی۔ اور اسے ہمیں بھی ماننا پڑے گا لہٰذا سرے سے انکار کر دو کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ مگر انھیں اتنی عقل نہیں۔ یہ کہتے ہیں نبی کو علم غیب نہیں اور خدا فرماتا ہے وما هو على الغيب بضنين اللہ تعالےٰ تو یہ فرمائے کہ مصطفےٰ غیب کی خبر بتانے میں بخیل نہیں۔ اگر آپ آیت کا صحیح مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں تو بخل کے

استعمال میں اردو زبان کی نزاکت اور لچک کا اندازہ کیجئے۔ بخل کا مثبت پہلو ہو یا منفی پہلو، اسے جب بھی بولا جائے گا، سرمایہ داروں کے لئے۔ کسی کو کہئے بخیل ہے یا کسی کو کہئے بخیل نہیں ہے تو دونوں صورتوں میں اسے روپے پیسے والا سرمایہ دار ہونا چاہئے۔ یعنی بخل مفلس ونادار کی صفت نہیں بنتا جو خود ہی مفلس ہے اس کے فیاض وسخی ہونے یا نہ ہونے کا کیا سوال؟ وہ تو خود ہی دست نگر ہے۔

بس اب آیت کا مفہوم سمجھئے، مثلاً آپ خالد کے بارے میں فرمائیں کہ یہ بہت بخیل ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے دولت تو دی ہے، تجوری بھری ہے، بینک بیلنس مضبوط ہے مگر خالد فیاض وسخی نہیں ہیں۔

ایسے ہی اگر زید کے بارے میں یہ فرمائیں کہ بخیل نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سرمایہ دار بھی ہیں اور سخی بھی۔ مسافر نواز بھی ہیں، اور غریب پرور بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو کہئے بخیل ہے اور کسی کو کہئے بخیل نہیں ہے تو دونوں صورتوں میں دونوں کو سرمایہ دار ہی ماننا پڑے گا۔

بس ایسے ہی خدا فرماتا ہے میرا محبوب غیب کی باتوں کے بتانے میں بخیل نہیں ہے۔ اس کا واضح مفہوم ہے کہ میرا محبوب غیب کا خزانہ وسرمایہ بھی رکھتا ہے اور اسے تقسیم بھی فرماتا ہے یعنی اس غیب پر میرے بندے کو مطلع کرتا ہے۔

اب آپ حضرات خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ قرآن کی بات مانی جائے یا تقویۃ الایمان کی۔

منکرین علم غیب کو آگاہ کر دو۔ اے دو ورقی کتاب پڑھ کر ترازو اٹھانے والو، وحیٔ الٰہی کے لانے والے جبرئیل امین جسے نہ جانتے تھے اسے بھی میرے سرکار جانتے تھے۔ تم نحتھو، بدھو، خیر دکس کھیت کی مولی

ہو۔ قرآن کے قریب آؤ۔ تقویۃ الایمان کے نہیں۔

دیکھو وہ بارگاہِ رسالت ہے جبرئیل امین حاضر دربار ہیں اور حروف مقطعات کا نزول ہے۔ طٰہٰ، یٰس، طسم، عسق، کھیعص، الم اپنے اپنے مواقع پر۔ مثلاً جبرئیل نے کہا الف، سرکار نے فرمایا میں نے سمجھا۔ جبرئیل نے کہا لام۔ سرکار نے فرمایا میں نے سمجھا۔ جبرئیل نے کہا میم، سرکار نے فرمایا سمجھا۔ جبرئیل نے کہا الم، سرکار نے فرمایا میں نے سمجھا۔ جب سرکار نے فرمایا میں نے سمجھا تو جبرئیل نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے تو سمجھا مگر میں نے نہیں سمجھا۔ لبہائے نبوت پر مسکراہٹ آگئی اور ارشاد فرمایا، جبرئیل قرآن لانا تمہارا کام ہے اور سمجھنا میرا کام ہے۔

اب راز کھل گیا کہ "جبرئیل" استاد و معلم نہیں ہیں بلکہ ایک رابطہ اور ایسے رابطہ کہ قرآن تو لا رہے ہیں مگر سمجھ نہیں رہے ہیں۔ اور یہ تو اہتمام نبوت ہے کہ جب خبر رساں ایسا ہوگا تو پھر جس کی بارگاہ تک وہ دوڑ لگا رہا ہے وہ مسند نشیں کیسا ہوگا۔ اس کی بلند و عرش نشینی کا حال خدا ہی جانے۔

حضرات! ہو سکتا ہے کہ کل کی صبح کوئی سرپھرا آپ کا دامن تھامے اور یہ بکواس کرے کہ مشتاق نظامی نے یہ تو کہہ دیا کہ حروف مقطعات کو سرکار نے سمجھا مگر جبرئیل نے نہیں سمجھا۔ اس کی ضمانت اور گارنٹی کیا ہے ہم اسے کیونکر تسلیم کریں۔ لیجئے میں اسے بھی حل کئے دیتا ہوں۔

حضرات! اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ حروف مقطعات کو سرکار نے نہیں سمجھا تو اس کا یہ حملہ "مخاطب"، رسول پر نہیں ہے۔ بلکہ "متکلم" خدا پر ہے۔ وہ رسول دشمنی میں اپنی عقل و حواس کھو چکا ہے اسے تو الٹا سیدھا ٹیڑھا بانکا سوال کرنے سے غرض۔ کچھ اپنا زہر اتارنے کے لئے دوست و

دشمن نہیں ڈھونڈتا جب اس کا نشہ کلبلاتا ہے تو کوئی نہ ملے تو دیوار ہی پر ڈنک مارتا ہے مگر یہ ایسا بچھو اور بچھو پڑا ہے کہ محبوب کبریا ہی کی ذات کو منتخب کر چکا ہے۔ جہاں کہیں بھی عظمت مصطفےٰ اور توقیر نبوت کی بات آگئی وہیں اس کا نشہ اور زہر کلبلانے لگتا ہے۔

لیجئے اس کا بھی جواب سماعت فرمائیے:

حضرات! میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ حروف مقطعات کو رسولِ خدا بھی نہیں سمجھے تو یہ حملہ خدا پر ہے۔ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں اس کی مثال سماعت فرمائیے:

یہ مفکر اسلام، خطیب ہند، فاضلِ گرامی مولانا حسن رضا خاں صاحب ایم اے، پی، ایچ، ڈی تشریف فرما ہیں۔ اناؤنسر نے اعلان کیا مفکر اسلام تشریف لا رہے ہیں مگر آج کا شائستہ و شُستہ مجمع دیکھ کر مولانا کی نیت بدل گئی۔ بجائے اردو کے عربی میں تقریر شروع کر دی۔ دس پندرہ منٹ تک تو آپ یہ محسوس کرتے رہے کہ مولانا نے عربی کا کوئی نیا خطبہ یاد کر لیا ہے۔ اب تقریر ہو گی، تب تقریر ہو گی۔ مگر کچھ دیر کے بعد اب رائے بدل گئی۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ مولانا آج عربی ہی میں تقریر کریں گے۔ پانچ ادھر سے اٹھے، پندرہ ادھر سے، دس پورب سے، بیس پچھم سے غرض کہ مجمع سرکنے لگا۔ مولانا نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

ارے بھائیو! ہم غلط عربی نہیں بول رہے ہیں گرامر والی فصیح و بلیغ عربی بول رہے ہیں۔ سارا پنڈال بول پڑا حضرت ہم نے آپ پر کب الزام لگایا ہے کہ آپ غلط عربی بول رہے ہیں اگر آپ صحیح نہیں بولیں گے تو کیا وہ بولیں گے جو عربی مدرسہ بناتے ہیں بھر بولتے ہیں مگر سمجھے نہیں۔ مگر حضور یہ تو فرمائیے عربی تو آپ بالکل صحیح بول رہے ہیں مگر آپ کا مخاطب نہ تو عربی ہے نہ مکّی، نہ مدنی، نہ مصری، ہم تو لکھنؤ کی دھلی دھلائی

اردو اور دلی کی ٹکسالی زبان تک نہیں سمجھ پاتے چہ جائیکہ آپ کی فصیح و بلیغ عربی۔ یہ کہہ کر مجمع کھسک گیا۔ اب آپ ہی لوگ فرمائیں کہ جانے والوں کا بازو تھاما جائیگا کہ تم لوگوں نے پنڈال کیوں خالی کر دیا۔ یا حضرت مولانا کا، کہ جانتے ہوئے کہ ہمارا مخاطب عربی نہیں جانتا۔ ان سے عربی زبان میں خطاب کیوں فرمایا؟

جواب واضح ہے کہ جانے والوں پر کوئی الزام نہیں آتا سوال مولانا سے کیا جائے گا۔

بس بلا تشبیہ و تمثیل اگر یہ کہہ دیا جائے کہ حروف مقطعات رسول خدا نے نہیں سمجھا تو یہ بات نبی تک نہیں پہونچتی بلکہ خدا تک پہنچتی ہے۔ (معاذ اللہ) یہ جانتے ہوئے کہ رسول نہیں سمجھیں گے پھر بھی خدا بول رہا ہے اس لئے میں نے کہا تھا اگر یہ سوال کیا جائے تو وہ حملہ رسول پر نہیں کر رہا ہے بلکہ خدا پر کر رہا ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب ان سے دریافت کیا جائے کہ رسولِ خدا کو حروف مقطعات کا علم تھا یا نہیں تھا۔

معلوم ہوا کہ یہ عقل کا مقتضا ہے کہ خدا بول رہا ہے اور رسول سمجھ رہے ہیں اور اگر رسول نہ سمجھیں تو کلامِ الٰہی کا بے محل، لغو، بیکار اور مقتضائے حال کے خلاف ہونا لازم آئے گا۔ اور اس طرح کے نہ جانے کتنے سوالات پیدا ہو جائیں گے اور خدا کا کلام ایسے تمام عیوب و نقائص سے پاک و صاف، مبرّا اور منزّہ ہے۔

ہو سکتا ہے یہاں پہونچ کر آپ اس ذہنی خلجان میں مبتلا ہوں کہ حروف مقطعات کے ذریعہ خدائے قدیر نے اپنے رسول کو کیوں مخاطب فرمایا۔ تو لیجئے اس کا بھی جواب سماعت فرمائیے:

حضرات! یہ خدا و رسول کے درمیان سرّ اور بھید ہے۔ مثلاً میں

آپ کے متمدن شہر میں آیا ہوا ہوں اچانک مجھے جامعہ ازہر مصر جانے کی ضرورت پڑ گئی تو عزت مآب الحاج بڈن صاحب بنڈیگری رضوی سے عرض کیا موصوف نے آناً فاناً میرا پاسپورٹ اور ویزا تیار کرا دیا میں نے رخصت ہونے سے قبل اپنے محترم میزبان الحاج بڈن صاحب رضوی بنڈیگری سے عرض کیا میں طویل سفر پر جارہا ہوں۔ خدا جانے کیسے حالات پیدا ہوں۔ لہٰذا میں آپ سے چند حروف کے اشارے متعین کئے دیتا ہوں جسے میں سمجھوں یا آپ۔ مثلاً میں اپنے لیٹر پیڈ کے سادہ ورق پر حرف "میم" لکھ کر دستخط کر کے آپ کے پاس بھیج دوں تو آپ سمجھ لیجئے گا کہ میں مصر پہونچ کر مریض ہو گیا ہوں۔ اور اگر "ق" لکھ کر بھیج دوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں قرضدار ہو گیا ہوں۔ اور اگر "و" لکھ کر بھیج دوں تو سمجھ لیجئے گا کہ میں واپس آنا چاہتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ میں پاسپورٹ اور ویزا لے کر بمبئی پہونچا۔ طیارے پر بیٹھا اور پرواز کر گیا۔ مصر جامع ازہر پہونچ کر آب و ہوا کی تبدیلی ہوئی اور موسم کی خرابی کے سبب بیمار پڑ گیا۔

میں نے ۷۸۶ اور سلام مسنون کے بعد حرف (میم) لکھ کر دستخط کر کے لفافہ بند کر دیا۔ اور کئی روپے کا ٹکٹ لگا کر ڈاک کے سپرد کر دیا۔ یہ لفافہ رجانے کتنے ممالک سے گذرتا ہوا سی، آئی، ڈی آفس میں پہونچا ہے سینسر بورڈ میں پہونچتا ہے۔ ہر جگہ لفافہ کھول کر پڑھا جاتا ہے مگر ہر محکمہ حیران ہے کہ "میم" کے کیا معنی۔ لفافہ بھی ہے، لیٹر پیڈ بھی ہے، پتہ صحیح، ٹکٹ درست، خط بھیجنے والا پاگل تو نہیں معلوم ہوتا۔ آخر میں میم کے کیا معنی۔ بہت کھوج لگایا، بڑے بڑے سراغ رساں آئے، ایک سے ایک دانشور اور فلک پیما مفکر آئے۔ اور وہ سب کے سب ماتھا ٹیکے بیٹھے ہیں لیکن یہ راز سربستہ کھلتا نہیں۔ سب تھک ہار گئے۔ اب

مجبوراً لفافہ مکتوب الیہ کو روانہ کر دیا گیا۔ پوسٹ مین رئیس ملت عزت مآب الحاج بڈن صاحب رضوی بنڈیگری کے پاس میرا لفافہ لے کر آیا۔

لفافہ موصوف نے چاک کیا۔ میرے دستخط کے ساتھ (میم) دیکھتے ہی بھولی بسری بات یاد آگئی۔ ایک مسافر و پردیسی کا سفر یاد آیا تنہائی اور خلوت کی کچھ باتیں سطح ذہن پر ابھر آئیں جیسے وہ اسرار و رموز یاد آئے۔ ماتھا ٹھنکا، دل دھڑکا، چہرہ اترا، اور آنکھیں شبنمی ہو گئیں بچوں اور حلقہ بگوشوں نے پوچھا! ابھی ابھی آپ اتنے ہشاش بشاش تھے، ہنس بول رہے تھے، چہرے پر دل کشی اور دل آویزی تھی۔ یہ لفافہ کھولتے ہی آپ کو کیا ہو گیا؟ چہرہ اتر گیا۔ طبیعت نڈھال ہو گئی آخرش لفافہ میں آپ نے کیا پڑھا؟ لفافہ بھائیوں اور بچوں کے سامنے رکھ دیا کہ تم لوگ بھی دیکھ لو، سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہے ہیں مگر میم کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اب سب کی حیرانی بڑھ گئی یا اللہ! مصر کا بھیجا ہوا خط، ٹکٹ اتنے روپئے کا، اہتمام اس قدر مگر (میم) کے سوا کچھ بھی نہیں۔

خیر اگر (میم) ہی لکھا تھا تو کم از کم اس کے معنی لکھ دیئے ہوتے۔ کہ میم کے معنی یہ ہیں۔ بچوں اور بھائیوں سے نہ رہا گیا اس راز کا پردہ اٹھائیے اور آپ ہی بتائیے کہ اس کے کیا معنی؟ بہت سنجیدگی سے فرمایا کیا تمہیں نہیں یاد؟ مشتاق نظامی یہاں آیا تھا اور مصر جاتے وقت اس نے تنہائی میں کچھ پرائیویٹ باتیں کی تھیں۔ ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اگر میں سادہ کاغذ پر دستخط کے ساتھ صرف (میم) لکھ کر بھیج دوں گا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں مصر پہونچ کر مریض ہو گیا مجھے وہ بات یاد آگئی، میرا چہرہ اتر گیا۔ اور میں ایک گہرے غم میں ڈوب گیا۔

دیکھو یہ لفافہ کہاں کہاں سے گذرا مگر کسی کو نہیں معلوم (م) کے کیا معنی ہیں؟ میں جانتا ہوں یا مولانا مشتاق نظامی۔

بلا تشبیہ و تمثیل درسگاہ الوہیت میں میرے سرکار نے تعلیم پائی جیسا کہ خود سرکار فرماتے ہیں عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ اور جب قدرت نے میرے مصطفےٰ کو پڑھانے کے لئے یہاں بھیجا تو گویا یہ سطے ہو گیا، پیارے کبھی کھلی کھلی گفتگو ہوگی اور کبھی ڈھکی چھپی۔ جسے میں سمجھوں گا اور تم۔ حتیٰ کہ وحی کے لے جانے والے حضرت جبرئیل بھی نہ سمجھیں گے لہٰذا اگر الف، کہدوں تو یہ معنی، لام، کہدوں تو یہ معنی۔ اور میم، کہدوں تو یہ معنی۔ الخ

گویا یہ اسرار و رموز ہیں جسے مصطفےٰ جانیں یا مصطفےٰ کا رب جانے۔

ایک ناقابل انکار حقیقت :۔

اب اگر کسی نے حروف مقطعات کے کچھ معنی بتائے ہوں تو اسے علم تخمینی و ظنی کہا جائے گا یعنی یہ گمان و قیاس ہے۔ شاید کہ اس کے معنی یہ ہوں۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ الم، میں الف سے مراد اللہ کی الف ہے۔ اور لام سے جبرئیل کا لام اور میم سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی میم۔ گویا قرآن اللہ کی طرف سے جبرئیل کے ذریعہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا۔ بات ایسی ہے جسے ذہن قبول کر سکتا ہے مگر اس کو تخمینی ہی کہا جائے گا اس کا علم حقیقی خدا کو ہے یا خدا کے بتائے سے مصطفےٰ کو۔

ترازو اور پیمانے سے ناپنے والوں سے کوئی یہ دریافت کرے کہ بھلا کوئی یہ بتلا سکتا ہے کہ حروف مقطعات کے ذریعہ پروردگار نے اپنے محبوب کو کتنا اور کتنے انواع و اقسام کے اور کیسے کیسے علوم غیبیہ عطا فرمائے؟ اس لئے مجبوراً یہی کہنا پڑے گا کہ دینے والا خدا

جانے یا لینے والے مصطفیٰ جانیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

حضرات! منکرین علم غیب کی یہ عجیب وغریب دورخی پالیسی ہے کہ اگر ان سے یہ کہئے کہ قرآن میں سارے علوم ہیں اس میں ہر شئے کا بیان ہے جیسا کہ خدا نے ارشاد فرمایا:

ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین۔

ایسے ہی دوسرے مقام پر فرمایا تبیانا لکل شئی اس میں ہر شئے کا واضح بیان ہے۔

یہ انداز بیان ہے قرآن حکیم کا کہ یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی تھی کہ بیانا لکل شئی۔ مگر اہل علم اسے اچھی طرح جانتے ہیں کہ زیادتی لفظ زیادتی معنی پر دلالت کرتا ہے۔ بیان میں وہ مفہوم نہیں ادا ہوتا جو تبیان میں ہے۔ یا جو بات اور معنویت تبیان میں ہے۔ وہ بیان میں نہیں۔

ہاں تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ قرآن کے لئے سارے علوم وہ مان لیں گے مگر جب ان سے یہ کہئے کہ قرآن سرکار ہی پر نازل ہوا ہے تو جب قرآن میں ہر رطب و یابس کا بیان ہے تو لازماً اس کا علم رسول خدا کو بھی ہوگا۔ ایسا کیونکر ممکن کہ قرآن انھیں پر نازل بھی ہو اور وہی معانی قرآن سے ناآشنا اور ناواقف بھی رہ جائیں۔ یا للعجب یہ کیسا ڈرامہ ہے؟

علم غیب واقعات کی روشنی میں

حضرات! مسئلہ علم غیب پر کسی حد تک بنیادی اور اصولی گفتگو ہو چکی ہے۔ میرے اپنے خیال میں ذہنی تسلی و تشفی کے لئے اتنی قدر بہت کچھ ہے اگر تعصب کی عینک اتار کے مسائل کو دیکھنے کا مزاج بنایا جائے۔ مگر جو شخص یہ طے کرچکا ہو کہ ہمیں اسے نہیں ماننا ہے

تو قرآن کی کھلی آیت کو اسے جھٹلانے میں کوئی شرم و عار نہ ہوگا ایسے لوگوں کے لئے بس اتنا کہدینا کافی ہے کہ آپ کچھ بھی کہیں مگر دل مطمئن نہیں ہوتا

حضرات! ایسا نہیں ہے، دل تو مطمئن ہے مگر ضد اور ہٹ دھرمی کے تحت جو نظریہ طے کر چکا ہے اس لئے اسے اطمینان نہیں ہے۔

اب آقائے دوجہاں کے عالم غیب ہونے سے متعلق علم غیب کے کچھ واقعات و نمونے ایسے پیش کئے جاتے ہیں جو انشراح صدر کے لئے بہت کافی و وافی ہوں گے۔

(۱)

اللہ کے رسول سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نوجوان صحابی ہیں حضرت سیدنا ابو حذیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔ وہ ایک بار اپنی والدہ ماجدہ کے پاس آئے اور عرض کیا ماں! مجھے اجازت دو کہ آج نماز سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ادا کریں۔ ماں نے کہا: بیٹے! یہ کوئی نئی بات تو نہیں جو آج اجازت چاہ رہے ہو۔ ہم لوگوں کی بشر کہ خوش نصیبی اور فیروز بختی ہے کہ ہم نے اللہ کے رسول کا نور و نکہت سے بھرا ہوا زمانہ پایا جو زمانوں میں سب سے بہتر زمانہ ہے۔ تم تو رسول خدا ہی کی اقتدا میں نماز ادا کرتے ہو۔

سعادت مند بیٹے نے جواب دیا آج دل میں ایسا خیال پیدا ہوا ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آقائے دوعالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا دامن کرم تھام کر عرض کروں گا یا رسول اللہ میرے اور میری ماں کے گناہوں کو بخشوا دیجئے۔

یہ سن کر ماں نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ جاؤ ضرور سرکار کا دامن کرم تھام کے مچل جانا اور گناہوں سے مغفرت چاہنا۔

حضرات! یہ تھا صحابہ کرام کا عقیدہ، کہ نماز رسول خدا کے پیچھے ادا

ادا کریں گے اور گناہوں کو بخشوالینے کے لئے صرف اپنے سجدے ہی کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ دامن رسالت کا وسیلہ ضروری جانا۔ اگر اس طرح کا وسیلہ ان کی نگاہوں میں شرک ہوتا تو ماں کو کہنا چاہئے تھا کہ نماز اور سجدے کے ہوتے ہوئے پھر دامن رسالت کو وسیلہ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر ان کا عقیدہ ہے کہ سجدہ ہمارا ہے اور دامن مصطفےٰ کا ہے۔ اللہ اکبر! کہاں ان کا عقیدہ اور کہاں آج شرک و بدعت جیسے ایٹمی و آہنی اسلحے کی یلغار۔

بہر حال! وہ صحابی حاضر آئے اور سید الکونین کی اقتدا میں نماز مغرب ادا فرمائی۔ سرور دو عالم روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض کے بعد سنتیں ادا فرمائیں مگر سنتوں کا سلسلہ کچھ اتنا دراز ہو گیا کہ نماز عشا کا وقت آگیا۔ اور مؤذن نے عشار کی اذان پکار دی۔ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عشار پڑھائی۔ اس کے بعد ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ کی طرف تشریف لے چلے۔ حضرت حذیفہ پیچھے چل دیئے۔ آرزوئیں کہہ رہی ہیں پکارو، تمنائیں کہہ رہی ہیں آواز دو مگر ادب نے زبان پر تالے لگا دیئے۔ خبردار! خبردار! یہ کوئی اور نہیں جا رہے ہے یہ محبوب کبریا جا رہے ہیں جنکی بارگاہ میں حضرت جبرئیل امین کبھی بلا اجازت حاضر نہ ہوئے۔

ادب کہتا ہے تمنائیں دم توڑ رہی ہیں توڑ دیں، قلب آرزؤں کا مدفن بن رہا ہے بن جانے دو۔ لیکن ہرگز ہرگز انھیں پکارنے کی جسارت نہ کرو۔ وہ نہ جانے کس عالم محویت میں ہیں۔ یہ آواز کہیں ان کے خاطر ناز کو ٹھیس نہ پہونچائے۔ کہیں برہمیٔ مزاج کا سبب نہ بن جائے۔

دل میں کچھ ایسے ہی برق رفتار خیالات خواب اور سپنے کی طرح گذر رہے تھے کہ اچانک محبوب کردگار نے مڑ کر ابو حذیفہ کو دیکھا۔

حضرات! ابھی سیدنا ابو حذیفہ کی نوک زبان پر کوئی حرف تک نہ آیا تھا کہ رسولِ خدا نے فرمایا جاؤ۔ جاؤ ابو حذیفہ چلے جاؤ۔ اللہ تبارک وتعالےٰ نے تمہارے اور تمہاری ماں کی خطاؤں کو بخش دیا اور معاف کردیا

حضرات! مجھے بتایئے اگر علمِ غیب کسی عنقا کا نام نہیں ہے تو آخر پھر اسے علم غیب نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

میں منکرین علم غیب سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر آپ کی گڑھی ہوئی اصطلاح کا شریعت میں کچھ نام ہو تو بتانے کی زحمت فرمایئے۔

خدا غارت کرے اس جذبۂ رسول دشمنی کو! جس نے انھیں اتنا اندھا بنا دیا ہے کہ حقائق کے اعتراف سے چشم پوشی کرتے ہوئے غیرت تک نہیں آتی۔

حضرات! اب میں واقعات کا بے غبار آئینہ پیش کر رہا ہوں جس میں علم غیب کی دھندلی نہیں بلکہ روشن اور صاف وشفاف شکل وصورت نظر آئے۔

آیئے عہد رسالت کی ایک اور بات سماعت فرمایئے:

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابھی داخل اسلام نہیں ہوئے تھے۔ جنگ بدر میں شرکت کی غرض سے جب آنے لگے تو اپنی بیوی ام الفضل کو بلایا اور بالکل تنہائی میں لے جاکر کالی کوٹھری میں گڑھا کھود کے "سونے" کی ایک ڈلی دبا دیا۔ اور بہت ہی رازدارانہ طور پر بیوی سے کہا میں جنگ میں جا رہا ہوں اسے کوئی نہیں جانتا کہ انجام کیا ہو گا۔ دیکھو اگر میں زندہ واپس آگیا تو اسے نکال کر خرچ میں لاؤں گا اور اگر میں جنگ میں کام آگیا تو تم اسے نکال لینا اور خرچ کرنا غرضیکہ اسے دفن کرکے چلے آئے۔

غزوۂ بدر میں جو لوگ گرفتار کئے گئے تو ان میں سرکار کے چچا

حضرت عباس بھی تھے۔ سرورِ عالم نے صحابہ سے مشورہ لیا کہ اسیرانِ بدر کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ تو سیدنا ابوبکر صدیق نے عرض کیا، یارسول اللہ ان سے فدیہ (تاوان) لے کر انھیں رہا کر دیا جائے اور سیدنا فاروقِ اعظم نے عرض کیا یارسول اللہ! ان کو چھوڑا نہ جائے بلکہ ہم لوگوں میں جس کا جو عزیز ہو وہ اپنے عزیز کو قتل کر دے۔ مثلاً ماموں مسلمان ہے اور بھانجہ کافر تو ماموں ہی اپنے بھانجے کو قتل کرے کوئی دوسرا نہیں۔ باپ مسلمان ہو اور بیٹا کافر تو باپ ہی اپنے بیٹے کا قاتل بنے۔ بیٹا مسلمان ہو اور باپ کافر تو بیٹا ہی اپنے باپ کو قتل کرے۔

آقائے کائنات نے ابوبکر کی رائے کو ترجیح دی اور فرمایا کہ قتل نہ کیا جائے بلکہ ان سے فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اب اسیرانِ بدر کو تاوان کا حکم جاری کیا۔ کسی پر دوسو، کسی پر تین سو۔ غرضیکہ ایک دوسرے کا حال جانتے تھے اسی لحاظ سے فدیہ متعین ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ اب حضرت عباس کی باری آئی ان پر بھی فدیہ لگایا گیا جب حضرت عباس پر فدیہ لگایا گیا تو آپ نے عرض کیا میرے پاس کیا ہے جس سے میں فدیہ ادا کر سکوں۔ سرکار نے فرمایا سنبھل کر فرمائیں۔ پھر انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

پھر سرکار نے اپنا جملہ دہرایا۔ عباس نے پھر وہی کہا۔ تب آقائے دوعالم نے فرمایا کہ آپ نے آتے وقت ام الفضل کو سونے کی ڈلی نہیں دی ہے جسے کوٹھری میں دفن کر کے آئے ہیں۔

یہ سنتے ہی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہی انکشافِ رازان کے ایمان لانے کا داعیہ بنا۔

حضرات! آپ منکرینِ علمِ غیب سے دریافت کیجئے کہ تمہاری اصطلاح میں اسے کیا کہا جاتا ہے؟

ایک نکتہ:۔ ابھی ایک بات میں نے عرض کی تھی کہ اسیرانِ بدر سے متعلق سرکار نے صحابہ سے مشورہ طلب فرمایا۔ کہیں کوئی رسول دشمن یہ طعنہ نہ دے کہ رسول خدا اپنے فیصلہ میں صحابہ کی رائے کے محتاج تھے۔ معاذاللہ۔

حضرات! صورت حال یہ نہیں ہے۔ اللہ کے رسول کا مشورہ بطور احتیاج نہیں تھا بلکہ تعلیم امت کے لئے تھا۔ آج آقائے دو عالم مشورہ لے کر اپنی امت کو بتانا چاہتے ہیں کہ جب میں نبی ہو کر اپنے علاوہ سے مشورہ لیتا ہوں تو اگر کل تمہاری قوم تم کو اپنا سرپرست، پٹیل، سردار بنا دے تو خبردار! تم ڈکٹیٹر نہ بننا بلکہ تمہاری سرداری و بڑائی اسی میں ہے کہ ان سے بھی رائے لیتے رہنا تاکہ انفرادیت اور آمریت کا الزام نہ آنے پائے۔

نبی کے ہر اٹھتے ہوئے قدم میں تعلیم امت کا راز مضمر و پنہاں تھا۔ مجھے بتانا یہ تھا کہ اگر سرکار دوعالم عالم غیب نہیں تھے تو کیسے معلوم ہوا کہ سونا کہاں دفن ہے۔ ان واقعات وحقائق کے ہوتے ہوئے بھی علم غیب سے انکار زندہ مکھی ہضم کرنے کے مترادف ہے

حضرات! دور کی نہیں گھر کی بات سماعت فرمایئے: ایک بار سرورِ عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم حجرۂ مبارکہ سے باہر تشریف لے گئے حضرت سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا حجرہ ہی میں رونق افروز ہیں۔ اسی اثناء میں دروازے کی طرف حضرت عائشہ کی نظر پڑی دیکھا کہ سرکار حجرہ کی جانب تشریف لا رہے ہیں مگر اس حال میں کہ موسلا دھار طوفانی بارش ہو رہی ہے اور سرکار پانی میں شرابور ہو گئے ہیں اور اسی حال میں قدم بڑھائے جا رہے ہیں۔ حضرت عائشہ کے سر پر دوپٹہ نہیں تھا کھلے بالوں بہت عجلت میں دوپٹہ تلاش کیا وہ نہ مل سکا، سرکار

کی چادر اوڑھ لیا۔ بس اتنے ہی میں سرکار حجرہ عائشہ میں داخل ہوئے حضرت عائشہ آگے بڑھیں، تلوے پر ہاتھ رکھا، پنڈلیوں پر ہاتھ رکھا ہتھیلی دیکھا کندھا دیکھا۔ سرکار نے فرمایا: عائشہ یہ کیا ہو رہا ہے عرض کیا یا رسول اللہ ابھی ابھی میں نے اپنے حجرہ سے دیکھا کہ موسلا دھار طوفانی بارش ہو رہی ہے سرکار بھیگتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ تو میں بدن دیکھنا چاہتی تھی کہ بدن پر پانی کا کیسا اثر ہے۔ مگر یا رسول اللہ! میری حیرت کی انتہا نہیں ہے کہ آنکھ نے یہ دیکھا کہ سرکار بالکل بھیگے ہوئے ہیں مگر انگلیوں کو کہیں پانی کی تری تک محسوس نہیں ہوئی۔؟

سرکار نے فرمایا عائشہ! یہ تو بتاؤ تم نے کیا اوڑھ رکھا ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! عجلت میں ڈوپٹہ نہیں مل سکا تو سرکار کی چادر میں نے سر پر ڈال لی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سرکار جلوہ بار ہوں اور کھلے بالوں میں بیٹھی رہ جاؤں۔

سرکار نے فرمایا یہ تو برکت ہے میری چادر کی۔ عائشہ! یہ بادلوں کے گھن گرج والی بارش نہیں ہے بلکہ آج میرے ایک مقبول صحابی کا وصال ہوا۔ میں ان کی نماز جنازہ وغیرہ سے فارغ ہو کر آرہا ہوں۔ ان کی قبر پہ اللہ کی رحمتوں کی بارش ہو رہی ہے۔ یہ کوئی دنیاوی مادی بارش نہیں ہے عام آنکھیں جسے نہیں دیکھ پاتیں۔ میری چادر کی وجہ سے اسے تم نے دیکھ لیا۔

حضرات! جس کی چادر اوڑھ لینے سے کائنات روشن ہو جائے چونکہ وہ جسم مصطفےٰ سے مس ہو چکی ہے۔ پھر اس آنکھ کا عالم کیا ہو گا جس نے بے حجاب و بے پردہ ذات باری کو دیکھا ہو۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک

حضرات! عہد رسالت ہی کی ایک بات اور سماعت فرمائیں

تاریخ اسلام کا ایک بہت ہی مشہور واقعہ ہے کہ کفار مکہ نے سرکار کے قتل کی سازش سے متعلق بڑے بڑے انعامات متعین کئے کہ جو معاذاللہ سرکار کا سر قلم کرے گا اسے بیش بہا انعامات دیئے جائیں گے چنانچہ اسی لالچ میں جناب سراقہ نے سرکار دوعالم کا تعاقب کیا اور گھوڑا سرپٹ دوڑانا شروع کیا۔ اب گھوڑا گھوڑے سے قریب ہو رہا تھا، کہ سرکار نے زمین کو حکم دیا۔ اس نے سراقہ کے گھوڑے کو دبوچ لیا جتنی کہ اس کا قدم زمین میں دھنسنے لگا۔ اس نے معذرت چاہی۔ سرکار نے اشارہ کیا زمین نے چھوڑ دیا مگر انعام کی لالچ میں گھوڑا پھر دوڑایا۔ قریب پہنچنے پر پھر اشارہ کیا۔ زمین نے پھر اس کا قدم کھینچا۔ پھر اس نے معافی چاہی سرکار نے پھر خطا معاف کر دی۔

پھر آقائے کائنات نے انتہائی مسرت میں فرمایا کہ سراقہ میں تو تمہارے ہاتھ میں خزانہ کسریٰ سے سونے کا کنگن دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ جب عہد فاروقی میں ایک بار سراقہ بہت زیادہ بیمار ہوئے حالت دگرگوں ہوگئی آثار اچھے نہ تھے، زندگی کا سفینہ ہچکولے کھا رہا تھا تو یہ سن کر فاروق اعظم خود عیادت کو تشریف لے گئے۔ اور ایسے کلمات فرمائے جیسا کہ ایک قریب الموت سے کہا جاتا ہے۔ یہ سن کر سراقہ تڑپ اٹھے اور عرض کیا یا امیر المومنین! ابھی سراقہ کا آخری وقت نہیں آیا۔ میرے متعلق سرکار نے فرمایا ہے کہ سراقہ میں کسریٰ کے خزانہ سے تمہارے ہاتھ میں سونے کا کنگن دیکھ رہا ہوں۔ جب تک کسریٰ فتح نہ ہوگا۔ اور میرے ہاتھوں اس کے خزانہ سے سونے کا کنگن نہ آئے گا۔ اس وقت تک سراقہ کو موت نہیں آسکتی۔ زمین و آسمان بدل سکتے ہیں لیکن میرے مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں ٹل سکتا۔

چنانچہ کسریٰ فتح ہوا اور فاروق اعظم نے حضرت سراقہ کے

ہاتھوں میں سونے کا کنگن پہنایا۔ اس وقت سراقہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے اور اب انھیں یقین ہو گیا کہ اب اس دارِ فانی سے دارِ بقا کو جانا ہے چونکہ عالم غیب کی پیشنگوئی پوری ہو گئی۔

حضرات! صحابۂ کرام کو اس قدر سرکار کے عالم غیب ہونے کا یقین تھا مگر دو ورقی کتاب پڑھ کر پندرھویں صدی کا ملّا تراز دلئے بیٹھا ہے؟! افسوس اے نادانو! انھیں کا کلمہ پڑھو اور انھیں کا دامن نوچو ؎

اور تم پر میرے آقا کی عنایت نہ سہی،
نجدیو! کلمہ پڑھانے کا بھی احسان گیا؟

حضرات! عہد فاروقی کا ایک واقعہ اور سماعت فرمائیں شیر خدا علیٔ مرتضیٰ نے صبح ہوتے ہوئے اپنے بستر استراحت پر خواب دیکھا کہ آقائے دوعالم نے نماز فجر پڑھائی اور دعا کے بعد کچھ کھجوریں سرکار کی بارگاہ میں پیش کی گئیں۔ چنانچہ سرورِ عالم نے ان کھجوروں کو نمازیوں میں تقسیم فرما دیا۔ حتیٰ کہ علیٔ مرتضیٰ نے اپنے دہن مبارک میں اس کھجور کی مٹھاس محسوس فرمائی، جسے خواب میں کھایا تھا۔ اب حوائج و ضروریات سے فارغ ہو کر مسجد نبوی تشریف لائے۔ اور فاروق اعظم نے نماز فجر پڑھائی حسن اتفاق ہی کہئے کہ جیسے ہی فاروقِ اعظم نے دعا مانگی۔ ان کی خدمت عالیہ میں کچھ کھجوریں حاضر کی گئیں۔ اور آپ نے بھی تقسیم فرمانا شروع کر دیا جب علیٔ مرتضیٰ کی باری آئی تو آپ نے عرض کیا۔ ایک کھجور اور عنایت فرمائیں تو امیر المومنین فاروق اعظم نے فرمایا اگر اللہ کے رسول نے اور عطا فرمایا ہوتا تو میں بھی حاضر کر دیتا۔ میں ویسے ہی تقسیم کر رہا ہوں جیسا کہ آپ نے خواب میں رسول اللہ کو تقسیم کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

اَللّٰہُ اَکْبَرْ! خواب علیٔ مرتضیٰ اپنے بستر پر دیکھ رہے ہیں

اور امیر المومنین مسجد نبوی میں اس کی وضاحت کر رہے ہیں۔

حضرات! جن کے غلاموں کا علم اتنا وسیع تھا، انکے آقا کے علوم غیبیہ کا کیا حال ہوگا۔ اسی لئے تو میں عرض کرتا ہوں کہ ترازو اور پیمانہ مت سنبھالو۔ بس یہ کہہ کر گذر جاؤ کہ دینے والا خدا جانے۔ اور لینے والے مصطفےٰ جانیں! اسی میں عافیت ہے۔

حضرات! ایک واقعہ اور سماعت فرمائیے۔

حضرت مالک بن دینار کسی راہ سے گذر رہے تھے کچھ دور سے ایک بچہ کو دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ستّی کا ایک ٹکڑا ہے۔ ادھر اُدھر پلٹ کے دیکھ رہا ہے۔ کبھی ہنستا ہے کبھی روتا ہے۔ مالک بن دینار جب اسکے قریب آئے تو سوچا کہ اس سے سلام کریں یا بغیر سلام کئے گذر جائیں۔ خیال آیا بچہ ہی تو ہے اسے کیا سلام کرنا ہے۔ آگے بڑھ گئے۔ چند قدم بڑھتے ہی خیال آیا، کچھ بھی ہو مسلمان تو ہے۔ سلام کرنا چاہیئے۔ کچھ دور جاتے جاتے پلٹ آئے اور بچّہ سے کہا السلام علیک یا ایہا الطفل بچہ نے جواب دیا وعلیک السلام یا مالک بن دینار۔ حضرت مالک نے پوچھا تجھے کیسے معلوم، کہ میں ہی مالک بن دینار ہوں۔

بچّہ نے کہا آج نہیں جب عالم ارواح میں خداوند قدوس نے تمام ارواح کو اکٹھا کرکے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تھا۔ تو اس وقت آپ اور ہم سبھی تھے۔ میں تو اس وقت سے آپ کو پہچانتا ہوں، جب عالم تجرد میں پہچانتا تھا تو اب عالم اجسام میں ہم کیوں نہ پہچانیں گے۔

حضرت مالک بن دینار نے کہا بچے! تیری بات پسندیدہ معلوم ہوتی ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ نفس اور عقل میں کیا فرق ہے۔ بچے نے برجستہ جواب دیا جس چیز نے آپ کو سلام کرنے سے روکا تھا وہ آپ کا نفس تھا۔ اور جو چیز آپ کو سلام کرنے کے لئے کھینچ کر لائی وہ آپ کی عقل ہے۔

حضرت مالک بن دینار نے فرمایا، اگر کہو تو ایک بات اور دریافت کریں۔ بچّے نے کہا پوچھے۔ حضرت مالک نے پوچھا مٹی کا ایک ہی ڈھیلا ہے اسی کو دیکھ کر تم ہنستے بھی ہو اور روتے بھی ہو۔ آخر اس کا ماجرا کیا ہے؟

بچے نے کہا بات یہ ہے ہم خاکی ہیں اسی خاک سے ہمارا خمیر بنا ہے۔ جب یہ سوچتا ہوں کہ اچھا کام کروں گا تو بہشت میں جاؤں گا، تو جنت کے تصور سے مسکرا دیتا ہوں۔ اور جب یہ خیال آتا ہے کہ گناہ سے جہنم میں جائیں گے تو آنکھیں اس کے خوف سے اشکبار ہو جاتی ہیں، مالک علیہ الرحمہ نے فرمایا ابھی تو تم بچے ہو تم کو جہنم کا خطرہ کیسا؟

بچے نے کہا یہ تو سچ ہے لیکن اے مالک! کیا آپ نے گھروں کی ریت و رسم نہیں دیکھی؟ چولھے میں جب موٹی موٹی لکڑیاں جلائی جاتی ہیں اور وہ آگ نہیں پکڑتیں تو چھوٹی لکڑیوں کو جلا کر تب انھیں سلگایا جاتا ہے۔ میں یہی خیال کر رہا ہوں کہ کہیں آخرت میں بھی ایسا نہ ہو کہ انسانوں کے موٹے موٹے کندے جب نہ جل سکیں تو کہیں انھیں جلانے کی خاطر ہم جیسے چھوٹوں کو نہ جلایا جائے۔؟ بس اسی خطرے سے رو دیتا ہوں۔ اس کی باتوں سے مالک بن دینار بہت متاثر ہوئے۔

حضرات! جب بچے سے مالک بن دینار نے پوچھا کہ نفس، اور عقل میں کیا فرق ہے؟ تو بچے نے کہا جس نے سلام سے روکا وہ نفس تھا اور جو سلام کرنے کو لائی وہ عقل ہے۔

کوئی بتائے تو سہی آخر "مالک بن دینار" نے تو کچھ کہا نہیں تھا پھر ان کے نہاں خانۂ دل پر وہ کون سی شئی ہے جو مطلع ہو گئی۔

حضرات! اب مجھے کہہ لینے دیجئے! جب ایک نام لیوا بچہ دل کے دروازے سے جھانک لیتا ہے تو وہ نبی برحق جس کا علم ساری کائنات پر بھاری بھرکم اور وسیع سے وسیع تر ہے۔ بھلا اس کے علم مبارک، اور

علومِ غیبیہ کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟

حضرات! اور آگے بڑھئے اور سیدی امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الملفوظ میں درج ایک واقعہ کو سماعت فرمائیے

کسی دور کے ایک بزرگ تھے جن کی ولایت و کرامت کی شہرت بہت دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ خوش عقیدہ مسلمانوں کا دستور ہے کہ جب اور جہاں کہیں ایسے بزرگوں کا ذکر سنتے ہیں سر کے بل حاضر ہوتے ہیں اپنے وقت کے دو عالم بھی حاضر ہوئے۔ ان کی اقتدا میں نماز جمعہ پڑھی۔ نماز جہری تھی، قرأت سن کر دونوں مولانا کے دل میں خطرہ گزرا کہ یہ حضرت ولی و بزرگ تو ہو سکتے ہیں مگر قرأت ان سے اچھی تو ہم پڑھتے ہیں۔ دل کی بات تھی۔ آئی گئی ہو کے رہ گئی۔

صبح خانقاہ میں ناشتہ کے لئے دستر خوان بھی بچھ گیا۔ سارے مہمان حاضر مگر وہ دونوں مولانا غائب۔

اللہ کے ولی نے فرمایا ارے بھئی! میرے وہ دونوں مولانا کہاں گئے۔ انھیں بلاؤ۔ معتقدین نے عرض کیا، حضرت ان کے ساتھ تو بڑا غضب ہو گیا۔ فرمایا وہ کیا؟

متوسلین نے عرض کیا، وہ لوگ تالاب میں نہانے گئے تھے سارے کپڑے اتار کر کنارے رکھ دیئے اور اسی اثناء میں شیر آیا جو ان کپڑوں کو گدا بنائے بیٹھا ہے۔ شیر اس انتظار میں ہے کہ میری خوراک باہر آئے تو جاؤں اور مولانا حضرات اس انتظار میں ہیں کہ خطرہ کا سگنل اس سے ڈاؤن ہو تو نکلیں۔

آخر انھیں بلایا کیسے جائے حضرت پر جلال طاری ہوا۔ فرمایا: میرے مہمان کے ساتھ ایسا حادثہ کیوں پیش آیا۔

چنانچہ اسی کیفیت میں وہاں پہنچے تو سچ مچ دیکھا کہ شیر کپڑوں پر

بیٹھا ہوا ہے اور مولانا پانی میں ڈبکی لگا رہے ہیں۔ اللہ کے ولی نے شیر کے رخسار پر دو طمانچہ مارا اور ڈانٹ لگائی۔ اتنے میں شیر دم دبا کر آگے بھاگا۔ اب آپ نے فرمایا آپ لوگ باہر تشریف لائیے۔ جھڑے کی گھنٹی جاتی رہی۔ دونوں مولانا باہر نکلے۔ اور ناشتہ کے لئے چل پڑے۔ چلتے چلتے اللہ کے ولی نے فرمایا، یہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن آپ لوگ مجھ سے اچھا پڑھتے ہیں لیکن ہمارا اور آپ کا فرق یہ ہے کہ آپ لوگوں نے زبان سیدھی کی ہے اور ہیں نے اپنا دل سیدھا کیا ہے۔ دونوں کا فرق ظاہر ہے جس نے زبان سیدھی کی وہ شیر سے ڈرتا ہے۔ اور ہیں نے دل سیدھا کیا شیر اس سے ڈرتا ہے۔

حضرات! بلا جھجک آپ لوگ فرمائیے کہ وہ خیال تو مولانا کے دل میں گذرا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ پیشانی پر لکھا ہو تو پڑھا جائے اور دل پر گوشت و پوست کا پردہ پڑا ہے۔ لہذا اسے کیسے پڑھا جائے؟

حضرات! دل پر لکھا نہیں جاتا وہ ایک کیفیت ہے جو غیر مرئی ان دیکھی شئ ہے۔ جسے آنکھ کسی حال میں دیکھ نہیں پاتی مگر اللہ کا ولی جو محسوسات و مدرکات کے ماورا ہے اسے بھی نورِ باطن سے دیکھ لیتا ہے۔ حواس ظاہر اور عقل کے پردے میں وہ قوت ہے جو مغیبات پر مطلع ہوتی ہے۔ جب ان کے غلاموں کی وہ قوت کہ گوشت پوست، چمڑے ہڈی کو چیرتے پھاڑتے تہ بہ تہ کو دیکھ آئے تو جن کے فیضان کرم کا یہ نتیجہ ہے تو اس مالکِ دارین، قاسم العلوم کی پرواز کی کوئی کیسے حد متعین کرسکتا ہے۔

ارے یہ اڑان و پرواز تو ایسی ہے کہ شہپر جبرئیل نہ پرواز کرسکے اور ایک وہ آنکھ کہ تمام مغیبات کا متن دیکھ سکے۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک

مُحمدٌ رسولُ اللہِ

اس عنوان

پر مختلف اسکول اور مکاتب فکر کے اپنے اپنے خیالات و نظریات ہیں۔ عقل کا پرستار اور الحاد و زندقہ کا مارا ہوا ذہن اپنی قیاس آرائیوں کے تحت چند در چند سوالات کرتا ہے۔

آج کی تقریر میں آپ حضرات کو انھیں سوالات کو سمجھنا اور اس کے جوابات حاصل کرنا آپ کی اپنی ذمہ داری ہے۔

اگر خدانخواستہ کسی آنکھ پر تعصب، ضد اور ہٹ دھرمی کی عینک لگی ہو۔ اب اسے اتار دیں۔ تاکہ حقائق اور واقعات کی روشنی میں "عنوان" کا ہر ہر خدوخال اور اس کا گوشہ گوشہ روشن ہو جائے

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد ۰ فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۰ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

محمد رسول اللہ

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے "محمد رسول اللہ" اس سلسلہ میں مختلف اسکول اور مختلف مکاتب فکر کے جداگانہ سوالات ہیں میں سب سے پہلے ان کے سوالات آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ پھر تدریجًا ان کے جوابات حاضر کروں گا۔

جیسے ہی میں نے کہا "محمد رسول اللہ" تو ایک ایسا شخص جو الحاد و زندقہ کا مارا ہوا ہے، مغربیت کی آغوش میں اس نے تربیت پائی ہے۔ آزاد فضاؤں میں اس کی ذہنی نشو و نما ہوئی ہے، مذہب بیزاری اسکی سرشت و فطرت ہے، اخلاقی گراوٹ اس کی فطرت ثانیہ ہے۔ اس نے آوازدی مشتاق نظامی سے کہدو! ہمارے پاس عقل کی لائٹ ہے، عقل کی روشنی ہے، عقل کی بہتات و کثرت ہے، عقل کی توانائی ہے، عقل کا سرمایہ اور پونجی ہے۔ عقل کی فراوانی ہے۔ غرضیکہ ہم عقل و خرد والے ہیں۔ رات کو دن نہیں کہتے اور دن کو رات نہیں کہتے۔ پھول و کانٹے میں تمیز کرنا جانتے ہیں۔ پھول کو کانٹا نہیں کہتے ہیں۔ اور کانٹے کو پھول نہیں کہتے۔

مغز اور چھلکے کا فرق ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ مغز کو مغز کہتے ہیں اور چھلکے کو چھلکا۔

اب تو اس کائنات پر عقل ہی کی حکمرانی ہے۔ حتیٰ کہ چاند و سورج بھی ہماری دسترس سے باہر نہیں۔ لہٰذا مشتاق نظامی سے کہدو! ہمارا معاملہ ہماری عقل کے سپرد کردے۔ ہم اپنے کاروبار زندگی میں صرف عقل کی رہنمائی چاہتے ہیں۔ ہماری عقل ہمارے لئے بہت کافی ہے۔ لہٰذا ہم کسی کو نبی و رسول مان کر ان کے نقش قدم پر چلنے کو تیار نہیں۔ ہماری رہبری و دستگیری کے لئے ہماری

عقل مشعل راہ ہے اسلئے کسی کو نبی و رسول ماننے کو تیار نہیں۔
پھر میں نے کہا "محمد رسول اللہ" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ یہ سنتے ہی دوسرا اسکول بولا مشتاق نظامی سے کہدو۔ ہم نے یہ مانا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ مگر رسول، خدا اور بندوں کے درمیان وسیلہ ہی تو ہوتا ہے۔ لہٰذا خدا کی طرف سے رسول کے ہاتھوں ہمیں جو ملنا تھا وہ ہمیں مل گیا قرآن ہم نے پایا، نماز پائی، حج مل گیا، زکوٰۃ کے مسائل معلوم ہو گئے فرائض و واجبات پائے، سنن و نوافل ملے، مباح و مستحبات پائے، جائز و ناجائز، حلال و حرام، مکروہ تحریمی و تنزیہی، دستور حیات، قانون زندگی۔ غرضیکہ مہد سے لحد تک کے جو قوانین ملنے تھے وہ سب کے سب ہم کو مل گئے۔ حتیٰ کہ ملک الموت، منکر نکیر، قبر و حشر، قیامت و پل صراط، جنت و دوزخ کے احوال ہمیں ملے ہیں، ہم اس کی قدر کریں گے، اس کا احترام کریں گے نمازیں پڑھیں گے۔ نمازیں تو اتنی زیادہ پڑھیں گے کہ دوسرے لوگ ہمارے مقابل اپنی نمازوں کو حقیر سمجھیں گے، لمبی داڑھیاں رکھیں گے، لمبا کرتا بھی پہنیں گے۔ پائجامہ ٹخنے سے اونچا اور گھٹنے کے قریب والا پہنیں گے۔ حج کے ارکان و مناسک بھی ادا کریں گے۔ اگر عالمی اجتماع سے رقم بچ گئی تو زکوٰۃ بھی ادا کریں گے۔ فرائض و واجبات کی پابندی کریں گے۔ کلمۂ طیبہ اکیلے ہی نہیں دوسروں کو بھی پڑھائیں گے۔

قرآن کریم کی تلاوت بھی کریں گے مگر واضح رہے کہ قرآن تو پڑھیں گے مگر جن ہاتھوں سے قرآن ملا ہے اس کی دست بوسی کو ہم تیار نہیں، انھیں کلیجے سے لگانا ہمارا مزاج نہیں۔ ہمارے عقیدے میں نبی ایک وسیلہ ہے مقصد نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں خدا کی طرف سے جو ملنا تھا وہ ہم کو مل گیا۔ اب ہم کو "نماز" روزے سے سروکار ہے جس ذریعہ سے ملا ہے اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیئے۔
پھر میں نے کہا "محمد رسول اللہ" محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم اللہ کے

رسول ہیں۔

یہ سنتے ہی تیسرا اسکول بولا مشتاق نظامی سے کہہ دو ہم نے مانا کہ محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں ،مگر ہم انھیں رسول ہی کی حد تک تسلیم کرتے ہیں۔ عالم غیب نہیں مانتے ،اختیار والا نہیں مانتے ،قدرت والا نہیں مانتے ،تصرف والا نہیں مانتے ،ان کی حیات تسلیم نہیں کرتے ،شفیع محشر اور ساقی کوثر نہیں مانتے جبکہ وہ اپنی بیٹی حضرت فاطمہ کے کام نہیں آسکتے تو ہمارے کام کیا آئیں گے۔ اب وہ زندہ نہیں ۔چونکہ مر کر مٹی میں مل گئے۔ لہٰذا نہ تو اب ان کو پکارا جائے ،نہ ہی یا رسول اللہ کہا جائے ،نہ تو ان سے مدد مانگی جائے ، اور نہ ہی وسیلہ بنایا جائے ،بس وہ ہماری ہی طرح ایک معمولی بشر تھے۔ ہمارا اور ان کا تو بس اتنا ہی فرق ہے کہ ان پر وحی آتی تھی ہم پر نہیں آتی۔ ان کا مرتبہ ہم سے کچھ بڑا تھا ،لہٰذا بڑا بھائی جیسا ان کا مرتبہ ہے۔

حضرات! میں نے ابتدائے گفتگو میں آپ سے عرض کیا تھا کہ جب کہا جاتا ہے "محمد رسول اللہ" تو مختلف اسکولوں کے اپنے اپنے نظریات ،خیالات اور اعتراضات ہیں۔ چنانچہ میں نے ان میں سے تین مکتبۂ فکر کا ذکر کیا ہے۔

آپ جیسے دانشوروں کی سخن فہمی سے ہم پر امید ہیں کہ آپ نے سوالات کو بخوبی سمجھ لیا ہوگا۔ لہٰذا اب آپ ان کے جوابات کو ذہن و فکر میں نوٹ کرنے کو تیار ہو جائیں۔

جواب:

حضرات! پہلے اسکول کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے پاس عقل کی لائٹ ہے جو ہماری رہبری و رہنمائی کے لئے ہر شعبۂ زندگی میں کافی و وافی ہے۔ اس لئے ہمارے معاملات زندگی کو ہماری عقل پر چھوڑ دیا جائے۔ ہم کو اس پر مجبور نہ کیا جائے کہ ہم کسی کو "نبی و رسول" مان ہی کر زندگی بسر کریں جبکہ ہم ان کا سہارا

لئے بغیر بھی زندگی گذار سکتے ہیں۔

حضرات! ان لوگوں سے ہمارا کہنا ہے کہ اے عقل کے میدان میں ریس کھیلنے والو! یہ ہم نے کب تم پر الزام لگایا ہے کہ تم عقل والے نہیں ہو۔ یا کب ہم نے تم کو یتیم العقل اور علم سے نابلد کہا ہے۔؟ ہم تو خود بھی بہت دور تک مادیات کی دنیا میں تمہاری دانشوری اور سوجھ بوجھ کے قائل ہیں۔ کائنات کو تمہاری شعبدہ بازیوں نے حیرت کدۂ عالم بنا دیا ہے۔

اب تو تم دو ٹانگ سے چلنے کے بجائے بغیر پر کے اڑنا چاہتے ہو مگر واضح رہے کہ اس اعتراف و اقرار کے باوجود ہم کسی احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہیں۔ لہٰذا اب تم ہمارا پیغام سن لو! تمہارا یہ کہنا کہ ہم اپنے سارے معاملاتِ زندگی کو عقل ہی سے حل اور طے کر لیں گے۔ آج کی دنیا میں اس سے زیادہ بے عقلی کی اور کوئی دوسری بات نہیں ہے۔

اے لوگو! یہ سراسر فریب اور دھوکہ ہے۔ حقائق سے چشم پوشی کی اس سے زیادہ گندی اور گھناؤنی مثال نہیں مل سکتی۔

اب اگر زحمت نہ ہو تو ذہن و فکر کی حاضری کے ساتھ تشریف رکھیے اور آنے والی گفتگو کو سماعت فرمائیے۔

حضرات! ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ عقل کا چراغ اسی لئے ہے کہ تاریکی میں اجالے اور روشنی کا کام دے مگر مجھے کہہ لینے دیجئے کہ اس کے کچھ حدود متعین ہیں۔ مثلاً آنکھ اس لئے ہے کہ اس سے دیکھا جائے اور یقیناً دیکھتی ہے اور دیکھنے ہی کے لئے ہے مگر یہ آنکھ جہاں دیکھتی ہے وہیں دھوکا بھی کھاتی ہے۔ یعنی یہ آنکھ فریب خوردہ بھی ہے اور فریب دہندہ بھی، فریب کھاتی بھی ہے اور فریب دیتی بھی ہے۔ مثلاً آپ چھوٹے بچے کے ساتھ سفر کر رہے ہوں اور فرنٹیئر میل اپنی برق رفتاری سے گذر رہا ہو، اسی اثنا میں بچہ شور مچائے ابو درخت بھاگے جا رہے ہیں، مکان بھاگا جا رہا ہے

تو کیا سچ مچ درخت بھاگا جا رہا ہے۔ ہرگز نہیں۔ میرے دوست! یہی آنکھ کا فریب اور دھوکا ہے۔ یعنی ٹرین کی رفتار اتنی تیز ہے کہ جس شئے پر نگاہ پڑتی ہے وہ نگاہ کی گرفت میں نہیں آتی۔ نگاہ پڑتے ہی ٹرین کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

ہو سکتا ہے آپ میں سے کوئی صاحب یہ فرمائیں یہ تو ایک بچے کی آنکھ ہے اگر دھوکا کھا گئی تو کیا ہوا؟ لہٰذا آپ اب دوسری مثال لیجئے کہ آپ جیسے بزرگوں کی آنکھ بھی دھوکا کھاتی ہے۔

مثلاً آپ ایک ایسی ٹرین پر بیٹھے ہوں جو پلیٹ فارم پر کھڑی ہو اور اسی کے سامنے دوسرے پلیٹ فارم پر دوسری ٹرین کھڑی ہو اب آپ اپنی ٹرین نہ دیکھئے اسی ٹرین کو دیکھئے جو دوسرے پلیٹ فارم پر ہے۔ اچانک وہ دوسری ٹرین چل پڑی مگر آپ کو ایسا محسوس ہوگا، کہ میری ہی ٹرین چل رہی ہے۔ یعنی چل وہ رہی ہے مگر آنکھ کہتی ہے کہ اپنی ہی گاڑی چل رہی ہے۔ میرے دوست! یہ آنکھ کا فریب نہیں تو اور کیا ہے اگر اب بھی اطمینان نہ ہوا ہو تو ایک تیسری مثال لیجئے۔

آپ سیدھی ریلوے لائن پر کھڑے ہو جائیں۔ کیا آپ کھڑے ہو گئے؟ ہاں کھڑے ہو گئے۔ قربان جائیے۔ ایسا بھی کیا کھڑا ہونا ہے بیٹھے ہمارے سامنے ہیں اور کہتے ہیں ریلوے لائن پر کھڑے ہو گئے! ایک بہت ہی حسین ولطیف قہقہہ۔

اچھا پھر وہیں آجائیے۔ گویا آپ ایک ایسی ریلوے لائن پر کھڑے ہو گئے۔ جو بالکل سیدھی ہے اسمیں کوئی کجی نہیں، ٹیڑھی میڑھی نہیں ہے اب بتدریج ان دونوں پٹریوں کو دور تک دیکھنے کی کوشش کریں تو کچھ دور تک تو آپ کو ایسا نظر آئے گا کہ دونوں پٹریاں الگ الگ ہیں مگر جیسے جیسے بُعد ہوتا جائیگا اور دوری بڑھتی جائیگی تو پھر ایسا نظر آئیگا

کہ دونوں لائنیں ملتی جا رہی ہیں۔ حتی کہ ایک مقام ایسا آئے گا جہاں آنکھ فیصلہ کر دیگی کہ دونوں پٹریاں مل گئی ہیں۔

میرے بزرگو! جیسے ہی آنکھ نے کہا دونوں پٹریاں آپس میں مل گئیں بس ویسے ہی عقل نے شعور و آگہی کا طمانچہ مارا کہ نادان پٹریاں نہیں مل گئیں، بلکہ وہاں پہنچ کر تیرے فیصلے کی قوت بیکار ہو چکی ہے۔ اب یہاں بصارت نہیں بصیرت چاہیئے۔

بزرگو اور دوستو! معلوم ہوا آنکھ دیکھنے کے لئے ہے لیکن جہاں آنکھ نہیں دیکھ پاتی، وہاں عقل دیکھا کرتی ہے۔ گویا جہاں آنکھ کی پہنچ نہیں، وہاں عقل کی رسائی ہے۔ اسے یوں بھی تعبیر کر لیجئے جہاں آنکھ تھک کر بیٹھ گئی وہاں سے عقل نے رخت سفر باندھا۔ جو کسی کی منتہا ہے وہی کسی کی ابتدا۔

لہٰذا اے بزرگو! مجھے کہہ لینے دو جس طرح آنکھ دیکھنے کے لئے ہے مگر جہاں آنکھ نہیں دیکھ پاتی اسے عقل دیکھا کرتی ہے مگر یہ تو بتاؤ! جہاں عقل کے جھروکے اور دریچے بند ہو جائیں، جہاں عقل لنگڑی لولی ہو جائے، جہاں عقل مفلوج ہو جائے، جہاں عقل کی لائٹ مدھم ہو جائے جہاں عقل کا چراغ بجھ جائے، عقل کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہو، عقل جہاں سپر ڈالدے، جہاں عقل اپنی بےچارگی اور نارسائی کا اعتراف کرے اس کے آگے کون دیکھ سکتا ہے؟

یاد رہے یہی وہ مقام ہے جہاں نگاہِ نبوت دیکھا کرتی ہے، نگاہِ رسالت دیکھا کرتی ہے، نگاہِ مصطفٰے دیکھا کرتی ہے، اس لئے اے عقل پر غرور کرنے والو، ایک ایسا بھی مقام آئے گا جہاں عقل کے سارے پرستار بیک آواز پکاریں گے۔ محمد رسول اللہ، آپ اللہ کے رسول ہیں۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم اب عقل کام نہیں آرہی ہے، اب تم کام آجاؤ۔ تم سہارا دیدو تم دستگیری کرو، تم رہنمائی کرو۔ اب تمہارے بغیر کاروان زندگی آگے

نہیں بڑھ سکتا۔ ہم نے تو اسی کو سب کچھ سمجھا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ

ع ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں

جہاں ہم اب سے پہلے تھے تو کنوئیں کے مینڈک تھے، تالاب کی مچھلیاں تھے مگر تمہارے نقش قدم میں تو نہ جانے کتنے عالم پنہاں ہیں۔ اب یہاں سے ہماری عقل کا کام نہیں ہے اب تم کہو اور ہم سنیں، تم پڑھاؤ ہم پڑھیں تم سکھاؤ ہم سیکھیں، تم راہ دکھاؤ ہم چلیں۔ اب انگلی تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ ہم طفل مکتب ہیں تم دانائے کل ہو، ہم زمین نہ دیکھیں تم آسمان دیکھو، اور ماورائے آسمان دیکھو، ہم بندے کو نہ دیکھیں تم خدا کو دیکھو، ہم کچھ نہ دیکھیں تم سب کچھ دیکھو۔ چنانچہ انسانیت چیخ اٹھی، پکار اٹھی محمد رسول اللہ اے محمد مصطفیٰ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

حضرات! میں نے سمجھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی گوشہ تاریک اور پردۂ خفا میں رہ گیا ہو تو لیجئے ہم اسے دوسری طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ آپ اندھیرے سے اجالے میں آجائیں۔

حضرات! میں نے عرض کیا کہ آنکھ دیکھنے کے لئے ہے مگر جہاں آنکھ نہ دیکھے وہاں عقل دیکھے، اور جہاں عقل نہ دیکھے وہاں نگاہِ نبوت دیکھے جہاں عقل کا چراغ بجھ جائے وہاں شمع رسالت کام آئے۔

اب اس سلسلہ میں عقل کے ماروں کا ماضی ملاحظہ فرمائیں: یہ صحیح ہے آنکھ دیکھنے کے لئے ہے مگر اپنے حدود میں دیکھتی ہے، ماورائے حدود نہیں دیکھ سکتی۔ پیارے آنکھ دیکھنے کے لئے ہے مگر کبھی کبھی اس کا قدم ڈگمگا جاتا ہے۔ اب اس کو اس طرح سمجھئے۔ مثلاً،

ایک بچہ جس نے ابھی خاکدان عالم میں قدم رکھا۔ مشکل سے چند منٹ کا ہے لیکن ماں کی ممتا کا کیا کہنا۔ اس نے پیار سے گود میں لیا اور اپنی

چھاتی بچے کے منھ میں دیدیا۔ ماں کی چھاتی پاتے ہی اس نے دبایا، چوسا اور دودھ سے اپنا پیٹ بھرلیا۔

بتاؤ اور صحیح صحیح بتاؤ، بچے کو کس نے بتایا کہ یہاں تیری خوراک ہے۔ ابھی تو صحیح معنوں میں وہ سُنتا بھی نہیں ہے۔ سنتا ہے تو سمجھتا نہیں ہے اس قابل نہیں کہ کسی مکتب و مدرسہ میں داخل کیا جائے۔ کسی استاد کے سامنے بٹھایا جائے، اسے کچھ سکھایا پڑھایا جائے۔ نہ بول سکتا ہے، نہ پڑھ سکتا ہے، نہ سمجھ سکتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کی حکمت بالغہ غمازی کر رہی ہے کہ اے لوگو! یہ لکھانے، پڑھانے اور سکھانے کا مقام نہیں ہے بلکہ جس پروردگار نے زندگی دی ہے اسی نے اپنی فیض بخشیوں کے سبب زندگی بھی عطا فرمادیا ہے۔ گویا یہ بچہ اسی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے کہ ماں کی چھاتی پاتے ہی اس سے اپنی خوراک حاصل کرے اور اپنا پیٹ بھرلے۔ یہاں کوئی پڑھاتا لکھاتا نہیں بلکہ اس کی فطرت خود گدگداتی، اشارہ کرتی اور شعور بخشتی ہے کہ یہیں تیرا سب کچھ ہے۔ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی فطرت بہر حال یہ جانتی ہے کہ خوراک یہیں سے حاصل ہوگی۔

ذرا اس فطرت کی نزاکت ملاحظہ فرمائیں کہ اگر بچے کو ماں کی چھاتی مل بھی جاتی مگر وہ نہ دباتا اور نہ چوستا تو پھر بھی مدعا حاصل نہ ہوتا۔ یہ دبانا اور چوسنا فطرت ہی کا بخشا ہوا شعور ہے۔ اگر فطرت کو اس حد تک شعور نہ ہوتا تو بچہ ایڑیاں رگڑ کے تڑپ تڑپ کر مرجاتا، پھر زندگی دینے کا حاصل ہی کیا ہوتا۔؟

میں نے یہی عرض کیا تھا کہ فطرت کی نزاکت ملاحظہ فرمائیں کہ ماں دباکر دودھ نہیں نکالتی بلکہ بچہ خود اسے دباتا ہے اور چوستا ہے۔ یہی ہے فطرت اور فطرت کا وہ شعور جس پر بچہ پیدا کیا گیا ہے۔

اب ذہن کو حاضر کیجئے۔ اور گفتگو کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کیجئے۔

حضرات! جس طرح آنکھ دیکھنے کے لئے ہے مگر وہ دھوکا کھاتی ہے اسی طرح بچہ ایک فطرت پر پیدا کیا گیا ہے مگر اس بچے کی فطرت بھی ٹھوکر کھاتی ہے مثلاً چھ برس کے بچے کو ایک گیند دیجئے تو وہ بچہ اس سے کھیلے گا۔ زمین پر دوڑ لے گا۔ فضاؤں میں اچھالے گا، لیکن یہی گیند چھ مہینے کے بچے کو دیجئے تو وہ بچہ اس سے کھیلے گا نہیں، بلکہ اسے منھ میں لے کر چوسے گا۔ گلاب کا پھول چھ مہینے کے بچے کو دیجئے تو وہ اسے چوسے گا۔ وقِس علیٰ ذالک۔

بس ایسے ہی روزمرہ کی چلتی پھرتی متعدد مثالوں سے سمجھتے جائیے بس یہی حال آنکھ کا ہے۔ اپنے حدود میں کم و بیش سب کچھ دیکھے مگر جہاں آنکھ بے بس ہو جائے تو وہاں عقل دیکھے۔ اور جہاں عقل بھی ساتھ چھوڑ دے تو نگاہِ نبوت اور شمعِ رسالت کی دستگیری کام آئے۔ اسلئے ہزار عقل کی بھتات و کثرت والا کیوں نہ ہو، کچھ ایسے بھی مقامات آئیں گے جہاں انسانیت کی پیاسی روح پکارے گی محمد رسول اللہ ﷺ۔

حضرات! اس مختصر سی تمہید کے پس منظر میں اب جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس پر دھیان دیجئے۔

یہ گفتگو اگر ذہن و فکر میں جگہ بنا چکی ہو تو عقل کے مارے ہوئے انسانوں کا ماضی دیکھئے تاکہ ان کی یادہ گوئی کی قلعی کھل جائے۔

حضرات! یہ وہی عقل کا مارا ہوا انسان ہے جب خدا کی تلاش میں چلا تھا تو اس کا کل سرمایہ عقل ہی کی پونجی تھی۔ اسی چراغ و لالٹین کے سہارے خدا کی تلاش میں سرگرداں تھا، مارا مارا پھر رہا تھا۔ آپ پر یہ حقیقت واضح رہے کسی ان دیکھی طاقت کی تلاش انسان کی فطرت میں ودیعت ہے اگر ایسا نہ ہو تو اقرار توحید کی تکلیف تکلیف مالایطاق ہو جائے گی۔ اسی لئے خواہ کوئی پیامی آئے یا نہ آئے۔ کسی پیغمبر کا پیغام پہنچے یا نہ پہنچے، مناظرِ قدرت

کے سہارے اس کے لئے اقرار توحید ضروری ہے۔

آفتاب کا طلوع و غروب، صبح و شام، رات و دن کا ہیرا پھیرا، چاند کا گھٹنا بڑھنا، ہلال نو اور بدر کامل ہونا، موسم کی تبدیلی، سپیدۂ سحر کی دل آویزی، قوس و قزح کی رعنائی، ہواؤں کی سنسناہٹ، دریا کی روانی، سمندر کی طغیانی، موجوں کا اتار چڑھاؤ (مد و جزر) غنچوں کا تبسم، کلیوں کی سکراہٹ پھولوں کا قہقہہ، بادل کی گرج، بجلی کی تڑپ، زمین کی وسعت، پہاڑ کی اونچائی اور اس کی صلابت، آسمان کی بلندی، جگنو کی روشنی، آبشاروں کی روانی، ستاروں کی چمک اور کہکشاں کی دمک یہ سب ایسے مناظر قدرت ہیں کہ کوئی پیام پہنچے یا نہ پہنچے، کسی رسول کی بعثت کی بشارت ہو یا نہ ہو۔ بہر حال ان مناظر قدرت کو دیکھ کر اسے دل کی گہرائیوں سے لا الٰہ الا اللہ پڑھنا ہے اور اقرار توحید کرنا ہے۔

لیکن اس عقل کے مارے ہوئے انسان کی بے بضاعتی اور بے مائگی دیکھئے جو صرف عقل ہی پر اعتماد و بھروسہ کرتا ہے۔ وہ اسی عقل کی لائٹ کو لے کر خدا کی تلاش میں نکلا تھا۔ بیچارگی کا یہ عالم کہ خدا کو تو نہ پاسکا، البتہ مناظر قدرت میں الجھ گیا۔ آیات و نشانیوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ کسی نے آفتاب کو سجدہ کیا تو کسی نے دریا و سمندر کے سامنے پیشانی جھکائی، کسی نے پتھروں کی پوجا کی، تو کسی نے آگ کو دیوی مانا اور کسی نے درختوں کو خدا سمجھا غرضکہ یہ سب کے سب "عقل" ہی کے تو سرمایہ دار تھے۔ انھیں صرف اپنی عقل ہی پر تو اعتماد و بھروسہ تھا، وہ اپنا کاروبار زندگی عقل ہی سے تو حل کرنا چاہتے تھے غرضکہ عقل کا ٹمٹماتا چراغ لے کر یہ انسان گلی گلی کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ در بدر مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس کی بے عقلی، بے کسی و بے چارگی دیکھئے کہ تلاش خدا کی ہے اور مخلوقات کے طلسمات و عجائبات میں الجھا ہوا ہے۔

اپنی پیشانی کی عظمتوں کو بھول بیٹھا ٹھیک اس عالم میں خدا نے

ہند دل پر کرم فرمایا۔ اے نادانو! مجھے صرف عقل ہی کے سہارے نہیں ڈھونڈا جاتا بلکہ اسے ڈھونڈو جس نے مجھے ڈھونڈا ہو، اسے تلاش کرو جس نے میری تلاش کا ڈھنگ سکھایا ہو، اس کا پتہ لگاؤ جسے میرا پتہ مل گیا ہو، اس کے در پر جاؤ جہاں پہنچ کر میرا سراغ مل سکے! اس کے آستانے پر جاؤ جہاں میرے ملنے کی آس بندھ سکے۔

اے غلط انسانو! رہبری کے لئے اس کا ہاتھ پکڑو جس کے ہاتھ کو میں نے اپنا ہی ہاتھ کہا ہے۔ اس کے نقش قدم پر چلو کہ جس نے جہاں اپنا تلوار رکھ دیا ہو میں نے اس سرزمین کی قسم یاد کی ہو۔ اجی! اس کا چہرہ دیکھو جسمیں میرا جلوہ نظر آئے، اس کی گلی میں پھیرے لگاؤ جہاں میری تجلی برس رہی ہو۔ اس سے ملو جس کے ملنے سے میں مل جاؤں بس انسان چونکا، آدمیت پھڑک اٹھی، انسانیت بیدار ہوئی، عقل کا نشہ ہرن ہو گیا، دل کا دروازہ کھل گیا۔ سب نے ایک زبان ہو کر پکارا:

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

دل کو تھاما، ان کا دامن تھام کے
ہاتھ اپنے دونوں نکلے، کام کے

یعنی اے محمد مصطفیٰ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اللہ کے رسول ہیں! اب عقل کا چراغ بجھ گیا ہے۔ انسانیت روندی جا رہی ہے۔ آدمیت پائمال ہو رہی ہے، انسانی عزّ و وقار کوڑیوں کے دام نیلام ہو رہا ہے انسانیت در بدر ماری ماری پھر رہی ہے۔ اب تمہارا پتہ لگ گیا ہے تمہارا سراغ لگ گیا ہے۔ اب تم کام آجاؤ، تم سہارا بن جاؤ۔ ہم نے غلط سمجھا تھا ہم نے عقل پر غلط اعتماد کیا تھا۔ ہم نے بغیر سوچے سمجھے اس پر بھروسہ کر لیا تھا۔ مگر اب عقل کا بھرم کھل گیا۔

لہٰذا اب اس اعتراف خطا اور احساس ندامت کے بعد اے

محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنا دستِ کرم بڑھاؤ، اپنی کالی کملی میں پناہ دو۔ آج محسوس ہوا تم انسانیت کی آخری پناہ گاہ ہو۔ اگر یہ ٹھکانہ بھی ہاتھ نہ آیا تو ہم کہاں جائیں گے۔ گویا انسانیت بھکاری بن کر آستانۂ نبوت پر کھڑی ہے ؎

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم !
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغ سکندری

لہٰذا اے دوستو! ان حقائق کی روشنی میں اب اس کا اعتراف ناگزیر ہو گیا کہ جہاں عقل نہ کام آئے وہاں نگاہِ نبوت کام آئے گی اس لئے الحاد و زندقہ کے مارے ہوئے ذہنوں تک ہمارا یہ پیغام حق پہنچا دو کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم اپنا کاروبار زندگی عقل سے حل کر لیں گے خواہ وہ ہمارے معاش کا مسئلہ ہو یا معاد کا۔ یہ ایک ایسا خواب اور سپنا ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

اسی بنیاد پر میں نے عرض کیا تھا کہ کسی کا یہ کہنا کہ ہم اپنے سارے معاملات عقل کی روشنی میں نمٹ لیں گے آج کی دنیا میں اس سے زیادہ بے عقلی کی کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی۔

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں اس کی ہلکی سی مزید تشریح کر دینا چاہتا ہوں تاکہ انشراح صدر میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

دوستو! میں نے عرض کیا ہے کہ جہاں آنکھ نہ دیکھے وہاں عقل دیکھے لیکن آنکھ، آنکھ کا بھی فرق ہے ملاحظہ فرمائیے:

آخر آپ حضرات بھی قبرستان سے گذرے ہوں گے کیا آپ لوگوں میں سے کسی نے صاحبِ قبر کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے؟ اگر کوئی ایسا آدمی مجمع میں بیٹھا ہو تو کھڑا ہو جائے۔ تاکہ ہم لوگ اس کی زیارت کر کے وہاں کا حال دریافت کر سکیں۔؟

معلوم ہوا کہ ہم قبر کے قریب سے گذرے تو مٹی کا ڈھیر دیکھا۔ لیکن میرے سرکار دو قبروں کے قریب سے گذرے تو اچانک کھڑے ہوگئے اور کھجوروں کی شاخ منگوا کر اس کے دو ٹکڑے کئے اور ان دونوں ٹکڑوں کو علیحدہ علیحدہ دونوں قبروں پر نصب فرما کے اپنا دست کرم اٹھا دیا۔ پھر آگے بڑھے: صحابہ کرام نے عرض کیا، یارسول اللہ! ہم نے تو دیکھا سب کچھ مگر سمجھا کچھ بھی نہیں؟ سرکار نے فرمایا، دونوں صاحب قبر بلکے درجے کے عذاب قبر میں مبتلا ہیں ایک ان میں سے چغلی کھاتا تھا اور دوسرا پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہ کرتا تھا۔

عذاب میں مبتلا دیکھنا یہ تو آنکھ کا کام ہے مگر ہر آنکھ کا نہیں، نگاہِ نبوت کا کام ہے۔ لیکن عذاب کی وجہ بھی دریافت کر لینا نہ تو یہ آنکھ کا کام اور نہ ہی عقل کا۔ بس معلوم ہوا جہاں آنکھ اور عقل دونوں ناکام ہوں وہیں نگاہِ نبوت کامیاب وکامران ہے۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک

حضرات! پہلے اسکول نے جو سوال کیا تھا اس کی گتھیاں میں نے سلجھا دیں۔ خدا کرے آپ کے ذہن و فکر نے اسے قبول بھی کر لیا ہو۔ لہٰذا اب مجھے دوسرے سوال کا جواب دینا ہے۔

دوسرے اسکول کا کہنا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم خدا اور بندوں کے درمیان محض ایک وسیلہ ہیں۔ خدا سے ہمیں جو کچھ ملنا تھا، ہم پاچکے۔ اب ہم اس کی قدر کریں گے جن ہاتھوں سے ملا ہے ہم اس کا احترام نہیں کر سکتے۔

حضرات! یہ وہی لوگ ہیں جن کی نظر میں گویا رسول کی حیثیت پوسٹ مین جیسی ہے۔ معاذ اللہ۔

اس بد باطن اور گمراہ کا کہنا ہے کہ ہمیں خط سے مطلب نہ کہ خط لانے والے سے۔ بس ہمیں خط پڑھنا ہے اس ہاتھ کا کیا احسان جس نے ہم تک خط پہنچایا ہے ویسے ہی ہمیں قرآن پڑھنا ہے اس سے کیا غرض جس کے توسط سے ہمیں قرآن ملا ہے۔

دوستو! اب آپ ہمہ تن مخاطب ہو جائیں تاکہ اسکی بھی گرہیں کھول دی جائیں۔ سائل یہ سمجھتا ہے کہ وسیلہ صرف ایک ہی قسم کا ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

۱:۔ ایک وسیلہ تو وہ ہے جو صرف وسیلہ ہے مقصد نہیں۔

۲:۔ اور ایک وہ ہے جو وسیلہ بھی ہے اور مقصد بھی۔

مثلاً آپ ٹرین سے اجمیر کے لئے سفر کیا۔ اور تین دن اور تین راتوں کی طویل مسافت اسی ٹرین میں گذار دی شدید انتظار کے بعد اجمیر شریف کا اسٹیشن آیا۔ پلیٹ فارم پر جیسی ہی گاڑی لگی فوراً اتر کر ٹیکسی کیا اور درگاہ شریف کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہی ہر مسافر کا معمول ہے ــــ یا۔ آپ میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو ٹرین سے اُتر کے ڈبوں کو دیکھتا ہے کہ میں نے اسمیں کئی دن اور کئی راتیں گذاری ہیں، دیکھ لیں کسی ڈبے میں آگ تو نہیں لگ گئی۔ پنکھے چوری تو نہیں ہو گئے۔ گارڈ صاحب خیریت سے ہیں۔ ڈرائیور کا مزاج کیسا ہے۔؟ وغیرہ وغیرہ۔

اگر ایسا نہیں ہے تو سمجھ میں آیا کہ ٹرین ہمارے لئے محض وسیلہ ہے منزل آگئی مقصد پورا ہوا۔ ٹرین سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ لیکن ایک وسیلہ وہ ہے جو مقصد بھی ہے اور وسیلہ بھی ہے۔ مثلاً اہل سنت کی مرکزی درس گاہ دار العلوم غریب نواز میں ایک صاحب اپنے بچے کے داخلہ کی غرض سے آئے۔ دار العلوم کے پرنسپل، ناظم اعلیٰ، سے ملاقات کی۔ ان دونوں حضرات نے دریافت فرمایا کس غرض سے تشریف لائے؟ سرپرست نے جواب دیا:

بچے کا داخلہ مطلوب ہے۔ ناظمِ اعلیٰ نے دریافت کیا بچہ کیا پڑھے گا۔ گارجین نے جواب دیا اسے قرآن شریف پڑھانا ہے۔

چنانچہ داخلہ فارم کی خانہ پری کے بعد بچے کا داخلہ لے لیا گیا۔ اب بچے کو استاذ کے حوالے کر دیا گیا۔ استاد نے قاعدۂ بغدادی شروع کرایا اور بچے نے پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد طالب علم کے سرپرست دارالعلوم میں تشریف لائے اور دیکھا کہ بچہ قاعدۂ بغدادی پڑھ رہا ہے۔ پرنسپل صاحب کے قریب آئے۔ حضرت! یہ کیا غضب ہے میں نے تو یہ کہا تھا، میرا بچہ قرآن پڑھے گا لیکن وہ قاعدۂ بغدادی پڑھ رہا ہے۔ پرنسپل صاحب نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا میرے بھائی جب تک بچہ حروف تہجی نہ پہچانے گا، پھر مفردات کے ساتھ ان کا ایک دوسرے سے ملانا جیسے اَب، تَب ایسی ہی اعراب زبر، زیر، پیش، جزم، تشدید وغیرہ کی شناخت نہ ہوگی تو قرآن کیسے پڑھے گا۔ الحمدُ للہ، قل ھو اللہ اَحَد یہ تو جب ہی پڑھ سکے گا کہ پہلے الف، لام، میم، ہ، قاف، وغیرہ کو پہچانے۔

سرپرست نے عرض کیا مگر حضور، یہ بات واضح رہے کہ قاعدۂ بغدادی قرآن پڑھنے کے لئے وسیلہ ہے مقصد نہیں۔ لہٰذا قاعدۂ بغدادی کے حروف قرآن میں نہ آنے پائیں بس وہ وسیلہ ہی تک رہے۔

تب پرنسپل صاحب نے فرمایا حضرت! قاعدۂ بغدادی کے حروف تہجی وسیلہ بھی ہیں اور جزو مقصد بھی۔ اگر الف، لام، ح، م، دال، کو نہ استعمال کریں تو الحمد کیسے پڑھیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا قاعدۂ بغدادی محض وسیلہ نہیں ہے بلکہ مقصد بھی ہے۔

ایسے ہی میرے سرکار روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خدا اور بندوں کے درمیان محض وسیلہ ہی نہیں ہیں بلکہ وسیلہ بھی ہیں اور مقصد بھی۔ اچھا چلو اگر اب ان سے کوئی رابطہ نہیں رہ گیا تو قبر میں صرف دو ہی سوال ہونا چاہئے

تمہارا رب کون، اور تمہارا دین کیا ہے لیکن سبھی کو معلوم ہے کہ آخری سوال یہ ہوگا تم ان کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ اب اگر رسول اللہ مقصد نہ ہوتے اور ان سے رشتہ ٹوٹ گیا ہوتا تو پھر اس سوال کے کیا معنی۔ یہ سوال خود اعلان کر رہا ہے کہ امت کا تعلق ابھی اپنے نبی سے باقی ہے۔

یاد رہے ہر چند کہ تم شروع کے دونوں سوال کا جواب صحیح دیدو مگر نجات موقوف ہے ان کو پہچان لینے پر۔ ورنہ عقل کا مقتضا یہ ہے کہ اگر کسی نے جواب دیدیا کہ میرا رب اللہ ہے اور میرا دین اسلام ہے تو اسے چھٹکارا مل جانا چاہیئے۔ مگر ایسا نہیں ہے محض اسلئے کہ ہو سکتا ہے ایک قادیانی ایک نجدی بھی کہدے میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے۔ مگر اس جواب سے نجات کی مہر تو جب لگے گی کہ تم ان کو پہچان لو۔ یہاں وہ اسلام نہیں چاہیئے جو نجدی اور قادیانی کے ہاتھوں ملا ہے۔ یہاں تو وہ اسلام قابل قبول ہے جو مدینے والے کے ہاتھوں ملا ہو۔

حقیقت واضح ہو گئی کہ اگر امت کا رشتہ نبی سے ٹوٹ گیا ہوتا تو انھیں قبر میں بھیجوایا نہ جاتا۔ بھیجوانا اس بات کی دلیل ہے کہ اسی پہچاننے پر نجات موقوف ہے۔

معلوم ہوا سرکار وسیلہ بھی ہیں اور سرکار مقصد بھی۔ لہذا قرآن کی تلاوت بھی کی جائے گی اور جس زبان سے ہمیں کلام الٰہی ملا ہے اس کی تقدیس بھی بیان کی جائے گی۔ اگر نبی کی زبان مجروح کر دی گئی تو کلام الٰہی مجروح ہو جائے گا۔ ہم دین و شریعت کے ایک ایک حکم اور ایک ایک بات کو اپنے کلیجے میں جگہ دیں گے مگر اسی کے ساتھ نبی کی عظمت بھی بیان کریں گے۔ معاذ اللہ اگر نبی کی عصمت پر داغ دھبہ آجائے تو دین کا پورا تانا بانا مشکوک و مشتبہ ہو جائے گا۔

اگر اسلام و شریعت کی حفاظت و صیانت مقصود ہے کہ اس کا ہم

گوشہ اپنی جگہ سلامت رہے تو ہر ہر لمحہ دامن مصطفیٰ سے وابستگی ضروری ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی وسیلۂ محض ہو اور جیتے جی امت کا رشتہ اپنے ہی نبی سے ٹوٹ جائے۔ اچھا تم ہی بتاؤ، اگر قرآن نے اتنا ہی کہا ہے وضو میں سر کا مسح کرو۔ تم چوتھائی سر کا مسح کرتے ہو اس کی کیا دلیل ہے؟

تم یہی نہ کہو گے کہ رسول اللہ نے سر کا مسح ایسا ہی کیا ہے۔ قرآن نے تو اتنا ہی کہا ہے کہ وضو میں منہ دھوؤ مگر تم کلی بھی کرتے ہو ناک میں پانی بھی ڈالتے ہو۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی کیا دلیل ہے۔ تم یہی نہ کہو گے کہ رسول اللہ نے ایسا ہی کیا ہے۔ تم نماز میں تعدیل ارکان کرتے ہو تاکہ ایک رکن دوسرے رکن سے ممتاز ہو جائے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے؟

تم یہی نہ کہو گے کہ رسول اللہ نے نماز ایسی ہی پڑھی ہے تم طواف کعبہ میں رمل کرتے ہو، ابتدائی تین پھیروں میں سینہ تان کر چلتے ہو اس کی کیا دلیل ہے؟ یہی نہ کہو گے کہ رسول اللہ نے ایسا ہی کیا ہے۔ تم روزہ رمضان ہی کے مہینے میں رکھتے ہو، اور کسی مہینے میں کیوں نہیں رکھ لیتے اس کی کیا دلیل ہے؟ تم یہی نا کہو گے کہ رسول اللہ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔

تم سو روپے میں اڑھائی روپے کی زکوٰۃ نکالتے ہو، ایسا کیوں ہے؟ اس کی کیا دلیل ہے تم یہی نا کہو گے کہ رسول اللہ نے ایسا ہی فرمایا ہے

ارے نادان! وضو، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ غرض کہ فرائض و واجبات میں رشتہ نبی ہی سے جڑا ہوا ہے۔ پھر بھی تو کہتا ہے کہ وہ وسیلۂ محض ہیں۔ اب ان سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ تیرے دعوے کی دلیل رسول اللہ ہیں، اور پھر بھی رشتہ ختم ہو گیا ہے۔؟ اگر رشتہ ٹوٹ جائے گا تو ترا وضو تیری نماز، حج و زکوٰۃ سب کے سب بلا دلیل ہوں گے۔ گویا سارے اعمال بغیر سند و دلیل کے ہو جائیں گے۔ تمام چیزوں کی دلیل تو رسول اللہ ہیں پھر بھی تو کہتا ہے وسیلۂ محض ہیں۔ ان سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ وہ تیرا کوئی اور

نبی ہوگا جس سے تیرا رشتہ ٹوٹ گیا ہوگا میرے سرکار تو وہ ہیں جن سے نماز روزہ، حج و زکوٰۃ سے لے کر قبر اور قبر سے لے کر حشر اور حشر سے لے کر دخول جنت تک ہمارا رشتہ جڑا ہوا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

حشر کی بات آئی تو اسے بھی سماعت فرمائیے:

میدان محشر میں پیاس کی شدت سے زبانیں باہر نکل آئیں گی العطش العطش پیاس، پیاس کا شور و ہنگامہ ہوگا اب ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جب نبی سے تمہارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے اور وہ وسیلہ محض ہیں تو میرے مصطفےٰ سے پانی نہ مانگنا، ابوجہل اور ابولہب کے پاس جانا جن سے تمہارا رشتہ بھی جڑا ہے اور جو تمہارے مقصد بھی ہیں۔

لہٰذا رسول اللہ کا ساقیٔ کوثر ہونا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ابھی ان سے ہمارا رشتہ ٹوٹا نہیں ابھی ان کی بارگاہ میں ہمیں جانا ہے اگر وہ مقصد نہیں تو یہ رابطہ کیسا؟

کچھ اور آگے بڑھو! وہ شفیع محشر بھی ہیں جہاں سجدے کانپ رہے ہوں گے وہاں ان کا بازو سہارا بن جائیگا۔ گناہ کہتا ہوگا جہنم میں جاؤ اور کالی کملی کا اشارہ ہوگا میری پناہ میں آجاؤ۔ اگر وہ وسیلہ محض ہیں مقصد نہیں ہیں تو سیدھے جہنم میں چلے جانا۔ ان کی شفاعت کے طلب گار نہ ہونا۔ چونکہ تمہیں اپنے جہنمی ہونے کا یقین ہو چکا ہے اسی لئے تو یہ سارا واویلا مچا رکھا ہے کہ اگر پانی مانگو گے تو نہ ملے گا۔ شفاعت چاہو گے تو شفاعت نہ ہوگی اس لئے تمہاری مایوسی نے تمہیں یہ دن دکھایا ہے۔ انشاء اللہ نہ تو تمہیں پانی کی بوند ملے گی اور نہ ہی شفاعت کا کوئی گوشہ نصیب ہوگا۔ یہاں بھی ہائے ہائے اور وہاں بھی ہائے ہائے ہم اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ کوثر کا پانی بھی پئیں گے اور دامن رحمت میں پناہ بھی پائیں گے۔

کسی کا اچھا شعر یاد آیا ؎

بھروسہ اس کو کہتے ہیں گنہگاروں نے محشر میں
خدا کے سامنے تم کو پکارا یا رسول اللہ

معلوم ہوا مہد سے لے کر لحد اور لحد سے حشر تک ہمارا رشتہ اپنے نبی سے جڑا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ دخولِ جنت کے بعد بھی جنت میں بھی یہ دل خیالِ مصطفیٰ کی یاد اور ان کے احسانات سے خالی نہ رہے گا۔ اور یہی مشیت ایزدی بھی ہے۔ دل کا دروازہ کھولیئے اور اپنے نبی کی عظمت وجلال وعزت ووقار کا اندازہ کیجئے۔

آپ کو معلوم ہے کہ میدان محشر میں تو میں ایک ایک نبی کے پاس جائیں گی اور ہر نبی ورسول کا یہی جواب ہوگا اِذْهَبُوْا اِلٰی غَیْرِیْ تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ۔ از آدم تا مسیح علیہم الصلوٰۃ والتسلیم سب کا یہی جواب ہوگا لیکن جب بھی تو میں مصطفیٰ کی بارگاہ کرم میں آئیں گی جہاں میرے سرکار سبز جھنڈے کے زیر سایہ تشریف فرما ہوں گے جس کو لِوَاءُ الْحَمْد کہا جاتا ہے تو میرے سرکار کا جواب ہوگا اَنَا لَهَا۔ اَنَا لَهَا شفاعت کے لئے تو ہم ہیں۔ شفاعت کے لئے تو ہم ہیں ؎

کہیں گے اور نبی اِذْهَبُوْا اِلٰی غَیْرِیْ
مرے نبی کے لبوں پر۔ اَنَا لَهَا ہوگا

حضرات! یہ میرا کوئی مستقل عنوان نہیں کہ میں اس کی تفصیل میں جاؤں جب شفاعت کا ذکر ہوگا تو وہاں تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

جب علم الٰہی میں یہ بات ہے کہ شفاعت کا دروازہ میرے محبوب ہی کھلوائیں گے تو قیامت میں یہ دوسری قیامت کیسی؟ کہ سب کو ایک ایک نبی اور رسول کے پاس بھیجا جارہا ہے۔ سب سے پہلے شفیع محشر ہی کے پاس کیوں نہ بھیج دیا جائے گا۔ یہی فلسفہ آپ کو غور سے سننا ہے ــــ اگر سب

سے پہلے شفیع محشر ہی کی بارگاہ میں بھیج دیا جاتا تو اس کا خطرہ اور اندیشہ تھا کہ یہ حضرت انسان ہی تو ہیں، ہو سکتا ہے جنت میں جانے کے بعد مونچھوں پر تاؤ دے کر یہ کہنا شروع کر دیں کہ اگر خاتم النبیین نے بخشوایا تو کیا کمال ہوا اور نبیوں و رسولوں کے پاس جاتے تو وہ بھی بخشوا دیئے ہوتے مگر قدرت اس احساس کو زندہ رکھنا چاہتی ہے کہ پہلے ایک ایک نبی اور رسول کے پاس جاؤ اور آخر میں میرے محبوب کے پاس، تاکہ جنت میں جانے کے بعد تم بقراطی نہ بگھارو۔ بلکہ وہاں بھی یہ احساس زندہ رہے کہ آج بخشوانا اگر کسی کا کام تھا تو شفیع محشر، سید عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا تاکہ یہ گردن جنت میں بھی ان کے بار احسان سے جھکی رہے۔ اور یہ دل ان کی یاد سے خالی نہ رہے۔ ؎

دل ہے وہ دل جو تیری یاد سے معمور رہا!
سر ہے وہ سر جو تیرے قدموں پہ قربان گیا

معلوم ہوا ہند میں آئے تو اذان پکاری گئی جب تک زندہ رہے تو ہماری عبادت و ریاضت کی دلیل بنے رہے ہر جگہ سند میں انھیں کا نام پیش کیا گیا۔ قبر میں تو انھیں پہچانے اس لئے کہ اگر یہاں پہچانے رہیں گے تو ابھی محشر میں بھی پہچاننا ہے یہ پہچاننا وہاں کام آئے گا۔ محشر میں اٹھے تو پانی ان سے مانگا، پل صراط پر انھوں نے دعا دی رَبِّ سَلِّمْ اُمَّتِی اے میرے رب میری امت کو سلامتی سے گذار دے۔ میزان پہ سہارا دے، جنت کے لئے کالی کملی میں پناہ دی، جنت میں گئے تو ان کے بار احسان سے دبے رہے۔ دل ان کی یاد میں ڈوبا رہا۔ آنکھ پروردگار عالم کی تجلی وجلووں میں نہاتی رہی۔

اب تم ہی بتاؤ ایسی ذات والا صفات جو قدم قدم پر ساتھی لمحہ لمحہ کے ساتھی، پل پل کے ساتھی اسے مقصد نہ بنایا جائے تو کیا کیا جائے

فَالحمدُ لِلّٰہِ علیٰ ذالک۔

نادانو ! وہ تمہاری نانی ہوگا جس سے تمہارا رشتہ ٹوٹ گیا ہوگا۔ ماتم ، تم کرو۔ ہم تو شاداں و فرحاں ہیں۔ اپنے نصیبے کی بلندی و سرفرازی پہ

تیسرے اسکول کا سوال یہ تھا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول تو مانیں گے لیکن عالم غیب نہ مانیں گے، حیات النبی نہ مانیں گے، اختیار و تصرف والا نہ مانیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

حضرات! اس سوال کا جواب سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ دو ضابطہ سمجھ لیں۔ اگر اسے آپ نے سمجھ لیا تو چٹکی بجاتے، پلک جھپکتے جواب حل ہو جائے گا۔

پہلا ضابطہ یہ ہے کہ شئی اپنے جملہ لوازم کے ساتھ پائی جائے گی جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز پائی جائے گی اس کے جس قدر لوازم ہوں گے ان تمام لوازم کے ساتھ پائی جائے گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ملزوم تو پایا جائے اور لازم نہ پایا جائے۔

دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ انتفاءِ لازم مستلزم ہے انتفائے ملزوم کو۔ یہ ایک اصطلاحی تعریف ہے۔ اب اسے آپ اپنی زبان میں سمجھیں یعنی لازم کے انکار سے ملزوم کا انکار ہو جائے گا۔ اب آپ پہلے اس اصول کو تفصیلاً سمجھیں۔ یعنی ہر چیز اپنے جملہ لوازمات کے ساتھ پائی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ چاند کو چاندنی لازم ہے، آفتاب کو روشنی لازم ہے، پھول کو مہک و خوشبو لازم ہے۔ کانٹے کو چبھن لازم ہے، انگارے کو سوزش لازم ہے، آسمان کو بلندی لازم ہے، زمین کو وسعت لازم ہے، پانی کو روانی لازم ہے۔ لہٰذا چاند کو چاندنی کے ساتھ جانئے، سورج کو روشنی، پھول کو خوشبو کانٹے کو چبھن، انگارے کو سوزش، آسمان کو بلندی، زمین کو وسعت، پانی کو روانی سے۔

ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ چاند ہو چاندنی نہ ہو، آفتاب ہو روشنی نہ ہو، پھول ہو خوشبو نہ ہو، کانٹا ہو چبھن نہ ہو، انگارہ ہو سوزش نہ ہو آسمان ہو بلندی نہ ہو، زمین ہو وسعت نہ ہو، پانی ہو روانی نہ ہو۔ بس اسی طرح جو نبی ہو

رسول ہوگا تو وہ نبوت و رسالت کے جتنے لوازمات ہیں وہ سب کے ساتھ ہوگا مثلاً نبی کے لئے عصمت لازمی ہے، نبی کو غیب داں ہونا ضروری ہے، نبی کا اختیار والا ہونا ضروری ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ نبوت و رسالت کے جو لوازمات ہیں ان سب کا نبی کے ساتھ پایا جانا ضروری ہے۔ ایسا نہیں کہ نبی ہو مگر معصوم نہ ہو۔

دوسرا قانون یہ ہے کہ لازم کے انکار سے ملزوم کا انکار لازم آتا ہے۔ مثلاً چاند ملزوم ہے چاندنی لازم ہے، سورج ملزوم ہے روشنی لازم ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ چاند ہے چاندنی نہیں، سورج ہے روشنی نہیں تو چاندنی کا انکار نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ چاند ہی کا منکر ہے۔ اگر وہ کہتا ہے آفتاب ہے دن نہیں ہے تو وہ دن کا منکر نہیں بلکہ آفتاب ہی کا منکر ہے۔ بس ایسے ہی اگر کوئی کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں مگر معصوم نہیں تو عصمت کا منکر نہیں بلکہ نبوت و رسالت کا منکر ہے۔ چونکہ لازم کے انکار سے ملزوم کا انکار ہوتا ہے۔

اسوۂ حسنہ

ابتدائے آفرینش سے لیکر تا ایں دم ہزاروں، لاکھوں اشخاص نے اپنی اپنی زندگی کے کچھ نقوش آنے والوں کے لئے مرتب کئے لیکن تکمیلِ انسانیت اور فلاحِ آدمیت کا انمٹ اور جامع نسخہ جو ہمارے آقا و مولا صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی مختصر سی حیاتِ مبارکہ میں پیش فرمایا وہ ہر خاص و عام کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔

اوراق الٹیں

اور ملاحظہ فرمائیں

ہم ہوئے کہ تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

الحمد للہ و کفی و سلام علی حبیبہ المصطفیٰ

اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

بے شک تمہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی

بہتر ہے

ایک پیکر میں سمٹ کر رہ گئیں

حکمتیں، دانائیاں، آگاہیاں

حضرات ! میں نے معمول کے مطابق خطبۂ مسنونہ کے بعد قرآن مجید کی ایک متعارف اور مشہور آیت کی تلاوت کی ہے۔ اور آج کی سنجیدہ و متین نشست کے لئے میں نے اسی کو اپنا موضوع بنایا۔ اب وقت میں اتنی گنجائش نہیں کہ کوئی تفصیلی تمہید اٹھائی جائے۔ یا دیباچہ سنوارا جائے۔ اسلئے بغیر کسی تمہید و دیباچہ کے اس آیت کا مفہوم سماعت فرمائیں جس کی میں نے تلاوت کی ہے۔ خدائے قدیر کا ارشاد ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۵

تم میں ایک رسول مبعوث کیا جاتا ہے جسکی زندگی تمہارے حق میں نمونۂ عمل ہے۔

یعنی اے لوگو ! اگر تم قانونی زندگی لینا چاہتے ہو۔ زندگی کا چلن اور ڈھنگ سیکھنا چاہتے ہو یا دستور حیات کا بانکپن دیکھنا چاہتے ہو۔ زندگی کی جلوت و خلوت میں، زندگی کی صبح و شام کیسے گذرے۔ یہ زندگی اپنی منزل اور سمت سفر کیسے متعین کرے۔ اور اگر متعین کرلے تو اس طویل مسافت کو وہ کیسے طے کرے اس رہ گذر پر چلنے کی ادا کیا ہے۔ اس پگڈنڈی کے نشیب و فراز کیا ہیں۔ شاہراہ زندگی کے اجالے اور اندھیرے کیا ہیں۔ اس کی ہموار و ناہموار راہوں کو عبور کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اگر زندگی کی پرپیچ راہوں اور خاردار جھاڑیوں سے دامن بچاکر گذر جانا چاہتے ہو تو امریکہ کی شاہ راہوں کو مت دیکھو۔ روس اور فرانس کی فلک بوس عمارتوں کے زیر سایہ زندگی کا سکون مت تلاش کرو۔ اگر صحیح معنوں میں تم کو اس کی تجسس و تلاش ہے تو آسمان بولتی عمارتوں کے سایہ میں زندگی کی راحت و سکون مت ڈھونڈو۔ بلکہ گنبد خضرا کی چھاؤں میں چلے آؤ اور مدینے کی گلیوں میں بسیرا ڈالو۔ یاد رہے زندگی وہ دیتا ہے جو خود زندہ ہو

وہ مردہ قوم تمہیں زندگی کیا دے گی، جس کی روح خود آبِ حیات کی پیاسی ہو۔ مجھے کہہ لینے دیجئے کہ وہ نام نہاد ترقی یافتہ قوم ہے جو انسانوں کے روپ میں اور انسانیت کی آبادی میں چلتا پھرتا جنازہ ہے۔ برطانیہ ہو یا فرانس، امریکہ ہو یا چائنا اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ یہ تن کے اُجلے مَن کے کالے بھلا تمہیں زندگی کیا دے سکتے ہیں۔ اسی لئے میں نے پہلے عرض کیا۔ زندگی وہ دیتا ہے جو خود زندہ ہو اور خالی زندہ ہی نہیں بلکہ زندگی کا سرمایہ بھی رکھتا ہو۔ بھلا وہ زندگی کیا دے سکتا ہے جس کے پاس اس کی کانی کوڑی تک نہ ہو۔

حضرات! قرآن کا اشارہ اسی طرف ہے کہ اے زندگی کے متلاشیو! اگر تم اپنی نیت کے سچے اور ارادہ کے پکے ہو تو در بدر کی ٹھوکریں مت کھاؤ۔ ہر اونچ نیچ کی کنڈی مت کھٹکھٹاؤ۔ بلکہ سیدھے مدینہ چلے آؤ اور ان کی بارگاہِ کرم میں دستِ طلب دراز کرو۔ جو خود بھی زندہ ہے زندگی بانٹ بھی رہا ہے ؎

ایک نکتہ: یہاں ایک نکتہ آپ پر واضح رہے کہ نبی کی موت ہم جیسی موت نہیں ہوتی۔ ہمارا مرنا یہ ہے کہ ہم مرے تو مر گئے مگر نبی ایک لمحے کے کروڑویں حصے کے برابر محض موت کا ذائقہ چکھتا ہے اور وہ محض اس قانونِ الٰہی کی تعمیل و تکمیل ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ.

لہٰذا اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ میرے سرکار کل بھی زندہ، آج بھی زندہ اور اب ہمیشہ کے لئے زندہ۔ وہ کسی اور کا بنا یا ہستی ڈالڈا ٹائپ اور خانہ ساز نبی ہوگا جو مر گیا ہوگا۔ جو سڑ گل کر مٹی میں مل گیا ہوگا۔

میرے سرکار نے تو خود ہی فرمایا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ فَنَبِيُّ اللّٰهِ حَيٌّ يُرْزَقُ

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں ؎

انبیاء کو بھی اجل آنی ہے
مگر ایسی کہ فقط آنی ہے
پھر اسی آن کے بعد ان کی حیات
مثل سابق وہی جسمانی ہے

اسلئے میں کہتا ہوں کہ میرے سرکار نے پردہ فرمایا ہے۔ حضرات! یہ میں بہت سوچ سمجھ، سوجھ بوجھ اور محتاط طور پر بول رہا ہوں۔ میں اس سلسلے میں آپ کو لائبریری اور کتب خانے کی سیر نہ کراؤں گا اور نہ ہی وہاں جانے کی زحمت دوں گا۔ اسی پنڈال میں بیٹھے بیٹھے مسئلہ حل کئے دیتا ہوں۔

اچھا اب آپ لوگ اپنی اپنی گھڑی دیکھئے اور جن کی کلائی عہ میں گھڑی نہ ہو تو وہ گھڑی والوں سے دریافت کرلیں۔ اس وقت گھڑی کیا بجا رہی ہے؟ اچھا دو بج گئے۔ بس اب تمام ہی حضرات انصاف و دیانت کا خون کئے بغیر بتائیں کہ ہمارے یہاں دو بج رہے ہیں تو کیا ساری دنیا میں رات کے دو بج رہے ہیں؟ کیا امریکہ میں بھی ایسی ہی تاریکی پھیلی ہوئی ہے، ہُو کا عالم اور سناٹا ہے؟ نہیں! معلوم ہوا کہ یہاں تاریکی ہے اور کہیں روشنی۔ یہاں رات اور کہیں دن اس سے پتہ چلا اور یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ آفتاب چھپ جاتا ہے مٹ نہیں جاتا۔ معدوم اور فنا نہیں ہوتا ——— لہٰذا اب مجھے کہہ لینے دیجئے یہ آسمان کا آفتاب ہے اور میرے سرکار آسمان نبوت کے آفتاب۔ اور آفتاب کا مزاج سمجھ میں آیا کہ آفتاب چھپ جاتا ہے مٹ نہیں جاتا۔ لہٰذا یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ سرکار چھپ گئے ہیں مٹ نہیں گئے۔

اسی لئے امام اہلسنت اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

تو زندہ ہے واللہ، تو زندہ ہے واللہ
مرے چشم عالم سے چھپ جانے والے

عہ میں نے کلائی کی قید اسلئے لگائی کہ گھڑی جیب میں اسطرح ہوگی جیسے کوئی ۔۔۔۔ مین سنم ہو جاے۔

نوٹ :۔ میرے سرکار کو آفتاب سے کن کن وجوہ سے مماثلت ، اور مشابہت ہے اس کی تفصیل " سراج منیر " کی تقریر میں ملاحظہ فرمائیں ۔

حضرات ! میں یہ بات عرض کر رہا تھا کہ اگر زندگی کے آداب اور طور طریقے سیکھنے ہوں تو امریکہ نہ جائیے مدینے کی پر سکون فضاؤں میں خراماں خراماں چلے آئیے ۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

حضرات ! آپ میں سے کتنے لوگ یہ سوچتے ہوں گے کہ آج کس پاگل اور دیوانے سے سابقہ پڑ گیا ۔ ساری دنیا تو امریکہ کا خطبہ پڑھ رہی ہے ۔ امریکہ جانے کی خواہشمند ہے مگر نظامی کہتا ہے اگر زندگی سنوارنی بنانی ہے تو امریکہ نہ جاؤ مدینہ جاؤ میرے بھائی ! آج کی دنیا جس دھارے میں بہ رہی ہے اگر آپ نے ایسا سوچا تو کچھ مقام تعجب نہیں ۔ مگر مجھے بولنے کی اجازت دیجئے کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں ۔

حضرات ! مجھے بھی یہ تسلیم ہے کہ آج کے ترقی یافتہ ممالک میں امریکہ سرفہرست ہے جس کی مادی ترقی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔ لیکن اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ انسان بڑھ رہا ہے انسانیت گھٹ رہی ہے ۔ آدمی ترقی کی راہ میں دوڑ لگا رہا ہے ۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے مگر آدمیت سسک رہی ہے ۔ جس کا جنازہ بے گور وکفن پڑا ہے ۔ ان حالات میں آنکھ بند کر کے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ نے ہر طرح کی ترقی کر لی ہے ۔ آج اس کی ترقی کا سارا دار و مدار یہ ہے کہ لوہے اور لکڑ کو سنوار رہا ہے کوئلے اور ریڈیائی لہروں پر اپنی انرجی صرف کرتا ہے ۔ اقبال نے ان سائنسی ایجادات پر فخر کرنے والوں کی بے چارگی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اسلام اور سائنس کا فرق

علم وحکمت کے خم وپیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع وضرر کر نہ سکا

ایٹمی توانائیوں کے اس ہوش رُبا دور میں کیا کچھ ہو رہا ہے اس سے دنیا کا ہوشمند طبقہ بہت اچھی طرح واقف ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق بین الاقوامی سطح پر ابھی حال ہی میں دنیا کے اعلیٰ سطح کے سائنسدانوں کی ایک عظیم کانفرنس ہوئی تھی جس میں کسی ملک کے نمائندے نے بیان دیا تھا کہ زمین دوز طور پر آج دنیا میں اتنے مہلک آتشی اسلحے موجود ہیں کہ اگر ان کو زمین کے اوپر استعمال کیا جائے تو ساری دنیا آن کی آن میں بھسم ہو کر خاکستر ہو جائے۔

اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ آج کا سائنس داں طبقہ اپنے ملک کا اربوں کھربوں ڈالر اس بات پر خرچ کرتا ہے کہ کوئی ایسی چھوٹی سی چیز طیارے سے کسی آبادی پر گرائی جائے جس کی زہریلی فضا سے کروڑہا انسان آن واحد میں ختم ہو جائیں۔ گویا امریکہ، روس، فرانس، برطانیہ، چین یہ سوچ رہے ہیں۔ کہ کروڑہا انسانوں کو آنِ واحد میں کیسے مارا جائے۔ لیکن ہمارا بوریہ نشیں تاجدار، اپنی ٹوٹی چٹائی پر بیٹھ کر یہ سوچتا تھا کہ انسانوں کو جلایا کیسے جائے۔ کمزور و ناتواں کو توانائی کیسے بخشی جائے۔ اگر دلوں کا دروازہ کھلا ہو اور دیدہ اعتبار ہو تو دیکھو اور سوچو کہ دونوں میں کتنا بُعدُ المشرقین ہے۔ ایک موت کی گھاٹ اتارنا چاہتا ہے اور دوسرا زندگی کی بھرپور توانائیوں سے سنوارنا چاہتا ہے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ زندگی کی سوغات و برکات لینے کیلئے ہم آپ کو امریکہ بھیجیں یا مدینہ؟

حضرات! سائنس اور اسلام

سائنس اور اسلام کا ایک دوسرا فرق

کا ایک دوسرا فرق بھی ملاحظہ فرمائیے
میں نے ابھی عرض کیا کہ سائنس نے اپنی انرجی دوسروں پر خرچ کی اور اس سے فائدہ اٹھایا مثلاً لاوڈ اسپیکر، ریڈیو، ٹیلی ویژن اس طرح کی اور دوسری نت نئی ایجادات جو آپ کے مشاہدہ میں ہیں مگر اس کے مقابل اسلام کا یہ کہنا تم میں کس چیز کی کمی ہے۔ تم اپنے دل کو سنوارو اور ساری کائنات پر حکمرانی کرو۔ ریڈیو کا تار ٹوٹ جائے۔ بیگم واجد علی کا پاندان معلوم ہو۔ لیکن اگر یہ دل سنور جائے تو کلکتہ میں بولو۔ بمبئی والے سنیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں معلمین و متعلمین کی دونوں جماعتیں گذری ہیں۔ ایک مشائین اور دوسری اشراقین کی۔

'مشائین' وہ گروہ ہے جو چل پھر کر پڑھتا اور پڑھاتا تھا۔ اور اشراقین وہ جماعت ہے جو اشراقِ نوری سے پڑھاتا تھا۔ استاد مدارس میں اور شاگرد حیدرآباد۔ استاد نے وہاں سے پڑھایا اور شاگرد نے یہاں پڑھ لیا کسی نے اچھا ہی کہا ہے ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی،

اسی لئے میرے سرکار نے فرمایا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ جس نے اپنے کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

یہ حقیقت آپ پر واضح رہے۔ اس کائنات میں خدا ہی کو پہچاننا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ مگر جب آدمی اپنے کو پہچاننے کے بعد رب کو پہچان سکتا ہے تو بھلا مخلوقات کو کیوں نہیں پہچان سکتا!

حضرات! دوسرے مقام پر سید عالم روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ان فی جسد الانسان مضغة فاذا صلحت صلح کله واذا فسدت فسد کله۔ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا

ہے اگر اس کی اصلاح ہوجائے تو پورے بدن کی اصلاح ہوجائے۔ اور اگر اس میں فساد آجائے تو پورا بدن بگڑ جائے۔

یہ اسلام اور سائنس کا بنیادی فرق ہے کہ سائنس دوسروں کو مجاجی اور بناتی ہے اور اسلام خود تمہارے دل و دماغ کی اصلاح کرتا ہے۔ ذہن و فکر کی تطہیر کرتا ہے۔ بدن اور روح دونوں کو طہارت و پاکیزگی بخشتا ہے۔ وہ بدن کو آدابِ زندگی سکھاتا ہے اور روح کو صیقل کر کے لذتِ سجدہ اور ذوقِ عبادت سے آشنا کرتا ہے۔

لہٰذا اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ دستورِ زندگی لینے کے لئے ہمیں امریکہ جانا ہے یا مدینہ؟

ایک غلط فہمی کا ازالہ

حضرات! آپ میں سے بعض احباب یہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ "مشتاق نظامی" الٹی گنگا بہانے کی کوشش کر رہا ہے، اور الفاظ پر زور دے کر ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتا ہے۔

محترم حضرات! ایسا نہیں ہے۔ میں خطابت کا جادو جگا کر آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا، نہ تو میرا یہ منصب ہے اور نہ ہی اس ذمہ داری کا تقاضہ۔ یہ لمحہ، سکنڈ سکنڈ جس کی پاسداری مجھے ملحوظ ہے۔

اب میں بہت ہی واضح الفاظ میں یہ کہدینا چاہتا ہوں کہ میں جو کچھ بھی عرض کر رہا ہوں یہ کوئی فکری و نظری مسئلہ نہیں ہے۔ آپ یہ سوچتے ہوں گے کہ آج کی دنیا میں امریکہ کی ترقی سے انکار کیسے کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ وہ ساری دنیا کو ڈالر بانٹ رہا ہے۔

مرے بھائی! یہی تو وہ رازِ سربستہ ہے جس نے بہتوں کی آنکھوں میں پٹی باندھ رکھی ہے۔

اس مقام پر میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ "ڈالر تقسیم کرنے کا کیا یہ مفہوم ہے کہ امریکہ چھوٹے ممالک کو خیرات و زکوٰۃ تقسیم کر رہا ہے۔ ہرگز ہرگز نہیں

اگر آپ ایسا سمجھ رہے ہیں تو تاریخ و واقعات کی بہت بڑی بھول میں مبتلا ہیں "۔
اب میں آپ کو ایک بات یاد دلانا چاہتا ہوں ۔ دو برس پہلے کی بات ہے کہ ہمارے ہی ملک "ہندوستان" نے کسی معاملہ میں "کناڈا گورنمنٹ" سے قرض چاہا تھا ۔ اس ملک نے کا جواب یہ تھا کہ دوسرا نیا قرض اس وقت ملے گا جب کہ پہلے قرض کی اصل رقم باقی رکھتے ہوئے اس کا سود در سود ادا کر دیا جائے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بڑے ممالک چھوٹے ممالک کے بدن کا خون "جونک" کی طرح چوس رہے ہیں ۔ کوئی بھی بڑا ملک ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس سے چھوٹا ملک اس کا ہمسر اور مقابل ہو جائے ۔

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو امریکہ دنیا کو ڈالر تقسیم کر رہا ہے کیا اس ملک میں سائل و گداگر نہیں ہیں ؟

حضرات ! جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے امریکہ میں بھی سائل ہیں ۔ وہاں بھی دامن پھیلانے والے ہیں ۔ خدارا انصاف کرو ۔ جو اپنے ملک کی بھوک مری ختم نہ کر سکا وہ تمہارے دیس کی دریوزہ گری کیسے ختم کر سکتا ہے اس کے برخلاف تاریخ اسلام کا ایک زریں واقعہ سماعت فرمائیں جو محض فکری و نظری نہیں بلکہ مشاہدے میں آچکا ہے ۔

اسی دھرتی پر ایک دور ایسا بھی گذرا ہے کہ ایک روز زکوٰۃ تقسیم کرنے والا درہم و دینار کی تھیلی لے کر مدینے کی گلی کے ایک سرے سے چلتا ہے اور منادی آواز دیتا ہے کون ہے زکوٰۃ کا لینے والا ۔ حتیٰ کہ گلی کے دوسرے کنارے پر آجاتا ہے مگر کوئی دامن کا پھیلانے والا نہ مل سکا مجھے دریافت کرنے کا حق دیجئے کہ آج زکوٰۃ لینے والا کیوں نہیں مل رہا ہے ۔ میرے بھائیو ! زمین نے سونا اگل دیا ہے یا آسمان نے ہیرے برسا دئے ہیں ۔؟

حضرات ! نہ تو زمین نے سونا اگلا ہے اور نہ ہی آسمان نے جواہرات کی بارش کی ہے ۔ اب یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ اللہ کی بچھائی ہوئی

زمین پر میرے مصطفےٰ کا قانون چل رہا تھا۔ انھیں واقعات وحقائق کی روشنی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا اگر امن وشانتی کی متلاشی ہے، راحت وسکون کی طلبگار ہے، اپنے ملک سے غریبی ختم کرنا چاہتی ہے تو امریکہ نہ جائے مدینہ والے سرکار کی بارگاہ کرم میں آجائے۔ اس مقننِ اعظم اور قانون ساز کی آغوشِ رحمت میں آئے جس کا پیغام محض فکری ونظری نہیں ہے۔ بلکہ عملاً مشاہدے میں آچکا ہے معلوم ہوا اخباری پروپگنڈے اور پریس کی طاقت کے بل بوتے کسی ملک وقوم کو راحت نصیب نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک صالح وصحت مند معاشرے کو وجود بخشا جائے جس میں انسانی قدریں محفوظ ہوں۔ اور وہ سماج انسانی کی پائمالی پر انسانیت کی بحالی کو فوقیت دیتا ہو۔

واضح ہو کہ دھوکہ دھڑی، دجل وفریب، عیاری ومکاری کی گرم بازاری کے اس دور میں اگر ایسا صحت مند معاشرہ کہیں سے میسر آسکتا ہے تو وہ سرورِ کونین کی تیئس ۲۳ سالہ مبارک زندگی ہے جسے تاریخ اسلام نے ہمیشہ کے لئے اپنی آغوشِ رحمت میں سمیٹ لیا ہے۔

اے دوستو! اگر زندگی کا بانکپن دم خم لینا چاہتے ہو تو کہیں اور نہ جاؤ ؏ گنبد خضرا کی چھاؤں میں آجاؤ
جہاں شبنمی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دھڑکتے دلوں کو سکون ملتا ہے۔

حضرات! میں اب تک ایک ذیلی و ضمنی گفتگو میں الجھا رہ گیا حالانکہ وہ گفتگو بھی آج کے حالات اور عصری مزاج کی اصلاح و سدھار کے لئے بہت ہی اہم اور ضروری تھی۔

اب میں اپنے اصل موضوع سے وابستہ ہو رہا ہوں۔ پھر ذہن میں نوٹ کر لیجئے۔ آج میری تقریر کا عنوان ہے روح اور روحانیت۔ آج کی نشست میں مجھے انھیں دونوں کا خط امتیاز اور حد فاصل ظاہر کرنا ہے مگر اب تک جو کچھ میں نے عرض کیا ہے۔ وہ اصل موضوع سے غیر متعلق بھی نہیں ہے۔ اصل گفتگو نہ سہی مگر موضوع کی کھلی تمہید ضرور ہے۔

حضرات! روح اور روحانیت مرا عنوان ہے۔ آج روح روح کا نعرہ تو ہر طرف ہے۔ روح کا چارہ ہر جگہ فراہم کیا جا رہا ہے مگر اے دانشورو! اس کا بھی تو سراغ لگاؤ کہ روحانیت کا جلوہ کہاں ہے۔ ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ چھٹی رجب کو تقریباً بیس لاکھ کا مجمع سلطانِ ہند خواجۂ خواجگاں، خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے یہاں پہنچ گیا۔ ایک میلہ ہے جو چلا جا رہا ہے، ہجوم ہے کہ دوڑا جا رہا ہے۔ کارواں ہے کہ بھاگا جا رہا ہے۔ اسی منظر کو عارف باللہ سرکار اسی نے اس طرح پیش فرمایا ؎

اس کا پتہ نہ پوچھو بس آگے بڑھے چلو
ہوگا کسی گلی میں تو میلہ... لگا ہوا

مجھے آپ حضرات بتائیے یہ دوڑنے والا کون ہے؟ چلنے والا کون ہے، اجمیر جانے والا کون ہے؟ حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہئے یہ روح والا ہے جو اجمیر بھاگا جا رہا ہے۔ اور اجمیر کا وہ راجہ جو دھولے گنبد میں آرام فرما رہا ہے وہ روحانیت والا ہے۔ وہاں روح کا جلوہ ہے اور یہاں روحانیت کی جلوہ گری ہے۔ اگر اس میں کوئی کشش اور مقناطیسیت نہ ہوتی تو بیس لاکھ کا مجمع دوڑا کیوں جا رہا ہے۔ روح اور روحانیت کا یہی وہ خط امتیاز ہے جو ایک کو دوسرے

سے الگ کر دیتا ہے۔

اب آپ اس متن کی توضیح و تشریح سماعت فرمائیے۔

تصویر کا پہلا رُخ سب سے پہلے انسانی وجود کے نقطۂ آغاز کا ہلکا پھلکا سرسری جائزہ لیجئے۔ انسان، رحم مادر میں سب سے پہلے چند قطرات ہے۔ پھر وہ خون ہوا۔ اور خون سے گوشت، حتیٰ کے تھوڑے دنوں بعد اب گوشت کا ایک لوتھڑا بن گیا۔ یہاں تک دن بیتتے گئے۔ اور مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے حتیٰ کہ اب اس گوشت کے لوتھڑے میں اعضا نمودار ہو گئے۔ یہ انگلیاں ہیں، یہ گردن ہے، ٹھوڑی ہے، ہونٹ ہے، یہ تلوا ہے، یہ پنجہ ہے، یہ پنڈلی ہے، ران ہے، شکم ہے سینہ ہے، کندھا ہے، بازو ہے، کلائی ہے، ہتھیلی ہے، زبان ہے، رخسار ہے۔ کنپٹی ہے، آنکھ ہے۔ سفیدی ہے، سیاہی ہے، پتلی ہے، مژگان ہے، بھوں، کان ہے، پیشانی ہے، سر ہے، اور بال ہے۔ غرض کہ پاؤں کے ناخون سے لے کر سر کے بال تک مکمل مجسمہ تیار ہے۔

مگر پیارے! حال یہ ہے کہ کان ہے مگر سنتا نہیں۔ آنکھ ہے دیکھتی نہیں زبان ہے بولتی نہیں، ہاتھ ہے جنبش نہیں، پاؤں ہے چلتا نہیں۔ معلوم ہوا آنکھ ہے مگر بیکار، کان ہے مگر بیکار، حتیٰ کہ سب کچھ ہے مگر سب کچھ بیکار۔ اب حقیقت آشکارا ہو گئی کہ آنکھ خود نہیں دیکھتی۔ آنکھ کا ڈھیلا نہیں دیکھتا۔

معلوم ہوا کہ آنکھ کے جھروکے سے روح جھانکتی ہے۔ کان خود نہیں سنتا اس کے پردے پر روح کی پہرہ داری ہے۔ محسوس ہوا روح نہیں تھی تو سب بیکار۔ اور روح آگئی تو سب باکار۔ اب آنکھ دیکھ رہی ہے، کان سن رہا ہے، ہاتھ میں حرکت ہے۔ پاؤں میں جنبش ہے۔

دوستو! بتاؤ یہ کس کی جلوہ گری ہے "روح کی" اور اتنی نازک کہ اگر سُرمہ لگاتے وقت ہاتھ کی سلائی بہک جائے تو تمام دن گرم گرم آنسو بہے۔ رومال تر بتر ہو جائے۔ آنکھ سرخ ہو جائے۔ لیکن اے دوستو! یہی روح اگر

جسم کا ساتھ چھوڑ دے تو آنکھ کا ڈھیلا نکال کر زمین پر رکھ دو۔ بدن کو بوٹی بوٹی قیمہ قیمہ کر ڈالو۔ ہڈی کو چور چور کر دو۔ نہ حرکت ہے نہ جنبش ہے نہ آہ ہے نہ اُف ہے۔

معلوم ہوا روح ہے تو سب باکار۔ روح نہیں تو سب بے کار۔ چلنا پھرنا دوڑنا، دھوپنا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، ہنسنا رونا، بولنا چالنا، کھانا پینا، آنا جانا گویا ان جملہ حرکات وسکنات کے پیچھے روح اور صرف روح کی جلوہ گری ہے۔ اسی کی حکمرانی وکارفرمائی ہے غرض کہ روح ہے تو یہ سارے مناظر ومظاہر زندہ ہیں۔ اور جہاں روح نے ساتھ چھوڑا اب وہ ایک نعش ہے۔ جنازہ ہے۔ گویا یہ وہ مقام ہے جہاں روح کی جلوہ گری ہے۔

مگر اے دوستو! یہ تو بتاؤ "روح" آنے کے بعد آنکھ دیکھتی تو ہے لیکن کیا ایسا ہے کہ بمبئی سے کلکتہ دیکھو، مدراس سے دلّی دیکھو، حیدرآباد سے بنگلور دیکھو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اچھا یہ بتاؤ! کان سنتا تو ہے لیکن کیا ایسا ہے احمدآباد سے کانپور کی بات سنو۔ لکھنؤ سے کاٹھیاواڑ کی بات سنو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کیا معلوم ہوا۔ کان سنتا تو ہے مگر اپنے محدود حلقوں تک سنتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ۔ ایسے ہی آنکھ دیکھتی تو ہے مگر زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ گویا آنکھ اور کان کا دیکھنا سننا کچھ فاصلوں تک محدود ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

مگر اے دوستو! یہ تو بتاؤ کہ خلیفۂ دوم حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جمعہ کا خطبہ دے رہے ہیں اور تین سو میل کی دوری پر مقام نہاوند میں جنگ لڑی جارہی ہے جس کے امیر کارواں حضرت ساریہ ہیں۔ حق وباطل کی اس معرکہ آرائی میں حضرت ساریہ سے معمولی سی غفلت ہوگئی۔ یہ دیکھتے ہوئے امیرالمومنین نے خدشہ محسوس کیا کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن حملہ آور ہو جائے۔ چنانچہ خطبہ دیتے ہوئے امیرالمومنین نے حضرت ساریہ کو آواز دی یاساریہ الجبل، یاساریہ الجبل، یاساریہ الجبل۔

حضرات! نہ تو کوئی دوربین ہے، نہ ریڈیو اسٹیشن، نہ براڈ کاسٹنگ کا

کوئی نظم اور نہ ہی ریڈیائی لہریں۔ اب کوئی مجھے بتائے وہ کون سی آنکھ ہے جو تین سو میل کی دوری کو دیکھ رہی ہے اور وہ کون سا کان ہے جو تین سو میل کی آواز سن رہا ہے۔

لہٰذا اب مجھے کہہ لینے دیجئے! یہاں روح نہیں روحانیت کا جلوہ ہے۔ صرف روح والی آنکھ نہیں روحانیت والی آنکھ دیکھ رہی ہے۔ پیارے روح والا کان نہیں، روحانیت والا کان سن رہا ہے۔ روح والی آنکھ ایک فرلانگ دیکھے، روح والا کان مشکل سے ایک فرلانگ سنے مگر یہ روحانیت کا مقام ہے کہ تین سو میل کی دوری کو دیکھے اور تین سو میل کی دوری سے سنے۔

حضرات! اسے بھی اتفاق ہی کہئے کہ تین سو میل کی دوری پر یہ جنگ ہو رہی تھی اگر یہ جنگ تین ہزار میل کی دوری پر لڑی جا رہی ہوتی تو نگاہ فاروق وہاں بھی دیکھتی۔ اور "ساریہ" کا کان وہاں سے بھی سنتا۔

معلوم ہوا روح کا مقام اور ہے اور روحانیت کا مقام اور۔

حضرات! یہاں پہنچ کر ایک ضروری بات ذہن نشین کر لیجئے کہ آخر یہ موضوع میں نے اپنایا کیوں؟ اس کا مقصد و مدعا کیا ہے؟

ضروری بات: حضرات! آپ پر واضح ہو جانا چاہئے کہ مجھے نتیجتاً یہ بتانا ہے کہ اس جسم کا تعلق محض روح سے ہے یا روحانیت سے بھی ہے اگر محض روح سے ہے تو ہوگا یہ کہ روح اگر جاتی رہی تو جسم برباد ہو جائے گا۔ سڑ جائے گا، گل جائے گا۔ لیکن اگر جسم کا تعلق روح اور روحانیت دونوں سے ہے تو روح جاتی رہے گی مگر آنکھ دیکھتی رہے گی، کان سنتا رہیگا۔ بتاؤ! امام حسین دیکھتے ہیں، غوث اعظم سنتے ہیں، غریب نواز دستگیری فرماتے ہیں۔ آخر کیوں؟ محسوس ہوا یہ روح والے ہی نہیں روحانیت والے بھی ہیں۔

ایک اصول اسے آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ قرب اور صحبت کا اثر ہوتا ہے مثلاً آپ لوگ کہتے ہیں چمیلی کا تیل، بیلے کا تیل، روغن گلاب۔ تو سچ سچ بتائیے کیا چمیلی سے تیل نکالا گیا ہے، بیلا سے نکالا گیا ہے، آپ یقیناً کہیں گے، ہرگز نہیں تو پھر اسے بیلے کا تیل کیوں کہا گیا، چمیلی کا تیل کیوں کہا گیا۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک تیل تل کا ہے۔ تعجب ہے تیل تل سے نکالا جائے اور بیلا اور چمیلی کا تیل کہا جائے آخر آپ کچھ تو فرمائیں گے۔ یہی نا کہیں گے کہ ہر تیل تل کا ہے مگر جو تل چمیلی کے آغوش میں گیا وہ مہک اٹھا۔ جسے گلاب کی صحبت میسر آئی اسے گلاب نے مہکا دیا جسے بیلے کا قرب حاصل ہوا اسے بیلے کی خوشبو مل گئی۔ جیسے حضرت سعدی نے اپنی زبان میں یوں کہا ہے ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

لہٰذا اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ اگر بیلا، چمیلی، گلاب اپنا اپنا اثر دکھا سکتے ہیں موثر اور اثر انداز ہو سکتے ہیں تو کیا روح اور روحانیت کے اثرات نہ ہوں گے؟ ہوں گے اور یقیناً ہوں گے۔

حضرات! ابھی میں نے آپ سے کہا تھا کہ آنکھ ہے مگر دیکھتی نہیں ہے، کان ہے مگر سنتا نہیں ہے۔ مگر آنکھ نے دیکھا، کان نے سنا۔ کب دیکھا اور کب سنا۔ جب روح آئی تب۔ یہ کس کا اثر ہے روح کا۔ مگر یہ آنکھ کتنا دیکھے۔ ایک فرلانگ اور کان کتنا سنے ایک فرلانگ۔ اور ایک آنکھ تو وہ بھی ہے جو تین سو میل کی دوری دیکھے اور ایک کان وہ بھی ہے جو تین سو میل کی آواز سنے۔ یہ کس کا اثر ہے، روحانیت کا۔

حقیقت واضح ہو گئی کہ روح اور روحانیت کے الگ الگ اثرات

ہیں۔ روح اپنے حدود میں کام کرتی ہے اور روحانیت اپنی وسعتوں میں پرواز کرتی ہے۔ روح جہاں نہ دیکھے روحانیت وہاں دیکھے۔ روح جہاں نہ سنے روحانیت وہاں سنے۔

ع کوئی اڑ کے رہ گیا بام تک کوئی کہکشاں سے گذر گیا

ایک ضابطہ:- اب اس مقام پر ضروری ہے کہ آپ کو ایک ضابطہ سمجھا دیا جائے۔ دوستو! ضابطہ یہ ہے کہ مؤثر جتنا ہی قوی اور مضبوط ہوگا اثر اس کا اسی قدر دیرپا اور پائدار ہوگا۔ مثلاً گلاب، بیلا، چمبیلی یہ سب مؤثر ہیں۔ ان کا اثر یہ ہے کہ انھوں نے تل کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ اپنی خوشبو سے مہکا دیا۔ مگر یہ ایک عارضی خوشبو ہے۔ انقلاب حقیقت و ماہیت نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ تیل تیل میں رہ گیا۔ تیل تیل ہی ہے۔ بس ہوا یہ ہے کہ کسی کی صحبت نے اسے مہکا دیا ہے۔ چنانچہ اگر یہ تیل کئی برس رکھا رہ جائے تو دھیرے دھیرے اس کی خوشبو اڑتی جائے گی۔ زائل ہوتی جائے گی۔ حتیٰ کہ ایک طویل وقفہ کے بعد یہ امتیاز باقی نہ رہے گا کہ اس میں بیلے کا تیل کون ہے۔ اور چمبیلی اور گلاب کا کون۔ یعنی دھیرے دھیرے خوشبو اڑتی گئی اور آخر میں یہ کہنا پڑا کہ تل کا تیل ہے۔

محسوس ہوا کہ مؤثر جتنا قوی تھا اس کا اثر بھی اسی طرح باقی رہا۔ بعض بعض اثرات تو بہت ہی ضعیف و کمزور ہوتے ہیں۔ مثلاً رومال میں عطر جنت الفردوس لگا کر فوراً کسی گلی سے گذر جائیے تو گلی کا گوشہ گوشہ مہک جائے گا۔ اور ہفتہ عشرہ بعد گذریئے تو اب بجائے عطر کے پسینے کی باس آئے گی۔ محسوس ہوا کہ بہت ہی کمزور مؤثر ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ لیکن مؤثر جب زیادہ قوی ہوتا ہے تو اس کا اثر عارضی نہیں رہتا۔ بلکہ بسا اوقات حقیقت بدلی جاتی ہے گویا انقلاب ماہیت ہوتا ہے۔ مثلاً فلاسفہ کا کہنا ہے کہ عناصر میں کون و فساد ہوتا ہے

کون وفساد کا مفہوم یہ ہے "ایک صورت نوعیہ کو چھوڑ کر دوسری صورت نوعیہ کا اختیار کرلینا۔ چھوڑنے کا نام فساد ہے اور اختیار کرنے کا نام کون ہے۔ مثلاً ہوا کا پانی ہوجانا، یا پانی کا ہوا سے بدل جانا اس کو فلاسفہ کون وفساد سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب اس کو ایک مثال سے سمجھئے تو انشاء اللہ تعالےٰ یہ ضابطہ قلب وجگر میں اپنی جگہ بنالے گا۔ مثلاً گرمی میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر لوٹے میں پانی ڈالا جائے اور برف زیادہ ڈال دی جائے تو کچھ دیر کے بعد آپ دیکھیں گے کہ لوٹے کی سطح بالائی پر پانی نمودار ہو رہا ہے۔ گویا جس طرح ہلکی سی ورزش میں پسینہ نمودار ہو پھر وہ پانی ہلکی ہلکی بوند بنے گا اور ڈھلکنے لگے گا۔ تو کیا ایسا ہے کہ لوٹے میں بہت چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں اور پانی اسی سے نکل رہا ہے۔ آپ کہیں گے نہیں اور ہرگز نہیں۔ تو پھر یہ پانی کیسا؟ حضرات! یہی ہے فلاسفہ کا کون وفساد۔ پانی لوٹے کے اندر سے نہیں آرہا ہے بلکہ برف کی وجہ سے لوٹا اس قدر ٹھنڈا ہوگیا ہے کہ اس کی اوپری سطح سے جو ہوا اس کو چھو جاتی ہے وہ ہوا، ہوا نہیں رہ جاتی ہے بلکہ پانی سے بدل جاتی ہے۔ اسی کا نام ہے کون وفساد۔

یعنی عناصر کا ایک صورت نوعیہ کو چھوڑ کر دوسری صورت نوعیہ اختیار کرلینا۔ واضح رہے یہ مؤثر عارضی نہیں ہے بلکہ یہاں انقلاب حقیقت وماہیت ہے۔ اب ہوا "ہوا" نہیں رہ گئی بلکہ اس نے پانی کا روپ دھارن کرلیا۔ حقیقت میں انقلاب آگیا۔

اب آنکھیں کھولئے، ہوش وگوش سے آنے والی گفتگو سماعت فرمایئے حضرات اسے تو آپ نے تسلیم ہی کرلیا کہ اگر دامن میں عطر لگا کے گذر جائیں تو کوچہ کوچہ گلی گلی مہک جائے۔ مگر یہ بہت ہی کمزور تر مؤثر ہے۔ دو چار روز بعد اثر جاتا رہے گا۔ لیکن گلاب، بیلا، چمبیلی نے جو تل پر اثر ڈالا ہے وہ اس سے مضبوط تر ہے جس کی خوشبو برسوں باقی رہے گی اور لوٹے کی ٹھنڈک جو

ہوا پر اثر انداز ہوئی ہے وہ قوی سے قوی تر ہے۔ حتیٰ کہ ماہیت وحقیقت کا انقلاب ہو گیا۔ چنانچہ اب ہوا، ہوا نہ رہی بلکہ پانی سے بدل گئی۔ لہٰذا اب خیال فرمائیے کہ آنکھ نہ دیکھے مگر روح آئے تو دیکھنے لگے۔ کان نہ سنے مگر روح آئے تو کان سننے لگے۔ یہ کس کا اثر ہے، روح کا۔ لیکن یہ آنکھ اپنے محدود حلقوں میں دیکھے اور کان اپنی حد بندیوں سے آگے نہ سنے۔ یہ عام ارواح کا عالم ہے لیکن یہی روح جب صیقل ہو کر روحانیت کا درجہ حاصل کر لے تو تین سو میل دیکھے اور تین سو میل سے سنے۔

بس اے لوگو مجھے کہہ لینے دو کہ جب ارواح کا یہ عالم ہے تو میرے مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اور روحانیت کا کیا عالم ہو گا۔ ان کا اثر کتنا قوی اور مضبوط ہو گا۔ چنانچہ روح کا وجود ہے مگر دیکھی نہیں جاتی۔ جیسے ہوا۔ اس کا وجود ہے مگر آنکھوں کی گرفت سے ماوراء ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ بس ایسے ہی روح۔ اگر دیکھی نہیں جاتی تو اس کا سایہ بھی نہیں پڑتا۔ عام ارواح کا عالم تو یہ ہے کہ ہماری اور آپ کی روح نظر نہیں آتی مگر جسم نظر آتا ہے مگر میرے مصطفیٰ کی روح کا اثر یہ ہے کہ نہ روح کا سایہ نظر آتا ہے اور نہ ہی جسم کا سایہ نظر آتا ہے۔ روحِ مصطفیٰ اس قدر پاکیزہ و لطیف ہے۔ اور اسی قدر مؤثر کہ جسم کو بھی اپنے ہی سانچے میں ڈھال لیا۔ چنانچہ نہ روح کا سایہ اور نہ جسم کا سایہ۔ یہ تو پیارے روح کا اثر ہے۔ اب جو اس روح کی روحانیت ہے اس کا اثر یہ ہے کہ جسمِ مصطفیٰ پر جو کپڑا آجائے اس کا بھی سایہ نہ پڑے۔ چنانچہ صحابۂ کرام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جسم مبارک کا سایہ نہ تو ہم نے سورج کی دھوپ میں دیکھا اور نہ ہی چاند کی چاندنی میں۔ گویا روح نے بدن پر اثر ڈالا کہ جسم کا سایہ نہ ہوا اور روحانیت اس سے بھی قوی تر مؤثر ہوئی کہ کملی اور پیراہن مبارک تک کا سایہ نہ پڑے۔ نور ایسا لطیف و پاکیزہ کہ اگر حجرۂ عائشہ میں مسکرا دیں تو دندانِ مبارک کی روشنی سے حضرت سیدہ عائشہ

کی گم شدہ سوئی مل جائے۔ اور اگر دست مبارک سے کسی صحابی کی لکڑی چھولیں تو اس میں سے روشنی پھوٹ پڑے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی راہ رات کی تاریکی میں اس کی روشنی سے طے کریں۔ گویا لکڑی نہیں ٹارچ ہے جو روشنی کا کام کر رہی ہے۔

حضرات! یہ تو روحِ مصطفےٰ کا اثر ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ خود سرکار کا جسم مبارک کتنا مؤثر ہے۔ ہمارے بدن کا پسینہ بدبودار ہو جس کی بدبو ہم خود نہ برداشت کر سکیں اور وہی پسینہ نبی کے مسامات سے خارج ہو تو عطر کے کارخانے بھی سرِ نیاز جھکا دیں۔ بلکہ سیدنا امام احمد رضا کی زبان میں تو یوں کہا جا سکتا ہے ؎

واللہ جو مل جائے مرے گل کا پسینہ
مانگیں نہ کبھی عطر نہ پھر چاہیں دلھن پھول

حضرات! یہ انقلاب حقیقت نہیں تو اور کیا ہے۔ ہمارے اور آپ کے بول و براز سے دنیا نفرت و گھن محسوس کرے اور حضرت ربیعہ سرکار کا پیشاب رات کی تاریکی میں پی جائیں تو پانی و پیشاب میں فرق نہ محسوس کریں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے حق میں وہ شفا ہو جائے۔ سُبحٰنَ اللہ سبحٰن اللہ

ایک سوال کا جواب

حضرات! ابھی میں نے آپ سے عرض کیا کہ سرکار کی روح اس قدر مؤثر ہے کہ اس کا سایہ نہیں تو جسمِ مصطفےٰ کا بھی سایہ نہیں۔ اب آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ روح نظر نہیں آتی تو جسم مصطفےٰ کو بھی نظر نہیں آنا چاہئے تھا؟ میں عرض کروں گا جناب کمال اور اعجاز مصطفےٰ تو یہی ہے کہ جسم نظر بھی آ رہا ہے اور سایہ بھی نہیں ہے۔ اگر جسم نظر نہ آکر سایہ نظر آتا تو یہ ایک طبعی خلقی اور فطری امر کہا جاتا۔ گویا ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے مگر انتہائے کمال تو یہ ہے کہ جسم دیکھا بھی جا رہا ہے اور سایہ بھی نظر نہیں آتا۔ جیسے روح نظر نہیں آتی اور اس کا

سایہ بھی نظر نہیں آتا تو یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ بات تو جب حیرت انگیز ہوتی کہ روح نظر نہ آتی اور اس کا سایہ نظر آتا تب اسے مافوق الفطرت میں شمار کیا جاتا۔ روح جسم کا لباس نہ پہنے اور پھر اس کا سایہ نظر آئے تو یہ اس کا کمال ہے۔ چونکہ یہ سایہ روح کا نہیں جسم کا ہے۔ ایسے ہی جسم مصطفےٰ نظر نہ آئے اور سایہ بھی نہ پڑے تو یہ کمال نہیں ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ جسم دیکھا جا رہا ہے مرئی ہے مگر سایہ نہیں نظر آ رہا ہے۔ میرے سرکار کی تو شان ہی نرالی ہے۔ گویا بدن بھی مؤثر، روح بھی مؤثر روحانیت بھی مؤثر۔ ہر ہر عضو مؤثر، ہر ہر ادا مؤثر،

حضرات! روح اور روحانیت سے متعلق اصول و ضابطے کی روشنی میں یہ ایک تمہیدی تصویر تھی۔ اب پھر وہیں آجائیے یعنی روح اور روحانیت کا خطِ امتیاز، اب میں چاہتا ہوں کہ اسے واقعات اور مشاہدات کی روشنی میں، سمجھایا جائے تاکہ دونوں کے درمیان ایسی واضح لکیر پڑ جائے جس طرح گنگا جمنا کے سنگم کی کشادہ لائن نشاندہی کرتی ہے کہ یہ گنگا ہے اور وہ جمنا۔ جمنا کا پانی ہرا ہوگا، گنگا کا مٹیالے رنگ کا اور لائن ملگجے رنگ کی۔

اب ذہنی و فکری توانائیوں کے ساتھ مخاطب ہو جائیے تاکہ آپ پر روح و روحانیت کا خطِ امتیاز واضح ہو سکے۔

ایک بار کسی نیازمند متوسل نے حضرت مخدوم کلیری رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ حضور ہم فنا اور بقا بولتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ فنا کیا ہے بقا کیا ہے۔ حضرت مخدوم پاک نے فرمایا جواب آج نہیں دوں گا پھر کبھی اس سے کوئی یہ نہ خیال کرے کہ حضرت کو جواب نہیں معلوم تھا۔ کتابیں لغات اور

اور کتب خانے کا سہارا لے کر جواب عطا فرمائیں گے۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ ایک جواب فکری و نظری ہوتا ہے اور دوسرا مشاہدے کا۔ مثلاً آپ نے کبھی شیر نہیں دیکھا تھا کسی سے دریافت کیا کہ بھائی صاحب شیر کیسا ہوتا ہے۔ اس نے آپ کو سمجھایا بہت ہی قوی ہیکل ہوتا ہے۔ ڈھائی تین فٹ اونچا، چار ساڑھے چار فٹ لمبا بڑے بڑے ناخون، چار ٹانگ، کلے جبڑے والا۔ دھاڑیں ایسی مارتا ہے جیسے بادل گرجے تو آپ کا ایک تصور و خیال جم جائے گا چونکہ آپ نے کبھی دیکھا نہیں تو اس کا بھی امکان ہے کہ بھیڑیے اور چیتے کو دیکھ کر آپ شیر سمجھ لیں۔ برخلاف اس کے آپ نے مولانا عبدالرزاق جبل پوری سے کہا میں نے کبھی شیر نہیں دیکھا شیر کیسا ہوتا ہے۔ وہ آپ کو لئے ہوئے سیدھے رانی باغ چلے گئے اور اس کو کٹہرے کے سامنے کھڑا کر دیا جہاں شیر دھاڑیں مار رہا تھا۔ اور کہا دیکھئے وہ شیر اب فکری، نظری، تصوراتی و خیالاتی جواب نہیں ہے جسمیں شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہو بلکہ یہ آنکھوں کا مشاہدہ ہے جسمیں شک وارتیاب کا شائبہ تک نہیں۔ گویا حضور مخدوم پاک اسے فکری و نظری جواب دینا نہیں چاہتے تھے بلکہ مشاہدے سے اسے آپ یوں بھی سمجھئے

ایک دوسری مثال

ایک بار کسی معتقد نے ایک مولوی صاحب سے سوال کیا حضور آج کا مسلمان کیسا بدعقیدہ ہے کہ وہ اس طرح کی غلط آرزوئیں کرتا ہے کہ خدا وندا! مرنے کے بعد قبر کے لئے اجمیر میں دو گز زمین مل جائے۔ بغداد اور کلیر میں مل جائے حالانکہ اس سے ہوتا کیا ہے اگر گنہگار و خطا کار ہے تو اپنے جرم کی سزا پائیگا زمین کے بدل جانے سے کیا ہوگا۔

نوٹ:۔ ہاں کچھ ایسے بھی گندم نما جو فروش مبلغین ہیں جن کا خیال ہے کہ ان کو ان کے ہر جرم کی سزا ملے گی اس کی معافی نہیں ہے مگر ہم اہلسنت کا کہنا ہے کہ

یہ بات تو ارادۂ الٰہی اور مشیت ایزدی پر موقوف ہے وہ جس مجرم کو چاہے سزا دے اور جسے چاہے اپنے فضل وکرم سے معاف کر دے۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ اس خادم نے جب مولانا سے دریافت کیا کہ زمین بدل جانے سے کیا ہوتا ہے تو مولانا نے کہا! جواب آج نہیں پھر کبھی دوں گا۔ چنانچہ ایک بار وہی خادم مولانا کو پنکھا جھل رہا تھا۔ ارد گرد کچھ اور بھی لوگ حاشیے پر بیٹھے تھے مولانا کو خادم کا سوال یاد آ گیا۔ فرمایا تم نے ایک بار مجھ سے سوال کیا تھا جس کا جواب میں نے ٹال دیا تھا آج تم اپنا سوال دہراؤ تاکہ تمہیں جواب دیدیا جائے۔ اس نے اپنا سوال دہرایا مولانا نے خادم سے دریافت کیا۔ ایک بات بتاؤ تم اس وقت کیا کر رہے ہو! اس نے کہا حضور پنکھا جھل رہا ہوں۔ مولانا نے فرمایا۔ اچھا ایک بات اور بتاؤ۔ پنکھا تو مجھ کو جھل رہے ہو کیا ہوا مجھ کو ہی لگ رہی ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ پنکھا تو آپ ہی کو جھل رہا ہوں مگر آپ کی بدولت ہوا دوسروں کو بھی لگ رہی ہے جو آپ کے پڑوس میں بیٹھے ہیں۔ مولانا نے فرمایا، تیرے سوال کا جواب ہو گیا۔ یعنی جس طرح پنکھا مجھ کو جھل رہا ہے مگر میری وجہ سے مرے پڑوس کو بھی ہوا لگ رہی ہے۔ بس ایسے ہی جو مسلمان یہ آرزو کرتا ہے کہ مرنے کے بعد خواجہ کا پڑوس مل جائے بغداد کی زمین مل جائے غازی میاں کا قرب حاصل ہو تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ جب خواجہ کے پڑوس میں ہوں گے اور رحمت کی بارش ہو گی تو کچھ چھینٹیں مجھ پر بھی آ جائیں گی۔ ایسے ہی جب رحمت کی ہوائیں آئیں گی تو کچھ جھونکے ادھر بھی آ جائیں گے۔ اسے رحمت ومغفرت کا سامان کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور مثال کاٹھیاواڑ کی میمن قوم جو بہت ہی مخلص، بہت ہی مخیر، دیندار اور خوش عقیدہ ہے ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ بت پرست قوم تھی۔ ایک بار ان کا قافلہ کسی مندر کی پوجا کے لئے جا رہا تھا۔ اتفاق سے درمیان میں ایک دریا حائل ہو گیا۔ ان لوگوں نے

وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ کشتی مل جائے تو جائیں حسن اتفاق ہی کہئے وہیں کہیں سیدی سرکار غوث الاعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی اولاد امجاد سے کوئی بزرگ تشریف فرما تھے۔ انھوں نے قافلے سے دریافت فرمایا تم لوگ جاتے کیوں نہیں ہو۔ اہل قافلہ نے جواب دیا۔ آخر ہم کیسے جائیں۔ بیچ میں دریا حائل ہے کشتی بھی نہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی سادھن بھی نہیں۔ خدا کی طرف سے ہدایت ان کے حق میں مقدر ہو چکی تھی۔ آپ کو ان کے حال زار پر ترس آیا۔ فرمایا! اچھا اگر وہ مندر یہیں آجائے تو؟ قافلے نے ایک زبان ہو کر کہا پھر اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا تم لوگ آنکھیں بند کر لو۔ فرمایا! اب آنکھیں کھول دو۔ آنکھیں جیسے ہی کھولا مندر کو سامنے پایا۔

آپ نے طنزاً کہا اس کی پوجا کرو۔ اب اسلام کے لئے ان کے دلوں کا دروازہ کھل چکا تھا۔ پورے قافلے نے کہا اب تم کو پوجیں یا مندر کو۔ جس کی انگلیوں کے اشارے سے مندر ڈول رہا ہے۔ اب اسے کیوں کر پوجا جائے لہٰذا اب آپ ہمیں مشرف بہ اسلام کیجئے، مگر ہماری دو شرطیں ہیں:

(۱) اوّلاً ہم میں حسن ہو۔

(۲) دوئم دولت۔

آپ نے دعا مانگی اور خدا نے عطا فرمایا۔ چنانچہ میمن قوم میں حسن و دولت دونوں ہیں۔ اسے فکری و نظری نہیں بلکہ مشاہدہ کہا جاتا ہے۔

حضرت مخدوم کلیری کا جواب لہٰذا جب نیاز مند نے دریافت کیا کہ حضور ہم فنا و بقا تو بولتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ فنا کیا ہے؟ اور بقا کیا ہے اس وقت اس کا جواب آپ نے کچھ نہ دیا۔ وصال سے قبل حضرت مخدوم پاک نے

اپنے نیازمندوں کو وصیت فرمائی کہ میرے وصال کے بعد تم میں سے کوئی مجھے نہلانا اور کفنانا نہیں۔ باہر سے حجرے کی کنڈی لگا دینا اور جب تک پانی چھلکتا اور بہتا محسوس ہو۔ آثار غسل معلوم ہوتے ہوں تو کنڈی ہرگز نہ کھولنا۔ اور جب اسکی علامت و آثار ختم ہو جائیں تو کنڈی کھول دینا۔ اور دوسری بات یہ فرمائی تم لوگوں میں سے کوئی میری نماز جنازہ نہ پڑھائے۔ ایک گھوڑ سوار آئے گا۔ جس کے چہرے پر نقاب پڑی ہوگی وہی میری نماز جنازہ پڑھائے گا۔

آخر آپ کا وصال ہوا۔ دار فانی سے دار بقا کو رحلت فرمایا۔ لوگوں کو آپ کی وصیت یاد تھی۔ حجرہ بند کر دیا اور جب تک آثار غسل معلوم ہوتے رہے باہر سے کنڈی لگی رہی اور جب یہ علامت ختم ہو گئی تو حجرہ کھول گیا، تو کیا دیکھا؟ کہ مخدوم پاک نہلائے اور کفنائے جا چکے ہیں لوگ حیرت زدہ تھے۔ آخر یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں اب اسی عالم حیرانی میں اس گھوڑ سوار کا انتظار ہو رہا ہے جو نماز جنازہ پڑھائے گا۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد غبار اٹھتا نظر آیا۔ دھول اڑتی نظر آئی یقین ہو گیا ہو نہ ہو کوئی آ رہا ہے۔ یہ تو کسی آنے والے ہی کی علامت ہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دیر بعد گھوڑ سوار سامنے آ گیا جس کے چہرے پر نقاب پڑی تھی۔ اس کے آتے ہی قطاریں درست کر لی گئیں صفیں سیدھی ہو گئیں آنے والا مصلائے امامت پر کھڑا ہو گیا۔ اور اللہ اکبر کہا اور سب نے اس کی اقتدا میں نماز جنازہ ادا کر لی۔

نماز پڑھانے کے بعد اب یہ گھوڑ سوار آگے بڑھا تاکہ سوار ہو کر آگے بڑھ جائے۔ بس اسی اثنا میں معتقد خاص آگے بڑھا اور عرض کیا حضور آپ تو چلے جائیں گے مگر آپ کو یہ معلوم ہے کہ آپ نے کس کی نماز جنازہ پڑھائی ہے؟

اے حضور! یہ اللہ کا وہ مقرب بارگاہ بندہ ہے جو اپنے وقت

کا عارف حق اور ولی کامل ہے جس کے دامن سے لاکھوں مسلمان وابستہ ہیں کل میرے مخدوم کی تاریخ لکھی جائے گی۔ لوگ ہم سے دریافت کریں گے کہ مخدوم پاک کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی تو ہم کس کا نام بتائیں گے اور کیا جواب دیں گے۔ لہٰذا نیازمند کی عرضداشت قبول فرماتے ہوئے اپنا نام ارشاد فرمائیں۔ ورنہ کم از کم چہرے کا نقاب ہی الٹ دیں تاکہ ہم دیکھ اور پہچان سکیں۔ ورنہ مخدوم کی تاریخ اندھیرے میں رہ جائے گی۔ اور عقیدت کیشوں کی دنیا ہمیں کبھی معاف نہ کرے گی۔

یہ سنتے ہی گھوڑ سوار نے چہرے کا نقاب الٹ دیا۔ نقاب اٹھتے ہی پورا مجمع حیرت زدہ، ہکا بکا رہ گیا۔ سناٹا اور سکتے کا عالم۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ معتقد خاص نے ہمت کرکے دریافت کیا، اے حضور آخر ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔ چونکہ سامنے کوئی اور نہ تھا۔ مخدوم پاک ہی کھڑے تھے۔ مخدوم پاک نے فرمایا، کیا تم بھول گئے۔ تم نے ہی تو ایک روز دریافت کیا تھا کہ فنا دبقا بولتے تو ہیں مگر نہیں جانتے کہ فنا کیا ہے اور بقا کیا ہے۔ میں نے اس کا جواب آج ہی پر ٹال رکھا تھا اور آج تم کو اسی کا جواب دینا ہے۔

دیکھو جیسے تم گہوارے میں دیکھ رہے ہو اسی کا نام فنا ہے اور جسے تم نے گھوڑے پر آتے دیکھا اور اب جاتے دیکھو گے۔ اس کا نام بقا ہے۔

معلوم ہوا گہوارہ میں روح کا جلوہ ہے اور گھوڑے پر روحانیت کا۔ وہ فنا ہے اور یہ بقا ہے۔

حضرات! میں یہی عرض کر رہا تھا کہ روح کا مقام اور ہے روحانیت کا مظہر اور۔

اے روح کا تعاقب کرنے والو کبھی اس کا بھی سراغ لگاؤ روحانیت کا سرچشمہ کہاں ہے۔ اور یہ دولت گرانمایہ کہاں سے ملتی ہے یہ حقیقت آپ پر واضح رہے جس طرح انسان اور ہے "انسانیت اور ہے

آدمی اور ہے اور آدمیت اور ہے۔ ایسے ہی روح اور ہے روحانیت اور۔

حضرات! ابھی ابھی میں نے مشاہدے کی مثال دیتے ہوئے سرکار غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد امجاد کی ایک کرامت کا ذکر کیا تھا وہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اب مجھے کہہ لینے دیجئے، جو مندر کی پوجا کرنے جا رہے تھے وہ صرف روح والے تھے۔ اور جس کے اشارے پر بہ نفس نفیس مندر ہی آگیا تھا وہ صرف روح والا ہی نہیں بلکہ روحانیت والا تھا۔

حضرات! یہی وہ واقعات و مشاہدات ہیں جو روح اور روحانیت کے درمیان خط امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی ابھی میں نے آپ کو بتایا انسان اور ہے انسانیت اور ہے۔ ہر دو ٹانگ والے مستوی القامت کو انسان کہا جاتا ہے مگر یہ کچھ ضروری نہیں کہ اس میں انسانیت بھی ہو انسانی روپ میں تو ہے مگر یہ بھی دیکھو کہ انسانی صفات بھی ہیں یا نہیں؟ آدمی کے محبوب و پسندیدہ اوصاف ہی اس کی آدمیت اور انسانیت کی روشن دلیل ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی وقت ایسا آگیا کہ آپ کئی دن کے بھوکے پیاسے ہیں۔ دسترخوان پر نوع بنوع اور طرح طرح کے دل پسند کھانے چن دیئے گئے۔ ابھی کوئی نوالہ حلق سے نہ اترا تھا کہ ایک بھوکا پیاسا مسافر آگیا اسے دیکھتے ہی آپ کا دل پسیجا ترس آیا، دسترخوان سے فوراً اٹھ گئے اور اسے کھلا کر شکم سیر کر دیا۔

اب یہیں مجھے کہہ لینے دیجئے یہ صرف انسان نہیں کھلا رہا ہے انسانیت کھلا رہی ہے۔ بظاہر ہاتھ تو انسان ہی کے اٹھ رہے ہیں مگر مسافر نوازی کا یہ جذبۂ ہمدردی انسانیت کی فیض بخشی کا نتیجہ ہے۔

حضرات! بس ایسے ہی جب روح صیقل ہو کر جلا پاتی ہے تو روحانیت کی طرف بڑھتی ہے اور جیسے جیسے وہ مدارج عُلیا اور منزل ارتقا کو عبور کرتی جاتی ہے۔ ویسے ویسے منتہائے کمال سے قریب اور قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ روحانیت جتنے بلند مقام پر ہوگی۔ ویسے ہی اس کے اثرات بھی مرتب ہونگے

حضرات! جب بات آہی گئی ہے تو اس مفہوم کو اور بھی دو ایک مثالوں سے واضح کر دیا جائے تاکہ اس کا کوئی بھی گوشہ تاریک نہ رہ جائے اور یہ موضوع قلب و جگر میں اپنی صحیح جگہ بنا سکے۔

خواب کی تعبیر اور حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ

حضرات آپ لوگوں نے سنا ہو گا۔ کہ ایک بار کسی نے خواب دیکھا کہ وہ عرش الٰہی اپنے کاندھے پر لئے جا رہا ہے۔ چونکہ خواب بہت ہی اہم اور پیارا تھا اس لئے وہ اس کی تعبیر کے لئے سرگرداں تھا۔ جو بھی ملتا اپنے غیرے سبھی سے پوچھتا مسلمانوں کا مزاج ہے کہ جب وہ اچھا خواب دیکھتا ہے تو اس کی تعبیر کے لئے بے چین رہتا ہے۔ ہوشمندوں نے اس کو آگہی دی کہ اے نادان! اونچے خواب کی تعبیر کسی اونچے ہی سے دریافت کرنی چاہئے۔ اور اس وقت ہم میں سب سے زیادہ عظیم ترین شخصیت حضرت جنید بغدادی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ہے۔ لہٰذا اگر اپنے خواب کی تعبیر لینا چاہتے ہو تو بارگاہ جنید میں چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اسی غرض سے بغداد کے لئے روانہ ہوا مگر جب وہ بغداد کی شاہراہ پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ آدمیوں کا ایک بڑا ہجوم سڑک سے گذر رہا ہے۔ ایسا ازدحام اور جم غفیر کہ کاندھے سے کاندھا چھل رہا تھا۔ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ لوگوں سے اس اجنبی نے پوچھا انسانوں کی یہ کیسی بھیڑ بھاڑ ہے۔ لوگوں نے بتایا کیا تجھے نہیں معلوم عارف باللہ حضرت جنید بغدادی کا وصال ہو گیا ہے۔ اور اللہ کے اسی برگزیدہ بندے کا جنازہ جا رہا ہے۔

اس نے ہائے کر کے سینے پر ہاتھ رکھا اور غمناک آنکھوں کا آنسو اپنی آستینوں میں جذب کر لیا۔ یہ سمجھا کے دل کو ڈھارس دی کہ یہی سعادت کیا کم ہے کہ ایک ولی کے جنازے کو کاندھا دینا میسر آگیا۔ لپکا اور آگے بڑھا۔

یہاں پہنچ کر سرخیل عاشقاں حضرت امیر خسرو کا عشق و محبت میں ڈوبا ہوا واقعہ یاد آ گیا۔ جو واقعہ میں عرض کرنے جا رہا ہوں اسے سماعت فرمائیں اور اسے گوشۂ ذہن میں محفوظ رکھیں۔

سلطان المشائخ حضرت سرکار نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بہت ہی چہیتے مرید حضرت امیر خسرو کو ایک بار "پرانی دلی" کسی کام سے بھیجا۔ جب وہ یہاں پہنچے تو کیا دیکھا کہ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے سڑک جام ہے ادھر سے اُدھر جانا ایسے ہی ہے گویا کوہ ہمالہ کی چوٹی پار کرنا۔

حضرت امیر خسرو نے لوگوں سے دریافت فرمایا "یہ بھیڑ بھاڑ کیسی ہے"۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت! آج اللہ کے اس ولی کا وصال ہو گیا ہے جس نے اپنے وصال سے پہلے کہہ دیا تھا کہ جو میرے جنازہ کو کاندھا دے گا وہ جنتی ہو جائیگا۔ چنانچہ اللہ کے اسی محبوب بندے کا جنازہ جا رہا ہے۔ بھلا یہ سننے کے بعد اب کون اپنے گھر رہ سکتا ہے۔ گویا آج مکانوں میں تالے لگ گئے ہیں۔ جنت لینے کے لئے سبھی دوڑے جا رہے ہیں۔

مگر یہ سنتے ہی حضرت خسرو نے اپنے آپ کو ایک کالی کوٹھری میں چھپا لیا۔ جب جنازہ گذر جانے کے بعد راستہ صاف ہو گیا۔ تو باہر نکلے اور سامان لے کر حضرت سلطان المشائخ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔

محبوب الٰہی نے فرمایا! خسرو! بہت دیر ہو گئی۔ جواباً عرض کیا حضور راستہ خالی نہیں تھا۔ فرمایا کون سی ایسی خاص بات تھی۔ عرض کیا۔ اللہ کے ایک ایسے ولی کا جنازہ جا رہا تھا۔ جنھوں نے اپنے وصال سے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ جو میرے جنازہ کو کاندھا دے گا وہ جنتی ہو جائے گا۔ یہ سنکر پوری دلی ٹوٹ پڑی۔ ایسی بشارت عظمیٰ کے بعد کون اپنے گھروں میں رہ سکتا ہے۔ محبوب الٰہی نے فرمایا۔ اچھا تو تم بھی کاندھا دینے چلے گئے تھے۔ اسی لئے دیر ہو گئی؟

امیر خسرو نے عرض کیا، حضور! ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ سننے کے بعد میں

نے اپنے آپ کو کوٹھری میں چھپا لیا تھا۔

محبوب الٰہی نے فرمایا۔ حیرت کی بات ہے۔ جنت مفت میں مل رہی تھی تم لینے کیوں نہیں گئے۔؟

حضرت خسرو نے عرض کیا۔ ان کا ولی ہونا برحق۔ ان کا فرمان بھی سر آنکھوں پر۔ لیکن اے حضور! یہ معلوم ہونے کے بعد کہ جو جنازے کو کاندھا دے گا۔ وہ جنتی ہو جائے گا۔ اب اگر میں جنازے کو کاندھا دینے جاتا تو میں دنیائے عشق و محبت کا مجرم قرار پاتا۔ دنیا مجھے طعنہ دیتی کہ خسرو کو اپنے پیر پر اعتماد نہیں تھا جبھی تو دوسرے سے جنت لینے گیا تھا۔ میرے سرکار آپ کے پاس کس چیز کی کمی ہے جنت بھی لوں گا تو آپ سے اور آپ ہی والی۔

میرے بھائیو! پیر ہو تو ایسا۔ مرید ہو تو خسرو جیسا۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جب وہ پردیسی خواب کی تعبیر لینے بغداد پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ حضرت جنید بغدادی کا جنازہ ہے۔ کاندھا دینے کے لئے آگے بڑھا اور گرتے پڑتے گہوارے تک پہنچ گیا۔ دل دھڑکا۔ آنکھیں اشکبار ہوئیں کاندھا دیتے ہوئے عرض کیا۔ حضور! تم سے ہی تعبیر لینے آئے تھے اور تمہیں چلے بھی جا رہے ہو۔

بس اس کا اتنا کہنا تھا کہ گہوارے سے مدھم آواز آئی نادان! یہی تو تیرے خواب کی تعبیر ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم "قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰہِ" یعنی مومن کا دل عرش الٰہی ہوتا ہے۔ گویا تو جنازہ نہیں بلکہ اپنے کاندھے پر عرش الٰہی اٹھائے ہوئے ہے۔ یہی تیرے خواب کی تعبیر ہے۔

دوستو! مجھے بتاؤ کہ گہوارے میں سو کون رہا ہے؟ اور اسی گہوارے سے بول کون رہا ہے؟

حضرات! اب مجھے پھر کہہ لینے دیجئے جو خاموش سو رہا ہے وہ روح کا جلوہ ہے اور جو بول رہا ہے وہی روحانیت کا منظر ہے۔

ایک بہت ہی اہم بات حضرات! ذہن وفکر پر دباؤ ڈال کر اس کا فیصلہ کیجیے کہ آخر یہ مضمون میں نے اٹھایا کیوں ہے۔

دوستو! روح اور روحانیت کی تقریر کا حاصل اور نچوڑ یہ ہے کہ اسے غور سے دیکھو کہ اس جسم کا تعلق صرف روح سے ہے یا روحانیت سے بھی۔ اگر اس کا تعلق صرف روح سے ہوگا تو اگر روح نکل جائے گی تو جسم برباد ہو جائے گا۔ لیکن اگر جسم کا تعلق روحانیت سے بھی ہوگا تو روح جاتی رہے گی۔ پھر بھی آنکھ دیکھے گی۔ اور کان سنے گا وہ جسم برباد نہ ہوگا۔

یہاں پہنچ کر اب میں ایک ایسی تاریخی دستاویز پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے میرے دعوے کی توثیق بھی ہو جائے اور اس محضر نامے کی آخری مہر بھی ثابت ہو۔

حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کا دور ہے۔ یہ واضح رہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہٗ صحابیٔ رسول ہیں اور سرکار کے کاتب خصوصی۔ وحی الٰہی کے لکھنے والے اور عشقِ مصطفےٰ میں ڈوبے ہوئے۔ چنانچہ ایک بار حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہٗ کی موجودگی میں سید عالم روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ناخن اقدس تراشا گیا۔ آپ نے اسے ضائع نہ ہونے دیا بلکہ حفاظت سے رکھ لیا۔ جب آپ کے وصال کا وقت قریب ہوا تو اپنے وارثین سے فرمایا جب میرا وصال ہو جائے تو مجھے نہلانا دھلانا، کفنانا، نماز جنازہ پڑھنا۔ لیکن جب مجھے قبر میں اتارنا تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تراشا ہوا ناخن پاک ہے جسے میں نے آج ہی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اسے میرے جوڑ جوڑ پر رکھ دینا جسے میں اپنی سعادت ونجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ ہر چند کہ میں نے نمازیں پڑھی ہیں۔ سجدے کئے ہیں۔ لیکن سجدہ اپنا ہے۔ ناخن مصطفےٰ کا ہے۔ مجھے کہہ لینے دیجیے

کہ حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ صحابیٔ رسول ہیں وہ ناخن پائے اقدس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نجات کا وسیلہ بنا رہے ہیں تو جس کا ناخن وسیلہ بن سکتا ہے پھر اس کی ذات وسیلہ کیوں نہیں بن سکتی؟

لیکن توحید کے نام نہاد ٹھیکیداروں کا حال یہ ہے کہ اس نماز کو وسیلہ بنائیں گے جس کے بارے میں انھیں خود بھی اطمینان نہیں ہے کہ یہ مقبول ہے۔ یا نامقبول۔ اچھا اتنا بڑا مجمع ہے اس میں نمازی بھی ہیں اور حاجی بھی۔ کیا کوئی حاجی صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے میرے حج کو قبول کر لیا۔ اگر یہ سوال کیا جائے۔ اور دل مر نہیں گیا زندہ ہے تو آنکھوں سے آنسو برس پڑے گا اور جواب یہی ہوگا کہ حج کرنا ہمارا کام ہے اور قبول کرنا خدا کا کام ہے۔

ایسے ہی اگر کسی ایسے نمازی سے سوال کیا جائے جس نے دو بجے رات کی تاریکی میں چپکے سے قدم بڑھا کر وضو کا پانی انڈیلا۔ حتیٰ کہ برتن کے کھنکنے کی آواز تک نہ آئی ہو۔ مصلیٰ بچھایا دو رکعت نماز نفل پڑھی۔ اس نمازی کے کسی ایک سجدے ہی کے بارے میں کوئی یہ کہدے کہ خدا نے اس کا سجدہ قبول کر لیا۔ اس لئے یہ وہ نماز ہے جسمیں ریا نہیں تصنع اور بناوٹ نہیں۔ دکھاوا نہیں خالص اللہ کے لئے پڑھی گئی۔ یا تو سجدہ گذار جانے یا جس کے لئے سجدہ ہے وہ جانے لیکن اس سوال پر بھی کلیجہ پھٹ جائے گا۔ جواب یہی ہوگا کہ سجدہ کرنا ہمارا کام تھا۔ قبول کرنا خدا کا کام۔

غور کیجئے کہ عبادات سے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ پتہ نہیں نمازیں مقبول ہیں یا نامقبول۔ مگر قربان جائیے میرے مصطفےٰ کا نام ہی رکھ دیا گیا رسول مقبول۔ وہ پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک مقبول ہی مقبول ہیں۔ اور ایسے مقبول کہ اگر کسی نامقبول کو چھو دیں تو وہ بھی مقبول ہو جائے۔ حیرت کلیجہ پیٹ رہی ہے۔ انسانیت ماتم کر رہی ہے کہ جس کے مقبول ہونے میں غدغہ اور خدشہ ہو پتہ نہیں مقبول یا نامقبول۔ اسے نجات کے لئے وسیلہ بنایا جائے۔

اور جو سراپا مقبول ہی مقبول ہو اسے وسیلہ نہ بنایا جائے۔ اس سے بڑھ کر رسول دشمنی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور ان شاء اللہ ان کے لئے میرے سرکار وسیلہ بنیں گے ہی نہیں۔ یہ یونہی مارے مارے پھریں گے۔ بحمدہٖ تعالیٰ ہم اہل سنت وسیلہ کے قائل ہیں۔ سرکار ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان وسیلۂ نجات، اور نجات دہندہ ہوں گے۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

ہاں میں عرض یہ کر رہا تھا کہ حضرت امیر معاویہ کے زمانے میں نہر کھودی جا رہی تھی۔ نہر کھودنے والے اور پھاؤڑا چلانے والے اس جگہ پہونچے جہاں ۴۵ سال پہلے جہاد ہو چکا تھا۔ وہاں ایک نعش برآمد ہوئی جن کے سینہ پر تیر پیوست ہو گیا تھا اور وہی جان لیوا ثابت ہوا۔ چنانچہ دونوں ہاتھ اسی زخم پر رکھ کر انھیں سلا دیا گیا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے لیکن جیسے ہی بدن کو جنبش ہوئی وہ دونوں ہاتھ سینے سے نیچے لٹک گئے۔ آپ نے کچھ محسوس کیا کہ میں بار بار اس پر کیوں زور دے رہا ہوں کہ ہاتھ سینے سے لٹک گئے۔

حضرات! آپ میں سے اکثر کو یہ تجربہ ہوگا کہ جب کسی کے نزع کی کیفیت ہوتی ہے تو بڑے بوڑھے اسے تنہا نہیں چھوڑتے۔ روح جیسے پرواز کرتی ہے اگر مرنے والے کی آنکھ کھلی ہو تو لوگ بند کر دیتے ہیں۔ کوئی ہاتھ یا پاؤں اگر ٹیڑھا ہے تو اسے سیدھا کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بدن میں جب تک روح کی گرمی رہے گی تو کھلی آنکھ بند کی جا سکتی ہے۔ ٹیڑھے اعضا سیدھے کئے جا سکتے ہیں۔ مگر جیسے ہی بدن سے روح کی حرارت ختم ہو جائے گی تو پھر جو عضو ٹیڑھا ہے وہ ٹیڑھا ہی رہ جائے گا۔

اب مجھے کہنا یہ ہے کہ ۴۵ برس کی نعش ہے سینے پر۔ ہاتھ ۴۵ برسوں سے رکھا ہوا ہے اسے تو جام ہو جانا چاہئے تھا، ہٹانے سے بھی نہیں ہٹنا چاہئے تھا۔ مگر عالم یہ ہے کہ ہلکی جنبش پاتے ہی سینے کا ہاتھ نیچے لٹک گیا۔ ہاتھ کی یہ کیفیت زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ یہ مردہ نہیں ہے زندہ لیٹا ہے۔

حضرات! شہید کی زندگی تو وہ ہے جس پر نص قرآنی شاہد عدل ہے۔
وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ
اللہ کی راہ میں جو قتل کئے گئے ہیں اسے مردہ نہ کہو۔ وہ زندہ ہیں تمہیں شعور نہیں۔ (الآیۃ)

غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ وہ ہے جس نے ناموس مصطفےٰ پر اپنی جان دے دی ہے تو جب جان دینے والا زندہ ہے۔ ناموس والا کیوں نہ زندہ ہوگا۔ یہ ہزار زندہ سہی مگر ہے تو سرکار ہی کا غلام جبکے غلام کی یہ شان ہوگی اس کے آقا کا مقام کتنا بلند و بالا ہوگا۔

حضرات! مجھے اس مقام پر ایک بات یاد آئی۔ صوبہ اتر پردیش میں کوہ ہمالہ کے دامن میں ایک تاریخی شہر ہے جس کا نام بہرائچ شریف ہے۔ وہاں اللہ کے محبوب بندہ جن کی شہادت جمہوری ہے کسی کو بھی اختلاف نہیں خواہ اپنے ہوں یا بیگانے۔ بلکہ بیگانے وہاں کی چادر و مالیدہ اور چڑھاوے سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ شرک و بدعت کی قلعی وہاں جاتے ہی کھل جاتی ہے وہاں پہونچ کر شرک و بدعت کے سارے فتاوے نذر آتش ہو جاتے ہیں۔

ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ بہرائچ شریف میں سید سالار مسعود غازی علیہ الرحمہ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔ چنانچہ خلجی بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ نے غازی میاں کے آستانے پر حاضری دی تھی اس وقت وہاں کوئی بزرگ تھے جن کی ولایت مشہور تھی۔ بادشاہ نے ان سے عرض کیا میں آستانہ پر حاضری دینا چاہتا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ حاضری آپ کے ساتھ ہوتی۔ اللہ کے محبوب بندے نے کہا میں تو حاضری دیتا ہی رہتا ہوں۔ اگر تمہاری خواہش ہے تو چلا چلتا ہوں۔ چنانچہ بادشاہ اور درویش دونوں چلے لیکن درویش ٹیڑھے ٹیڑھے چل رہے تھے۔ بادشاہ سے نہ رہا گیا تو پوچھ بیٹھا حضور راستہ تو سیدھا ہی ہے

اور صاف بھی مگر آپ ٹیڑھے ٹیڑھے کیوں چل رہے ہیں کبھی پاؤں آگے کبھی پاؤں پیچھے کبھی دائیں کبھی بائیں۔ ایسا کیوں ہے۔ یہ سنتے ہی اللہ کے ولی نے اپنی کلاہ بادشاہ کے سر پر رکھدی جیسے ہی کلاہ سر پر رکھی۔ زمین کا نچلا حصہ روشن ہو گیا۔ اب بادشاہ کیا دیکھتا ہے زمین کے نیچے شہدا کی نعش ہی نعش ہے۔ گویا گنج شہیداں ہے۔ بادشاہ حیران و پریشان۔ اس کے بعد درویش نے کہا ہمارا تمہارا یہی فرق ہے تم بن دیکھے چل رہے ہو۔ میں دیکھ دیکھ کے چل رہا ہوں۔ میں ٹیڑھا میڑھا نہیں چل رہا ہوں۔ بلکہ اس احتیاط سے چل رہا ہوں کہ کہیں ان کے سینہ اور سر پر پاؤں نہ پڑ جائے۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو میں ایک نکتہ ذہن نشین کریئے کہ جس کی ٹوپی کا یہ عالم ہو کہ ایک بادشاہ کے سر پر رکھ دی جائے تو طبقات زمین روشن ہو جائے۔ پھر ٹوپی والے کی آنکھ کا کیا عالم ہوگا۔ ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کو، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں !!!

حضرات! یہ وہ سید سالار مسعود غازی رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہیں جن کے بارے میں حضور سیدی مخدوم سمنانی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے لطائف میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ غازی میاں کی قبر پر حاضری دیں وہ کم از کم ۳۰ منٹ ضرور حاضر رہیں۔ چونکہ ہر تیس منٹ بعد ان کی قبر پر حضرت خضر کی حاضری ہوتی ہے۔ اگرچہ پہچانوگے نہیں مگر کم از کم ان کے چہرے پر نظر تو پڑ جائیگی۔ نہیں پہچانوگے مگر ان کے دامن کی ہوا تو لگ جائے گی۔

بہر حال بادشاہ اور درویش دونوں نے حاضری دی۔ اسی اثنا میں بادشاہ نے درویش سے پوچھا۔ حضور غازی میاں کی کرامت بتا دیجئے۔

درویش نے فرمایا اس سے بڑی کرامت اور کیا دیکھنا چاہتا ہے کہ ان کی بارگاہ میں تجھ جیسا بادشاہ اور مجھ جیسا درویش دونوں بھکاری کی طرح ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں۔

حضرات! اسے یاد رکھیے۔ بادشاہ کا ایک نفسیاتی سوال تھا کہ ان کی کچھ کرامت بتا دیجئے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر صاحب مزار کے حالات کا علم ہوتا ہے تو دل میں زیادہ جھکاؤ پیدا ہوتا ہے۔ صاحب مزار کے حال سے بے خبر و باخبر ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس لئے اچھی بات ہے کہ آدمی جہاں حاضری دے حاضری سے قبل ان کے خصوصی احوال کی معرفت حاصل کرلے۔

ایک واقعہ

جب بات آہی گئی ہے تو حضرت غازی میاں کا ایک واقعہ اور سماعت فرمائیں۔

ضلع بارہ بنکی میں ایک متمدن قصبہ ردولی شریف ہے۔ جہاں قطب عالم حضرت شیخ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کا آستانہ مرجع عقیدت ہے۔ حضرت علیہ الرحمہ کا ایک حجام تھا جو ہفتہ میں دو بار ناخن تراشنے، خط بنانے کے لئے حاضر ہوتا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ وہ وقت معینہ سے ایک روز قبل ہی آگیا حضرت نے فرمایا تم ایک دن پہلے کیوں آگئے۔ اس نے عرض کیا حضور کل مجھے بہرائچ شریف غازی میاں کے عرس میں رہنا ہے۔ آپ نے فرمایا ہمیشہ ہر سال جاتے ہو کیا ضروری ہے کہ ہر سال جاؤ۔ امسال نہ جاؤ۔ پھر جانا۔ بہت آپ نے سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ آخر اس نے عرض کیا حضور! آج حجامت بنوانی ہو تو بنوا لیجئے۔ کل میں ملوں گا نہیں۔ کل تو میں غازی میاں کے وہاں رہوں گا۔

جب آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ نہ مانے گا تو آپ نے فرمایا ایسا کرو۔ جب تم جا ہی رہے ہو تو فلاں وقت، فلاں جگہ، فلاں باغ میں موجود رہنا۔ ایک گھوڑ سوار وہاں سے گذرے گا۔ ان سے میرا سلام کہدینا۔ اور میرا یہ پیغام پہونچا دینا۔ اس نے عرض کیا حضور کے لئے خادم حاضر ہے۔ چنانچہ وہ بہرائچ چلا گیا۔ ٹھیک وہ اس باغ میں وقت معینہ پر جگہ متعینہ پر حاضر ہو گیا۔ ایک گھوڑ سوار کی سواری آئی۔ اس نے حضرت کا سلام عرض کیا اور پیغام پہونچایا۔

گھوڑ سوار نے بھی کہا کہ اچھا ایسا کرنا ان سے بھی میرا سلام کہدینا۔ اور میرا پیغام پہونچا دینا۔ اس نے کہا خادم حاضر ہے۔

یہ نادان نہ سمجھ سکا۔ حالانکہ یہی غازی میاں تھے اب دونوں کا پیغام سنئے۔ حضرت مخدوم ردولوی نے یہ کہلوایا تھا کہ آپ ہر سال کیوں لاکھوں آدمیوں کو پریشان کرتے ہیں۔ جسے دیکھئے دوڑا جارہا ہے تو غازی میاں نے اس کا جواب عنایت فرمایا، کہ آپ ایک حجام کو نہیں روک سکے ہیں لاکھوں بندگانِ خدا کو کیونکر روک سکتا ہوں۔

گویا خزانہ خدا کا ہوتا ہے ہاتھ مردانِ خدا کا اور دامن بندگانِ خدا کا۔

حضرات ! اسے یاد رکھئے یہ بہت ہی بافیض آستانہ ہے جو منکرِ کرامت ہو اسے بہرائچ شریف لے جائیے تاکہ وہ اپنی آنکھ سے حضرت غازی میاں کی کرامت دیکھے۔ اسے سماعت فرمائیے۔

مزار پاک کے سرہانے دیوار کے بعد ایک حوض ہے غسل مزار کا پانی اسی میں گرتا ہے۔ غسل شریف سے پہلے بہت کوڑھی حضور کے قریب کھڑے رہتے ہیں۔ جیسے ہی غسل کا پانی حوض میں گرتا ہے۔ کوڑھی اس میں کود پڑتے ہیں۔ چنانچہ ہر سال سات یا آٹھ کوڑھی اچھے ہوتے ہیں۔ انگلیاں بڑھ جاتی ہیں ناخن نکل آتے ہیں۔ فوٹو کے ساتھ جن کا ریکارڈ آستانہ میں محفوظ رکھا جاتا ہے جن کا جی چاہے جاکر دیکھ آئے۔

بات بہت دور آگئی ہے میں اس کی معذرت چاہتا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب وہ نعش برآمد ہوئی تو سینے سے ہاتھ لٹک گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے سر پر تھوڑا سا کپڑا ڈال دیا گیا تھا اور باقی بدن پر گھاس جس کا نام "اذخر" ہے۔ راویوں کا کہنا یہ ہے کہ ۴۵ برس کی گھاس ایسی معلوم ہو رہی تھی کہ گویا ابھی ابھی زمین سے اکھاڑ کے شہید کے بدن پر ڈالی گئی ہے۔

حضرات! آپ کو بھی اس کا تجربہ ہوگا کہ اگر گھاس اکھاڑ کر زمین پر ڈال دی جائے تو چند مہینے کے بعد گھاس نہ ملے گی۔ سڑ کر مٹی ہو جائے گی اور کھاد بن جائے گی مگر یہ چند مہینے کی گھاس نہیں بلکہ ۵۴ برس کی ہے۔ اور ایسی تازہ گویا ابھی ابھی اکھاڑی گئی ہے۔ گویا یہ گھاس اپنی خاموش زبان میں اس کا اعلان کر رہی ہے اور اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہے کہ مجھے تو سڑ جانا چاہئے تھا مگر میں نے ایک ایسے زندہ کا قدم چوم لیا ہے کہ وہ خود ہی زندہ نہیں بلکہ دوسروں کو بھی زندگی بانٹ رہا ہے

میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے عرض کیا تھا کہ اگر زندگی لینا ہو تو زندوں کے پاس جاؤ۔ اور پھر اس قوم کا کیا کہنا جو مر کر بھی زندہ ہو۔ اور زندگی بانٹ بھی رہی ہو۔ بھلا اس قوم کا اس سے کیا تقابل و موازنہ جو زندہ رہ کر بھی تو زندگی سے نا آشنا ہو۔ جو ننگ انسانیت اور ننگ زندگی دونوں ہو۔ اور ایک دوسری بات میں نے یہ بھی کہی تھی کہ جس جسم کا تعلق محض روح سے ہوگا تو روح نکل جانے کے بعد جسم برباد ہو جائے گا مگر جس جسم کا تعلق روحانیت سے ہوگا روح کے نکل جانے کے بعد بھی سلامت و باقی رہے گا۔

اس آخری مثال میں ہمارے دونوں دعووں کی تصدیق ہو جاتی ہے جسم سلامت بھی ہے اور زندگی تسلیم بھی ہو رہی ہے۔ سچ کہا کسی نے ؎

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات
فرق اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے،

معراجِ جسمانی

حضرات! خواہ فلسفہ قدیم ہو یا فلسفۂ جدید، ہر ایک کا یہ کہنا ہے کہ جسم کو مکان چاہیے۔ خلا محال ہے۔ لیکن معراج ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ جس کا کہنا ہے کہ ایک جسم ایسا بھی دیکھا گیا ہے جو کبھی مکان میں نظر آیا تو کبھی لامکاں میں۔

آج کی گفتگو واقعاتی نہیں نکاتی، منقولاتی نہیں معقولاتی ہو گی۔

ذہن کے دریچے اور فکر کے جھروکے کھول دیجیے تاکہ ذہنی و فکری توانائیوں اور قوتِ پرواز پر کوئی پہرہ نہ بٹھا سکے۔

اب ورق الٹیے اور معقولات کی عینک سے فلسفۂ معراج ملاحظہ فرمائیے۔ آج آپ کو سمجھنا ہے کہ خاک پر آنا اور ہے، خاکی ہونا اور ہے۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ۝

(۱)

تسبیح اور تحمید میں فرق ہے۔ تحمید کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے صفات کمالیہ ذکر کئے جائیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ وہ قدرت والا ہے۔ سمیع ہے بصیر ہے، خبیر ہے، عالم الغیب ہے وغیرہ وغیرہ۔

اور تسبیح کہتے ہیں ایسے صفاتِ ناقصہ جو ذاتِ باری کے شایان نہ ہوں۔ ان سے اس کی پاکی بیان کی جائے۔ مثلاً یہ کہنا کہ وہ پاک اور بے عیب ہے وہ جھوٹا نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ چونکہ یہ مقام تسبیح کا متقاضی تھا اسی لئے فرمایا گیا سبحٰن۔ یعنی وہ ہر عیب سے پاک ہے اور جب وہ ہر عیب سے پاک ہے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ رسول اکرم کو کیسے اس نے تھوڑی سی مدت میں سیر کرادی۔

۲

واقعہ کی اہمیت کے لئے بھی لفظ سبحٰن کو استعمال کیا جاتا ہے مثلاً ایک چھوٹا سا بچہ جو مشکل سے ۵ سیر کی کوئی چیز اٹھا سکتا ہے لیکن اتفاق سے اس نے دس سیر کی کوئی چیز اٹھالی تو اس موقع پر سبحٰن اللہ سبحٰن اللہ کہا جاتا ہے۔

۳

لفظ سبحان کہہ دینے سے وہابیوں کے امکانِ کذب کا مسئلہ بھی باطل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ذات باری میں کذب کا ممکن ماننا نقصِ باری ہے اور لفظ سبحٰن ذاتِ باری کو ہر نقص سے پاک بنا دیتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی کاذب اپنے عقائد باطلہ کے ماتحت یہ کہنا چاہیے کہ واقعۂ معراج محض ایک بے بنیاد جھوٹا واقعہ ہے تو پروردگار عالم

واقعہ سے پہلے ہی اس دروازہ کو بند کر دیا ہے کہ جو واقعہ کو بیان کر رہا ہے اس کی صفت سبحٰن ہے جو اس کی صفت سبحٰن نہ مانے وہ اس قسم کے شکوک وشبہات قائم کر سکتا ہے مگر جو چوبیس گھنٹہ میں متعدد بار صدق دل سے سبحان اللہ کا ورد کرتا ہو اور پروردگار عالم کی تسبیح بیان کرتا ہو وہ کبھی بھی واقعۂ معراج کا انکار نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس پر شکوک وشبہات قائم کر سکتا ہے۔

۴

یہاں پر رخ بدل کر یہ نقطہ بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ پروردگارِ عالم، عالم الغیب والشہادہ ہے اس کے علم میں یہ بات ہے کہ میرے بعض نام نہاد بندے ایسے گندے ہوں گے کہ نہ صرف میرے محبوب ہی کی تنقیص کریں گے بلکہ مجھ پر بھی امکان کذب و وقوع کذب کا افترا باندھیں گے اس لئے ایسے دریدہ دہن لوگوں کا منھ بند کر دیا گیا اور فرمایا سبحٰن

۵

ایک لفظ سیر ہے اور دوسرا عروج ہے۔ سیر اور عروج میں یہ فرق ہے کہ زمین پر چلنے پھرنے کو سیر کہتے ہیں اور زینہ بذینہ جانے کو عروج چنانچہ سرور کائنات علیہ التحیۃ والثنا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک براق پر تشریف لے گئے ہیں اور اس کے بعد زینہ بذینہ یعنی ہر ہر آسمان کا زینہ قدم رسالت سے قدم بوس ہوتا تھا۔ زینہ پر حضور قدم رکھتے اور وہ لے کر حضور کو دوسرے آسمان تک پہنچا دیتا تھا۔ پھر تیسرے آسمان کا زینہ دوسرے آسمان پر آتا اور حضور کو تیسرے آسمان پر لے جاتا۔ ایسے ہی تیسرے آسمان پر چوتھے آسمان کا زینہ آتا اور وہ پانچویں آسمان پر لے جاتا یعنی حضور خود تکلیف نہ فرماتے کہ زینہ بذینہ

قدم اٹھاتے بلکہ زینہ خود حضور کو لے کر جاتا ہے یہ شان محبوبی ہے، میرے سرکار کی۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

۶

عقیدہ کا مسئلہ:- شب معراج حضور کا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تشریف لے جانا اور تشریف لے آنا اس پر اعتقاد رکھنا فرض ہے۔ جو اس کا منکر ہوگا وہ کافر ہو جائیگا اس لیے کہ حضور کا اتنی مقدار میں آنا جانا عبارت النص سے صراحۃً ثابت ہے اور حضور کا آسمان پر جانا عرش پر دوزخ و جنت دیکھنا یہ متعدد احادیث سے ثابت ہے۔ اور سورۂ والنجم میں جو واقعۂ معراج ہے وہ اتنی صراحت سے نہیں ہے۔ اسی لئے علماء و مفسرین کا اختلاف ہے۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں ہوئے کہ حضور آسمان پر اور عرش اعظم وغیرہ پر تشریف نہیں لے گئے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس کے انکار سے کفر لازم نہیں آتا ورنہ احادیث کثیرہ سے حضور کا آسمان پر تشریف لے جانا ثابت ہے مثلاً وہ حدیث کہ جب حضور پہلے آسمان پر پہنچے تو حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات فرمائی۔ ایسے ہی مختلف آسمان پر مختلف نبیوں اور رسولوں سے۔

۷

صاحب تفسیر خازن نے یہاں پر ایک لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے کہ مسجد اقصیٰ تک جانے اور اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی تو خود ہی جواب فرماتے ہیں کہ اتنی سیر آنے والی سیر کے لئے تمہید و دیباچہ ہے۔ یعنی رب کریم کو بتلانا یہ ہے کہ تم مکہ سے بیت المقدس تک کی مسافت کو کئی مہینے میں طے کرتے ہو، لیکن میرا محبوب رات ہی کو گیا اور رات ہی میں واپس آیا۔ لہٰذا جب وہ اتنی بڑی مسافت

کو اتنے قلیل وقت میں طے کر سکتا ہے جس کو کہ تم اتنی قلیل مدت میں کبھی بھی طے نہیں کر سکتے ہو تو پھر اگر ایسا رسول آسمان اور عرش پر جا کر لوٹ آئے تو کیا تعجب ہے۔ گویا اس تھوڑی سی مسافت کو بیان فرما کر یہ بتلانا ہے کہ تم رسول کی حقیقت کو اپنی طرح نہ سمجھ لینا وہ محض صورت میں تم جیسے ہیں ورنہ اگر تمہاری اور انکی حقیقت ایک ہوتو تم بھی رات ہی میں مکہ سے شام تک کی سیر کر کے دکھا دو تو گویا زمین کی سیرِ معراج کی تمہید ہے۔

۸

واقعۂ معراج کیوں پیش آیا: حضور سید عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حسب معمول ایک روز صبح سے شام تک دعوتِ اسلام دی مگر اتفاق سے اس روز کوئی بھی حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہوا۔ اسی صدمہ اور غم میں حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم مضمحل ہو کر حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے یہاں بستر استراحت پر جلوہ گر ہوئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ربّ کریم اپنے پیارے محبوب کو اداس و رنجیدہ دیکھے اور ازالۂ غم کی کوئی تدبیر عمل میں نہ لائے ادھر رسول کا مضمحل ہونا ہے اور ادھر جبرئیل کو حکم دیا گیا کہ حوران بہشت سے کہدو کہ آراستہ ہو جائیں۔ اور ملٰئکہ سے کہدو کہ میرے محبوب کو سلامی دینے کے لئے صف بصف قطار اندر قطار باادب وباقرینہ کھڑے ہو جائیں۔ جنت سے کہدو نکھر جائے عرش سے کہدو قدمبوس ہونے کے لئے تیار ہو جائے اور تم میرے محبوب کے دربار میں جاؤ اور آج انھیں سیر کرا دو۔ تاکہ میرے محبوب کا غم غلط ہو جائے۔

جس کو دنیا معراج کہتی ہے حقیقت میں وہ رسول اکرم کی ایک

سیر وتفریح ہے اسی لئے قرآن نے اس کو اسریٰ سے بیان کیا ہے جس طرح ہم اور آپ صبح و شام کی تگ و دو وجد وجہد سے پریشان ہو جاتے ہیں تو پارک اور کمپنی باغ کی سیر کے لئے نکل جاتے ہیں ایسے ہی آج رسول اکرم یہ فرما رہے ہیں یعنی مقصود یہ ہے کہ ہماری سیر وتفریح کی دنیا محض روئے زمین پر ہے مگر جب رسول تفریح فرماتے ہیں تو آپ کا قیام تفریح عرش وجنت ہے، عرشی عرش کی سیر کرتا ہے اور فرشی فرش کی سیر کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن فرماتا ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی الخ جس کو دنیا معراج کہتی ہے وہ قرآن کی نگاہ میں رسول کی سیر وتفریح ہے۔

(۹)

ایک لطیف نکتہ:۔ انسانی رسم وراہ میں تعلقات کے قائم کرنے میں دو صورتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک انسان دس کروڑ کی ایک شاندار عمدہ ونفیس کوٹھی تیار کراتا ہے۔ ہر چہار طرف اس کی شہرت ہے۔ اتفاق سے کوٹھی کا مالک کسی طرف سے گذر رہا ہے تو ایک دوسرا شخص اس کے پاس پہونچ کر سلام کرتا ہے۔ اور فوراً وہ یہ کہنے لگتا ہے کہ، سنا ہے کہ آپ نے بڑی ہی عمدہ کوٹھی بنوائی ہے، بڑا روپیہ خرچ کیا ہے، لاکھوں روپئے کا فرنیچر ہے، حوض ہے، باغ ہے بغیچہ ہے بسنگ مرمر وسنگ موسیٰ کا تو زینہ ہے، ہیرا لال ویاقوت وزبرجد جیسے قیمتی پتھر سے آراستہ ومزین ہے۔ ہر چہار طرف اس کوٹھی کی عظمت وبرتری کے ترانے گائے جا رہے ہیں۔ غرضیکہ تعریف کا ایک پل باندھ دیتا ہے مگر اس تعریف کا مقصد کیا ہے کہ کسی طرح کوٹھی کا مالک یہ سن کر اس سے کہدے کہ اگر جی چاہے تو کسی دن آکر

دیکھ جاؤ۔ اور اتنا کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے یعنی کوٹھی کا بنانے والا خود دکھانے کی پیش کش نہیں کرتا بلکہ دوسرا شخص تعریف کرکے دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ایک دوسرا انسان ہے کہ جس کے پاس کوٹھی بنانے والا خود جاتا ہے اور اپنے ہی منھ سے کوٹھی کی لمبی چوڑی تعریف کرتا ہے اور تعریف کے بعد یہ کہتا ہے کہ کیا آپ اس کو دیکھنے نہ آئیں گے۔ یہ وہ مقام ہے کہ کوٹھی بنانے والا کسی کو دکھلانے کی خود پیش قدمی کرتا ہے۔ ایسے ہی رب کریم نے آسمان و زمین کی ایک کوٹھی بنائی جس کو اپنے انوار و تجلیات سے مزین کر دیا۔

حضرت موسیٰ نے انھیں انوار کے دیکھنے کی خواہش کی تھی، تو کہہ دیا گیا لَنْ تَرَانِی اے موسیٰ ہرگز نہیں دیکھ سکتے اور ایک ذات گرامی ہے میرے سرکار کی کہ رب کریم کائنات دکھلانے کیلئے خود اپنے ارادے کا اظہار فرماتا ہے۔ ایسا نہیں کہ سرکار نے خود اظہار تمنا کیا ہو۔ بلکہ سرکار انتہائی بے فکری سے بستر استراحت پر جلوہ گر ہیں۔ حضرت جبریل دربار رسالت میں حاضر ہیں اور عرض گزار ہیں کہ کیا آپ کوٹھی اور کوٹھی والے کو دیکھنے نہ چلیں گے۔؟

۱۰

اگر آپ اپنے محبوب کو اپنے گھر بلانا چاہیں تو آپ کے فہم و فراست کا تقاضا یہ ہوگا کہ تنہا قاصد کو نہ بھیجیں گے بلکہ اپنے یا محبوب کے حسب حال کوئی سواری ضرور بھیجیں گے تاکہ محبوب کے نہ آنے کا کوئی بہانہ نہ مل سکے۔ ایسے ہی پروردگار عالم نے جبریل کو تنہا نہیں بھیجا، بلکہ سواری کے ساتھ بھیجا۔ چنانچہ جبریل دربار رسالت میں براق لے کر حاضر ہوئے۔ یہ ہے سرکار مصطفےٰ کی عظمتِ شان، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دیکھنے کی خواہش فرمائیں تو

لن ترانی کہدیا جائے اور ایک نبی بستر استراحت پر آرام فرما ہے ہیں اور خود اپنی طرف سے دعوتِ نظارہ دیا جارہا ہے اور سواری کے ساتھ جبریل کو بھیجا جارہا ہے۔ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

۱۱۱

قرآنِ کریم نے صرف ایسے دو نبیوں کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے رَبِّ اَرِنی کہہ کر خداوند قدوس کو پکارا ہے۔ ایک حضرت ابراہیم دوسرے حضرت موسیٰ علیہما السّلام۔ لیکن حیرت ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے رَبِّ اَرِنی کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتیٰ کہہ کر پکارا تو فوراً حضرت ابراہیم کو دعوتِ نظارہ دیتے گیا کہ اے ابراہیم چار پرندے اپنے ہمراہ لے کر فلاں پہاڑ پر آجاؤ اور ان کا سر کاٹ لو، ان کے دھڑ کو قیمہ کر ڈالو اور پھر انھیں آواز دو، دیکھو وہ دوڑتے ہوئے اپنے اپنے دھڑ سے لگ جائیں گے اور بولتے اور دوڑتے ہوئے تمہیں نظر آئیں گے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جب اسی جملہ کو حضرت موسیٰ نے پکارا تو صاف صاف کہدیا گیا کہ لن ترانی۔ آخر کیا بات ہے کہ جملہ ایک ہی ہے مگر ایک کا سن لیا جائے اور دوسرے کو محروم کردیا جائے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ از حضرت آدم تا حضرت مسیح علیہم الصلوٰۃ والتسلیم جتنے انبیاء و رسل کائنات میں رونق افروز ہوئے وہ سب کے سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے مظہر صفات بن کر آئے۔ لہٰذا حضرت ابراہیم نے جو تمنا کی ہے وہ صفت کے دیکھنے کی۔ یعنی اے ربّ کریم میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے لہٰذا جو مظہر صفت تھا اس نے صفت کے دیکھنے کی تمنا کی۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اپنے منصب سے ہٹ کر خواہش ظاہر کی۔ یعنی ذات الوہیت کے دیکھنے کی تمنا کی ہے تو انھیں کہدیا گیا ہے کہ اے موسیٰ دنیا

ہیں تو تم میری صفات کے مظہر و آئینہ بن کر گئے ہو تم کس طرح میری ذات کو دیکھ سکتے ہو۔ ذات تو وہ دیکھے جو مظہر ذات ہو اور وہ صرف ذاتِ گرامی محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ہے۔ چنانچہ شب معراج میرے رسول نے ذاتِ الوہیت کو اس طرح دیکھا کہ قرآن نے اپنے الفاظ میں ما زاغ البصر و ماطغیٰ سے ترجمانی کی۔ یعنی ذاتِ ربوبیت کو بے حجاب و بے نقاب اس طرح دیکھا کہ کسی طرف نہ تو آنکھیں پھریں اور نہ کج ہوئیں۔ لہٰذا یہ ایک فرق ہے سرور کائنات میں اور دیگر انبیاء و رسل میں کہ حضور مظہرِ ذاتِ رب ہیں اور دیگر انبیاء و رسل مظہر صفاتِ رب ہیں۔

۱۲

ایک سوال ہوتا ہے کہ معراج کا تعلق ذاتِ نبوت سے ہے لہٰذا تعریف و توصیف رسول کی ہونی چاہیئے چہ جائیکہ رب کریم اپنی تسبیح لفظ سبحٰن سے فرماتا ہے یعنی ہونا چاہیئے کہ پاک ہے وہ ذات نبوت جس نے سیر کی مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔ مگر قرآن یہ کہتا ہے کہ پاک ہے وہ ذات ربوبیت جس نے سیر کرائی اپنے پیارے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔

جواب: ایک ہے سیر کرنا۔ اور دوسرا ہے سیر کرانا۔ سیر کرنے اور سیر کرانے میں فرق ہے۔ اگر قرآن عزیز میں یہ ہوتا کہ پاک ہے وہ ذات نبوت جس نے سیر کی تو سیر کی نسبت رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی طرف ہوتی مگر اپنی تسبیح بیان کرکے پروردگار عالم، سیر کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لیتا ہے۔

اس مثال سے آپ سیر کرنے اور سیر کرانے کا فرق زیادہ سمجھ سکیں گے مثلاً ایک دسویں کلاس کا طالب علم تنہا آگرہ جاتا ہے تاج محل دیکھنے کے لئے

اور واپس بھی آجاتا ہے اور واپسی کے بعد اپنے سفر کی روداد بتاتا ہے کہ میں آگرہ گیا اور تاج محل دیکھا اور دلی جاکر میں نے قطب مینار اور لال قلعہ دیکھا اور فتحپور سکری جاکر اکبر کی بنوائی ہوئی حسین عمارت کو دیکھا تو ہر سننے والے کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوگا کہ بچہ ہی تو ہے اور اس پر بھی تنہا سفر کیا۔ کچھ دیکھا ہوگا اور کچھ نہ دیکھا ہوگا۔ کچھ سمجھا ہوگا اور کچھ نہ سمجھا ہوگا۔ لیکن اگر اسی کالج کا ایک طالب علم تاج محل قطب مینار، لال قلعہ، جامع مسجد دیکھنے کی رخصت چاہے۔ اور کالج کا ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل یہ کہتا ہے کہ تم تنہا نہ جاؤ بلکہ ہم تمہیں سیر کرائیں گے چنانچہ وہ طالب علم پرنسپل کے ساتھ سیر کرتا ہے اور سب کچھ دیکھ کر یوں بیان کرتا ہے کہ میں نے پرنسپل صاحب کے ساتھ سیر کی ہے۔ اور انھوں نے مجھے سب کچھ دکھلایا ہے تو سننے والے اس کے معنی یہ سمجھیں گے کہ آنکھ تو طالب علم کی تھی لیکن پرنسپل صاحب کے فہم و بصیرت کی عینک اس کی آنکھ پر لگی ہوئی تھی۔ جہاں پر اس کے فہم و نگاہ نے قصور کیا ہوگا پرنسپل نے اس کو دکھلا دیا ہوگا اور سمجھا دیا ہوگا۔

ایسے ہی اگر سیر کی نسبت حضور کی طرف ہوتی تو معاندین یہ کہتے کہ ایک بندہ نے تن تنہا سفر کیا۔ بندہ ہی کی تو نگاہ ہے کچھ دیکھا ہوگا اور کچھ نہ دیکھا ہوگا، کچھ سمجھا ہوگا اور کچھ نہ سمجھا ہوگا۔ تو رب کریم نے اس سیر کی نسبت اپنی طرف کر دی

تاکہ اس سیر میں کسی قسم کے

نقص کا شبہ نہ رہ جائے یعنی جب میں سیر کرانے والا ہوں تو اگر میرے سیر کرانے میں کوئی قصور رہ سکتا ہے تو سیر کرنے والے میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر میرے سیر کرانے میں کوئی نقص نہیں تو سیر کرنے والے میں

کوئی نقص نہیں اسلئے رب کریم نے سیر کی نسبت اپنی طرف کرکے محبوب کے دامن کو بچالیا۔

۱۳

ایک شبہ کا ازالہ :۔ اس موقع پر محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق مجھے بہت پسند آئی۔ مدارج النبوۃ میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ یہ حدیث قدسی لولاک لماخلقت الافلاک یعنی اے محبوب اگر آپ کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو آسمان و زمین کو نہ پیدا کرتا۔ یہ حدیث شریف شب معراج فرمائی گئی ہے۔ جس میں اس شبہ کا ازالہ ہے کہ شاید لوگ معراج سے یہ سمجھے کہ آسمان و زمین و جنت کی یہ سیر کرکے حضور نے اپنے علم و معلومات میں اضافہ کیا تو رب کریم نے فرمایا کہ اے رسول یہ آسمان و زمین تو وجود میں آئے، آپ کی بدولت ان کی عظمت و شرافت تو آپ کے قدم ناز کی وجہ سے ہے۔ حاشا وکلا آپ کو ان سے عظمت و برتری نہیں ہے۔ یہ معراج تو آپ کی سیر و تفریح ہے اس لئے کور باطن یہ خیال نہ کرے کہ عرش و جنت و آسمان کی سیر سے حضور کو عظمت حاصل ہوئی۔

۱۴

بلکہ حقیقت پوچھئے تو جناب سرور کائنات نے جنت و عرش کو اپنے قدمِ ناز سے روندکر صاحب معراج بنایا ہے۔ حضور جنت میں تشریف لے گئے تو یہ حضور کی معراج نہیں ہے بلکہ معراج جنت ہے حضور عرش اعظم پر تشریف لے گئے تو یہ حضور کی معراج نہیں ہے بلکہ عرش کی معراج یہی ہے کہ وہ آج معراج والے کا تلوا چوم کر خود صاحب معراج بن جائے۔ حضور کی معراج تو ثم دنیٰ فتدلیٰ فکان

قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ہے یعنی قربتِ الٰہی حضور کی معراج ہے۔
اور صاحبِ معراج سے قدم بوس ہونا یہ عرش کی معراج ہے۔ مثلاً
میں آپ سے ہر وقت دریافت کرتا ہوں کہ عہد عالمگیری ہوتا، اور
حضرت عالمگیر علیہ الرحمہ آپ کے شہر میں تشریف لاتے تو آپ کیا فرماتے
کہ آج حضرت عالمگیر کی معراج ہے۔ کہ آج وہ اس شہر میں تشریف لائے
ہیں یا آپ فرماتے کہ شہر والوں کی معراج ہے یقیناً آپ کی عقل و دانش
کا یہی تقاضا ہوتا کہ آپ یہی فرماتے کہ آج اہل شہر کی معراج ہے کہ زمانے
کا بادشاہ آج ہمارے شہر میں جلوہ گر ہے اسی طرح رب کریم نے
فرمایا کہ اے رسول اگر آپ کو پیدا کرنا منظور نہ ہوتا تو آسمان و زمین
عرش و کرسی، دوزخ و جنت کچھ بھی نہ پیدا کرتا یعنی ان چیزوں کا
خالق تو میں ہوں مگر مالک تم کو بنایا ہوں۔

لہٰذا لوگو مالک جنت جنت میں جائے تو جنت کی معراج
ہے یا مالک جنت کی۔ جنت بھی ہمیں اسی لئے پیاری ہے چونکہ وہ مسکن
ہے میرے محبوب کا۔ جنت کو بھی جنت بنایا حضور ہی کے قدم نازنے

۱۵

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اَسْرٰی کو ثلاثی مجرد سے ثلاثی
مزید فیہ (باب افعال) میں لاکر خود ہی متعدی بنالیا گیا ہے تو پھر اَسْرٰی
کے بعد بِعَبْدِہٖ میں (ب) کیوں لایا گیا۔ اس لئے کہ (ب) کا ایک خاص
فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لازم کو متعدی بنانے کے لئے لاتے ہیں۔
مثلاً ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ یعنی لے گیا اللہ ان کے نور کو
باوجودیکہ ذَهَبَ ثلاثی مجرد سے ہے جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے (گیا یا
جاتا ہوگا) مگر ب کی وجہ سے یہ متعدی ہو گیا۔ اب جس کے معنی لے جانا
ہو گئے تو جب کہ اَسْرٰی خود ہی متعدی ہے تو ب کے لانے سے کیا

فائدہ ؟

جواب ! (ب) یہاں پر ب تعدیہ کے لئے نہیں ہے بلکہ مصاحبت کے لئے ہے۔ یعنی سیر کرانے والا خود سیر کرنے والے کے ساتھ ہے۔ سیر کرنے والا تنہا نہیں ہے۔

۱۶

سیر کرانے کی نسبت دو طریقہ پر ہوتی ہے ایک تو اس صورت میں کہ سیر کرانے والا خود جانے والے کے ساتھ ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ سیر کرانے والا جانے والے کے سفر کے اسباب واخراجات وغیرہ کو فراہم کر دے اور خود ساتھ نہ جائے۔ تو اس کو بھی سیر کرانے والا کہتے ہیں۔

مثلاً ایک سیٹھ کے عطا کردہ روپیہ سے آپ نے حج کیا اور آپ سے یہ دریافت کیا گیا کہ آپ کو کس نے حج کرایا جواباً آپ نے فرمایا کہ فلاں سیٹھ نے تو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ سیٹھ صاحب بھی آپ کے ساتھ تھے صرف اخراجات واسبابِ سفر کو فراہم کر دیا ہے۔ اور ایک لفظ ہے لے جانے والا۔ یہ جانے والے کی معیت چاہتا ہے تو اگر اسریٰ کے بعد (ب) نہ لایا جاتا تو اس آیت کا ترجمہ صرف یہ ہوتا کہ پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو اور اس میں دونوں احتمال ہے کہ سیر کرانے والا سیر کرنے والے کے ساتھ تھا یا نہیں۔ مگر جب اسریٰ کے بعد (ب) مصاحبت کا لایا گیا تو آیت کا اب یہ ترجمہ ہو گیا کہ پاک ہے وہ ذات جو لے گیا اپنے بندے کو۔ اور یہ طے ہو چکا ہے کہ لے جانا وہیں پر بولا جاتا ہے جب کہ لیجانے والا جانے والے کے ساتھ ہو تو طے ہو گیا کہ حضور تنہا نہ تھے بلکہ آغوشِ ربوبیت میں تھے۔

نوٹ: اور اگر لے جانا کبھی بغیر جانے والے کی معیت کے بول دیا جائے تو یہ شاذ و نادر ہے۔ اور الشاذ کالمعدوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ (بطور جملہ معترضہ اس کو کہہ دینا چاہیئے)

۱۷

بعبدہٖ سے معراج جسمانی کا ثبوت ہوتا ہے اور یہ لفظ اس مصلحت اور نکتہ کے پیشِ نظر قرآن کریم میں ہے۔ اس لئے کہ عبد زبان عرب میں روح معَ الجسد کو کہتے ہیں۔ نہ تو صرف روح کو کہتے ہیں اور نہ صرف جسم کو بتاتا ہے کہ یہ معراج روح مع الجسد ہوئی۔ معراج روحانی نہ تھی بلکہ جسمانی تھی۔ اس مختصر عنوان کو اپنے انداز میں طول دیا جاسکتا ہے۔

۱۸

بعبدہٖ سے دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ امت مصطفےٰ کے ایمان کو محفوظ رکھنا ہے۔ اس لئے کہ مسئلہ معراج کی اتنی اہمیت ہے۔ اور اس قدر خرق عادت و مافوق الفطرت ہے سننے کے بعد اندیشہ ہوسکتا تھا کہ حضرت مسیح کی قوم کی طرح خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہہ دے اس لئے پروردگار عالم نے تمام القاب وخطابات کو چھوڑ کر بعبدہٖ فرمایا۔ کہ خبردار! اس تھوڑے سے وقت میں اتنی طویل مسافت طے کرنے والے کو خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہنا بلکہ وہ سیر کرنے والا میرا بندہ ہے اس لئے فرمایا بعبدہٖ۔

۱۹

چنانچہ یہی فلسفہ ہے میلاد شریف کا۔ تاکہ ایمان محفوظ رہے۔ اس لئے کہ حضور کے صرف معجزات وفضائل ہی بیان کئے جائیں، تو اندیشہ ہے کہ دوسری امتوں کی طرح کہیں امتِ مصطفےٰ بھی نہ بہک جائے

اور خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ اس لئے علمائے اہلسنت نے یہ طریقہ مسعود جاری کر دیا کہ اگر معجزات وفضائل بیان کئے جائیں تو اس کے ساتھ یہ بھی کہدیا جائے جو اتنے بڑے اعجاز کا حامل تھا اور جس کے ایسے ایسے فضائل وکمالات ہیں وہ خدا کا بیٹا نہ تھا بلکہ وہ عبداللہ کا لخت جگر تھا۔ آمنہ کا نور نظر تھا۔ ربیع الاوّل شریف کا پر بہار مہینہ تھا بارہویں تاریخ تھی دوشنبہ کا دن صبح کی نورانی ساعت خاندانِ قریش قبیلۂ بنی ہاشم میں جلوہ گر ہوئے۔

الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ۔

یہی حقیقت میلاد ہے۔ اور فلسفۂ میلاد بھی۔

۲۰

تُعرَفُ الاَشیَاءُ بِاَضدَادِھَا۔ شی اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ حضور کے معراج جسمانی کے ثبوت پر سب سے زیادہ کام آیا ابوجہل کا وجود۔ اس لئے کہ ہماری زندگی کا یہ قانون ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خواب کو کبھی نہیں جھٹلاتے۔ خواہ وہ خواب کتنا ہی حیرت انگیز اور تعجب خیز کیوں نہ ہو۔

مثلاً اگر میں آپ سے کہوں کہ میں نے آج رات کو خواب دیکھا ہے کہ سمندر کے کنارے گیا ہوں۔ یکایک ایک سنہری کشتی نمودار ہوئی اس نے مجھ کو اپنے اندر بیٹھا کر ایک ہوائی جہاز کے حوالے کیا۔ ہوائی جہاز سے فوراً ہی میں لندن پہونچا اور وہاں سے اڑکر پیرس میں چلے گئی اور کپڑے بدل کر پھر روس امریکہ وغیرہ وغیرہ کا سفر کیا اور پھر اسی جہاز سے سمندر میں آیا اور کشتی سے ساحل پر اور ساحل سے کار پر بیٹھ کر گھر آیا۔ آپ کبھی بھی یہ نہ کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے۔ اسلئے کہ یہ ایک خواب ہے اور خواب علی العموم حیرت انگیز ہوتا ہے۔ جھٹلانے

کے بجائے اگر آپ کو فن تعبیر سے کچھ شد بد ہوگی تو خواب کی تعبیر بھی بتلانے لگیں گے۔ لیکن میرے سرکار نے جب واقعہ معراج کا بیان فرمایا تو فوراً ابوجہل نے جھٹلا دیا۔ العیاذ باللہ من ذالک۔

ابوجہل کا جھٹلانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ حضور نے خواب نہ بیان فرمایا تھا بلکہ حقیقت میں عالم بیداری میں ہوش و حواس میں رہتے ہوئے اپنے جسم پاک کا عالم بالا میں جانا اور وہاں سے واپس آنے کا تذکرہ فرمایا تھا۔

۲۱

بالفرض اگر یہ ایک خواب ہی ہوتا۔۔ تو قرآن کریم اس کو اتنی اہمیت کیوں دیتا۔ اس لئے کہ عالم خواب میں جنت یا عرش پر جانا اور سیر کرنا یہ کون سی خاص بات ہے کیا ہارون رشید کی بیوی زبیدہ خاتون نے خواب کی حالت میں جنت کے اس محل کو نہ دیکھا تھا جس کو انھوں نے بہلول دانا سے خریدا تھا۔ یا حضرت علی نے خواب کی حالت میں جنت کے اس محل کو نہ دیکھا تھا جو آپ کے لئے صدیق اکبر سے سلام کرنے کے عوض میں بتایا گیا تھا۔؟

جب غلامانِ مصطفٰے حالتِ خواب میں جنت کی سیر کرتے ہیں تو پھر آقا و مولیٰ حضور کی اس میں کون سی خصوصیت ہے جس کو قرآن کریم اتنی اہمیت دے رہا ہے۔ اور دوسری بات خواب کو سیر کرانے سے کیا تعلق۔ خواب کی قوتِ پرواز خود ہی اتنی بلند ہے کہ بغیر کسی کے سیر کرائے وہ جنت اور عرشِ اعظم کی سیر کر آئے۔ غلامانِ مصطفٰے تو بغیر سیر کرائے سیر کریں۔ اور ذاتِ رسالت سیر کرانے کی پابند ہو۔ سیر کرانا خود بتلاتا ہے کہ یہ خواب نہ تھا۔ بلکہ عالم بیداری میں سرکار مصطفٰے اپنے جسمِ نوری کے ساتھ تشریف لے گئے۔

۲۲

جب کہ معراج کی تمہید کو جسمِ مصطفےٰ سے تعلق ہے تو اصل معراج کو جسمِ مصطفےٰ سے کیوں نہ تعلق ہوگا۔ یہ واقعہ مشہور رہے کہ معراج سے پہلے حضور کا شقِ صدر کیا گیا تھا۔ چنانچہ صحابۂ کرام ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر کبھی حضور کے کرتے کا بٹن کھل جاتا تو شقِ صدر سے جو لکیر اور سطر پڑ گئی تھی وہ ہم لوگوں کو صاف نظر آتی۔ جس طرح آج آپریشن کیا جاتا ہے اور ٹانکا لگا دیا جاتا ہے تو اچھا ہونے کے بعد بھی وہاں پر ایک لکیر رہتی ہے اسی طرح شقِ صدر کے بعد حضور کے سینہ مبارک پر لکیر تھی۔

شقِ صدر کیوں ہوا چونکہ معراج مقصود تھی۔ تو اگر جسمِ مصطفےٰ نہ گیا ہوتا تو جسم کے شق کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ یہ بھی عالمِ خواب میں ہو گیا تھا؟ اور اگر بالفرض یہ عالمِ خواب میں تھا تو پھر نشان پڑنے کے کیا معنیٰ۔ معراج سے قبل شقِ صدر کا ہونا اور نشان کا دکھلائی پڑنا یہ کھلی ہوئی علامت ہے کہ جسم کو لے جانا تھا۔ اس لئے جسم ہی سے متعلق صدر کیا گیا۔

صدر کی خصوصیت اس لئے ہے کہ آج قربتِ الٰہی میں پہنچ کر اس سینہ کو انوارِ الٰہی کا گنجینہ بنانا ہے۔ اسرارِ الٰہی کو سمیٹ لینا یہ کام سینہ ہی کا ہے۔ اسی لئے قرآن عزیز فرماتا ہے فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى۔

۲۳

رہ گیا سوال کہ ایک جسم معہ گوشت پوست اور ہڈی کے کس طرح اتنی طویل مسافت کو طے کر سکتا ہے تو اسکا جواب عقلاً و نقلاً دونوں طرح سے دیا جا سکتا ہے۔ دلیل عقلی اور نقلی دونوں اس مقام پر ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ نقلی دلیل تو یہ ہے کہ انسان

اس بات پر متعجب ہے کہ حضور اس جسم کے ساتھ آسمان پر کیسے تشریف لے گئے۔ مگر پروردگارِ عالم انسان کی آنکھوں کے پٹ سورہ والنجم میں کھول دیتا ہے کہ اے انسان تجھے اس بات پر تعجب ہے کہ سرکار مصطفےٰ زمین سے آسمان پر کیسے تشریف لے گئے۔ حالانکہ مقام تعجب نہیں ہے بلکہ نور نور والے کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں آجائے تو یہ محل تعجب ہے۔

انسان کو تعجب زمین سے آسمان پر جانے میں ہے اور قدرت کا فرمان ہے کہ تعجب کی بات یہ ہے کہ سراپا نور زمین پر کیسے آگیا۔ اس کا اوپر جانا یہ تو اس کی عین فطرت ہے۔ اسی لئے رب کریم نے فرمایا والنجم۔ قسم ہے اس ٹوٹے ہوئے ستارے کی جو اوپر سے نیچے آیا۔

۲۴

اور اسی جواب کو فلسفیانہ رنگ و روپ میں اس طرح بیان کیا جائے گا کہ فلسفہ کا یہ قانون ہے کہ کل شیٔ یرجع الی اصلہ ہر شے اپنی اصلیت کی طرف لوٹا کرتی ہے۔ مثلاً مٹی اور پانی کو گھول دیا جائے تو ذرا سی دیر میں مٹی نیچے ہو جائے گی اور پانی اوپر۔ چونکہ مٹی پانی سے کثیف ہے وہ اپنی اصل کی طرف لوٹے گی۔ یا مثلاً مٹی کا ڈھیلا اوپر پھینک دیا جائے تو جب تک اس کے ساتھ طاقت ہے تو وہ اوپر جائے گا۔ اور جہاں یہ طاقت ختم ہوئی۔ مٹی کا ڈھیلا نیچے آجائے گا۔ اسی قانون کے ماتحت کہ ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ ایک گھڑا تالاب میں الٹا ڈوبا دیجئے پورا گھڑا ڈوب جائیگا مگر اس میں پانی نہ آئے گا۔ اس لئے کہ وہ گھڑا ہوا سے بھرا ہوا ہے ہوا پانی سے لطیف ہے اور پانی کے اوپر رہنا چاہتی ہے جس طرح

پانی مٹی کے اوپر رہتا ہے اسی طرح اللہ کے پیارے رسول انسانی شکل میں سراپا نور تھے اور نور بلندی کو چاہتا ہے تو جب ہر شئے اپنی اصل کی طرف جاتی ہے تو نورِ مصطفےٰ اگر نورِ الٰہی کی طرف گیا تو اسمیں عقلی طور پر متعجب ہونے کی کونسی بات ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم شاہد ہے قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین۔ یا حضور کا ارشاد گرامی ہے کہ اول ما خلق اللہ نوری وکل خلائق من نوری و انا من نور اللہ۔ یا حضور کے جسم پاک کا زمین پر سایہ نہ پڑنا اور نہ صرف اتنا ہی بلکہ حضور کا لباس جسے حضور زیب تن فرما لیتے اس کا بھی سایہ زمین پر نہ پڑتا۔ عقلی اور نقلی دونوں دلیلوں کی بنیاد رسول کرم کی نورانیت ہے۔

۲۵

یہ کہنا کہ کرۂ نار نے جلا کیوں نہ دیا تو اس کا معمولی اور موٹا سا جواب یہ ہے کہ آگ کا کام ضرور جلانا ہے مگر اپنے جلانے میں وقت چاہتی ہے۔ اگر آگ کو جلانے کا وقت نہ ملے تو ہزار ہا جسم آگ سے چکر کاٹے اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔

مثلاً چراغ کی لو سے ہزاروں مرتبہ تیزی سے اپنی انگلی کو لے آیئے اور لے جایئے آپ کی انگلی کبھی بھی نہ جلے گی۔ اس لئے کہ اس نے ابھی اتنا وقت ہی نہیں پایا۔ ایسے ہی سرکار کے سیر کی رفتار اتنی تیز و سریع تھی کہ کرۂ نار کو اتنا موقع ہی نہ ملا۔

۲۶

دوسری دلیل یہ ہے کہ آگ دوسروں کو جلا سکتی ہے مگر اس میں

مجال نہیں کہ حضور پر اس کی آنچ آسکے جبکہ حضرت ابراہیم پر آگ کے شعلے مسکراتے ہوئے پھول بن گئے۔ صرف اس لئے کہ وہ حامل ہوتے نور مصطفےٰ کے۔ تو کیسے ممکن ہے کہ وہ حضور پر اثر انداز ہو۔ آگ پر حکومت ہے سرکار دوعالم کی۔

مثلاً حضور کے ایک صحابی ہیں حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ آگ میں ڈالے گئے تو سرکار نے یہ فرمایا تھا یا نار کونی برداً وسلاماً علی عمار کما کنت علی ابراہیم۔ حضور کا یہ فرمانا تھا کہ آگ گلزار ہو گئی تو جب آگ غلامانِ مصطفےٰ پر اثر انداز نہ ہو سکی تو اس کی کیا جرأت و مجال کہ آقا و مولیٰ پر اثر انداز ہو۔

۲۷

ایک صحابی کا واقعہ مشہور ہے۔ غالباً (انس ابن مالک یا مالک ابن انس) کے یہاں رسول اکرم نے کھانا تناول فرمایا اور دسترخوان ہی میں اپنی انگلیوں کو صاف کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد دسترخوان میلا ہوا تو صحابی رسول نے اپنی خادمہ سے فرمایا کہ جاؤ اسے صاف کراؤ خادمہ نے دسترخوان لیا اور جاکر جلتی ہوئی تنور میں ڈال دیا۔ تنور میں دسترخوان ایسے ہی صاف ہو گیا جیسے پانی سے صاف کیا گیا ہو۔ چنانچہ تنور سے نکال کر آقا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انتہائی تعجب سے آقا نے سوال کیا کہ تو نے تنور میں دسترخوان کو کیوں ڈالا۔ اور اگر ڈال بھی دیا تھا تو آگ کا کام جلا دینا ہے نہ کہ صاف کر دینا۔ خادمہ نے عرض کیا چونکہ سرکار نے اپنی انگلیاں اس میں صاف کی تھیں۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاں حضور کی انگلی پڑ جائے اس پر آگ اثر کرے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے خود حضور پر آگ اثر کرے۔

۲۸

سیر کے لئے سات چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے حرکت، محرک، متحرک، مبدار، منتہا، مسافت، زمانہ۔ جہاں پر سیر کا اطلاق کیا جائے گا وہاں پر ان سات چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے لہٰذا معراج میں بھی پایا جانا چاہیئے۔ چنانچہ معراج میں ساتوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ حرکت بھی ہے۔ اسلئے کہ حرکت کے لئے ضروری ہے کہ ایک مکان کو چھوڑ کر جسم دوسرے مکان کی طرف جائے چنانچہ انتقال مکانی بھی ہے۔ محرک پروردگار عالم ہے یعنی سبحٰن الذی اسریٰ متحرک رسول کریم ہیں بعبدہٖ۔ مبدار مکہ مکرمہ ہے منتہا مسجد اقصیٰ ہے۔ اور پھر مسجد اقصیٰ سے آسمان و جنت و عرشِ اعظم جہاں تک ثم دنیٰ فتدلی فکان قاب قوسین او ادنیٰ۔ اور مسافت بھی ہے۔ یعنی اتنی لمبی مسافت کہ مکہ سے ملک شام، ملک شام سے قرب الٰہی تک۔ اور زمانہ بھی ہے لیلاً یعنی رات کا تھوڑا سا حصہ۔ اسی آیتِ مبارکہ میں ساتوں چیزیں ہیں حرکت۔ محرک، متحرک مبدار، منتہا۔ مسافت، زمانہ۔

۲۹

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر معراج صرف قربتِ الٰہی کا نام ہے تو قربت محض سے کیا فائدہ۔ تو جواب یہ ہے کہ قربت میں بہت بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ مثلاً روغن چنبیلی، روغن بیلا وغیرہ۔ تو کیا یہ چنبیلی یا گلاب کا روغن ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ محض تل کا تیل ہے۔ لیکن اس تل کو گلاب، بیلا، چمبیلی سے قربت حاصل ہو گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے تل کے روغنِ گل کہا جاتا ہے۔ یا جیسے کہ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ

واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دست محبوبی بدستم

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دل آویز تو مستم

بگفتا من گل ناچیز بودم
ولیکن مدتے با گل نشستم

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

جب یہ مٹی کا ڈھیلا اور تِل کا دانہ خصوصی قربت سے یہ امتیاز حاصل کر سکتا ہے تو انسان اور پھر انسانوں میں نبی اور نبیوں میں سب سے اعلیٰ نبی جب اس کو قربت الٰہی حاصل ہو گی تو اس کی صفات میں صفاتِ الٰہیہ کا رنگ کیوں نہ جھلکے گا۔؟

۳۰

چنانچہ اس قربت کا نتیجہ ہے کہ شب معراج یہ فرمایا گیا وما ینطِقُ عَنِ الھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ زبان نبوت ہے مگر کلامِ الٰہی ہے یہ اسی قربت خصوصی کا نتیجہ ہے۔ مثلاً کفار نے یہ کہا تھا کہ اگر آپ حق پر ہیں تو اپنے رب سے کہیے کہ ہم پر پتھر برسائے۔ سرکار نے اشارہ فرمایا، کنکریاں برس پڑیں۔ مگر قدرت نے یہ فرمایا وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی اقرار بھی ہے اور انکار بھی۔ دنیا دیکھ رہی ہے دستِ نبوت کو۔ مگر ربِ کائنات یہ فرماتا ہے کہ اے رسولِ اکرم جب تم نے پھینکا تم نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔ یہ کس کا اثر ہے اسی قربتِ الٰہی کا دنیٰ فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی بیعتِ رضوان کے موقع پر قدرت نے یہ فرمایا کہ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ صحابہ کے ہاتھوں پر حضور کا ہاتھ تھا مگر اللہ فرماتا ہے کہ ان لوگوں

کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

۳۱

ایک سوال ہوتا ہے کہ قربت کو (قاب قوسین) یعنی دو کمانوں کے فاصلہ سے کیوں تشبیہ دی گئی۔؟

جواب:۔ اہل عرب کا دستور رہے کہ جب وہ آپس میں کامل درجہ کا اتحاد و اتفاق چاہتے تو ایک دوسرے کی کمان آپس میں ملاتے۔ جس کا منشایہ ہوتا کہ آج سے ہم دونوں میں ایسا اتحاد ہو گیا کہ ایک کا تیر چلانا دوسرے کا تیر چلانا ہو گا۔ زید کا تیر چلانا بکر کا۔ اور بکر کا تیر چلانا زید کا۔ اسی مناسبت سے قرآن عزیز نے فرمایا کہ آج دونوں کمانیں مل رہی ہیں۔ کمانِ الوہیت اور کمانِ نبوت۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ رسول کا کہنا خدا کا فرمان ہو گا۔ رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت، رسول کا پھینکنا خدا کا پھینکنا الخ

۳۲

یہ بات اس سے قبل عرض کی گئی ہے کہ چونکہ معراج کی تمہید جسمانی ہے۔ اسلئے کہ معراج کو بھی جسمانی ہی ہونا چاہئے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو نٓ والقلم وما یسطرون سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی حضور کو قلم سے تشبیہ دی گئی۔ چونکہ قلم پر چار مرتبہ چاقو چلتا ہے تب وہ قرب کاتب میں آتا ہے اسی طرح جب حضور کا چار مرتبہ شقِ صدر ہوا، تب آپ کو قربتِ الٰہی کی دعوت دی گئی۔

لطیفہ:۔ قلم خود کچھ نہیں لکھتا تا وقتیکہ کاتب نہ ہو۔

کاتب کی حرکت پر قلم متحرک ہوتا ہے قلم کا سکون و حرکت کاتب کے تابع ہے۔ گویا حضور کی ہر شان و ہر ادا بمقتضائے الٰہی ہے۔

لطیفہ:۔ ایسے ہی قلم کا کوئی خاص علم نہیں ہوتا۔ نوک قلم پر وہی آتا ہے جو سینۂ کاتب میں ہوگا۔

لطیفہ:۔ ایسے ہی قلم جب چار مرتبہ کی مشقت جھیل لیتا ہے تب وہ کاتب کا رازدار بن جاتا ہے۔ جو کچھ کاتب کے دل و دماغ میں ہوتا ہے قلم اس کا ترجمان ہوتا ہے۔ ایسے ہی سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم قربِ الٰہی کی وجہ سے پروردگارِ عالم کے رازدار ہو گئے۔

قرآن

دنیا کی ہر کتاب اپنے وجود و بقا میں پریس و کاغذ کی رہین

منت ہے۔ آج اگر بین الاقوامی سطح پر کتابوں کی طباعت پر پابندی لگا دی جائے تو

صرف قرآن ہی ایسی کتاب ہے جو اس چیلنج کو قبول کر سکے کیونکہ قرآن

کاغذ ہی پر نہیں لاکھوں لاکھ حفاظ کے سینے میں چھپتا ہے۔ قرآن نسخہ شفا ہے!۔

۔۔۔ لیکن آج آپ کو یہ تلاش کرنا ہے کہ اس نسخہ شفا کا طبیب حاذق کون ہے

اور اس فلسفہ کو بھی سمجھنا ہے کہ قرآن میں ہونا اور ہے، اور ہمارا

سمجھنا اور ہے! ۔۔۔۔۔۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم ٥

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ٥

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ٥

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم ٥

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے،

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے "قرآن نسخۂ شفا" ہے۔ اسی مناسبت سے میں نے اس آیت کی تلاوت کی ہے۔ جس میں خدائے قدیر نے قرآن کو مومن کے لئے شفا اور رحمت فرمایا ہے۔

حضرات! یہ ہمارا اور آپ کا وجود دو چیزوں سے مرکب ہے جسم۔ اور۔ روح

اصول یہ ہے کہ جہاں کا مریض ہو وہیں کی دوا بھی دی جاتی ہے۔ چونکہ ہمارا یہ جسم خاکی ہے۔ اس پر خاک کا غلبہ ہے جیسے فرشتے نوری اور جن ناری ہے اسی طرح ہم خاکی ہیں۔ لہٰذا جب ہمارا جسم بیمار ہوتا ہے تو اس کا علاج ان چیزوں سے کیا جاتا ہے جس کو زمین نے اگایا ہو۔ مثلاً جسمانی امراض کے لئے گل بنفشہ

برگ گاؤزباں، خطمی، عناب ولایتی، مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں، مختلف پودوں اور درختوں کے پھول، پتے، چھال اور غنچوں سے کام لیا جاتا ہے۔ دیہاتی علاج میں پھوڑے پھنسی کا علاج نیم کی چھال اور صفائی خون کے لئے نیم کا پھول استعمال کرایا جاتا ہے۔ جو بے حد مفید ہے۔

مگر روح عالم بالا کی رہنے والی ہے اس لئے اس کا علاج بھی عالم بالا ہی کا ہونا چاہئے۔ لہٰذا امراض روحانی کے لئے قرآن مجید عالم بالا سے معالج بن کر آیا۔

حضرات! دنیاوی طبیب کا علاج ظنّی ہے "لگے تو تیر نہیں تو تکّا" مگر میرے سرکار کا علاج قطعی ہے۔

طبیب نسخہ کی ترتیب اس بنیاد پر دیتا ہے کہ وہ ان دواؤں کو آزما چکا ہے۔ اور ان کی تاثیر پر مطلع ہے مگر یہ کچھ ضروری نہیں کہ مرض کی تشخیص صحیح ہو۔ اس لئے ایک طبیب و ڈاکٹر کبھی متعدد بار اپنے نسخہ کو بدلتا ہے۔ اور آزماتا ہے شاید کہ یہ دوا کام کر جائے۔ یہ نہ کرے تو وہ کام کرے۔ غرضیکہ نسخہ میں اس طرح کی کاٹ پیٹ کرتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ دوا کام آئے یا وہ دوا کام آئے۔

لیکن! میرے سرکار کا علاج ظنّی و تخمینی نہیں، بلکہ یقینی ہے۔ مگر سرکار کا علاج اس بنیاد پر نہیں ہے کہ فلاں شے کی فلاں تاثیر ہے بلکہ جس شے کے بارے میں جیسا فرما دیں اس میں وہی تاثیر پیدا ہو جائے جس پر حدیث شریف شاہد عادل ہے۔ ایک صحابیٔ رسول بارگاہِ رسالت میں عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ میرے بھائی کو دست آرہے ہیں کوئی علاج بتائیں۔ آقا نے ارشاد فرمایا اسقہ عسلاً شہد پلاتے ہی مرض اور بڑھ گیا۔ گھبرائے ہوئے حاضر بارگاہ ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں۔ آقا مرض اور بڑھ گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا اسقہ عسلاً اسے شہد پلاؤ۔ اس بار مرض اور زور پکڑ گیا۔ سرکار حاضر ہو کر مرض کی شدت کا تذکرہ کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا، "اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا اسقہ عسلاً اسے شہد پلاؤ۔ شہد پلاتے ہی مرض جاتا رہا۔ بخاری جلد دوم ص ۸۴۸

حضرات ! معلوم ہوا کہ قرآن " علاج الامراض " کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور سرکار " طبیب حاذق " کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جس طرح فن طب کی کتابوں میں موجز، قانونچہ، شرح اسباب اور نفیسی کو دیکھ لینے اور پڑھ لینے سے کام نہیں چلتا بلکہ اس کے کورس اور نصاب کی تعلیم میں استاذ و طبیب کی رائے لینا ضروری ہے۔ نیز اسکول و کالج کا داخلہ بھی ضروری ہے بس اسی طرح قرآن نسخۂ شفا تو ہے لیکن سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے طبیب حاذق ہیں۔ لہٰذا قرآن سے علاج من مانی نہیں کیا جائیگا رسول اللہ کی دی ہوئی ہدایات، ان کے بتائے ہوئے اشارات وکنایات کی واضح تصریحات کی روشنی میں علاج کیا جائیگا۔

حضرات ! اسے یوں سمجھئے کہ جس طرح طبیہ کالج کا کورس پانچ برس کا ہے۔ اب اگر کوئی کالج میں داخلہ نہ لے اور اس کورس کو بجائے پانچ برس پڑھنے کے بیس برس میں پڑھے، اس کی ایک ایک سطر کو دیمک کی طرح چاٹ جائے تو کیا اسے بھارت گورنمنٹ اجازت دے گی کہ وہ بورڈ لگا کر ڈسپنسری کھولے اور علی الاعلان مریضوں کا علاج کرے ؟ ہرگز نہیں۔ حکومت کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دے گی۔ اور اگر ایسے طبیب کے علاج سے کوئی مریض مر گیا تو اس پر مقدمہ بھی دائر کیا جا سکتا ہے۔

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسے علاج کا قانونی حق، اس وقت تک حاصل نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ سند یافتہ نہ ہو۔

بس اسی طرح قرآن نسخۂ شفا و علاج الامراض تو ہے لیکن تنہا اپنا مطالعہ کافی نہیں ہے بلکہ آقائے کائنات کی رائے لینا ضروری ہے

کوئی ہزار عالم و فاضل ہو، بہت بڑا منطقی اور فلسفی ہو، گلی گلی،

ڈگر ڈگر، نگر نگر اس کے علم کا چرچا ہو اور پروپیگنڈہ ہو، اس نے مدرسہ کی بنیاد ڈالی ہو، پیری مریدی بھی کیا ہو لیکن "خاتم النبیین" کا معنی بجائے ختم نبوت زمانی کے ختم نبوت ذاتی، بتاتا اور اسے اپنی نئی دریافت کہتا ہو۔ اور رسول کے بتلائے معنی ختم نبوت زمانی کو عوام کا خیال بتاتا ہو تو اسے مسترد کر دیا جائیگا بلکہ اس معنی کو جو نبی کے بتائے ہوئے معنی سے مزاحم ہو یا اس سے ٹکرائے اس معنی کو اس کے منھ پر مار دیا جائے گا۔ چونکہ ہم قرآن کے مفہوم و معنی اور اس کی مراد کو متعین کرنے میں، اس طبیب حاذق کے محتاج ہیں جس پر قرآن نازل ہوا۔ بھلا ان سے بڑھ کر قرآن کا سمجھنے والا دوسرا کون ہو سکتا ہے؟

لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآن نسخۂ شفا تو ہے مگر اس کے معنی کے تعین، اور اس سے علاج و معالجہ میں ہم طبیب حاذق جناب رسالت مآب صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ہر حال میں محتاج ہیں۔

حضرات! اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے مانا کہ رسول اللہ طبیب حاذق ہیں مگر علاج کے لئے کسی کالج کا داخلہ یا وہاں کا سند یافتہ ہونا اگر ضروری ہے تو پھر آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کون سی سند ہے؟

یقیناً طبیب جانچا پرکھا جاتا ہے۔ کس درسگاہ کا پڑھا ہوا ہے؟ سند یافتہ ہے یا غیر سند یافتہ؟ سند بھی ہے تو مہر ہے یا نہیں؟ اسے کوئی خطاب ملا ہے یا نہیں؟

حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میرے سرکار نے جس دار العلوم میں تعلیم پائی، اس کا نام درسگاہِ الوہیت ہے۔ قرآن سند ہے۔ اور مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ مہر ہے۔ اور لیٰس، طٰہٰ، وغیرہ خطابات ہیں۔

حضرات! ہماری درسگاہوں کا اصول ہے کسی بھی دار العلوم کے

سند یافتہ کی سند پر صرف مہتمم و ناظم اعلیٰ کے دستخط نہیں ہوتے بلکہ بہت سے موجود اکابر علماء و فضلا کے بھی دستخط ثبت کئے جاتے ہیں اور انھیں اس کی فضیلت پر گواہ بنایا جاتا ہے۔

بلا تشبیہ و تمثیل، پروردگار عالم نے عالم ارواح میں تمام انبیاء و رسل کو بھی مصطفےٰ کی نبوت و رسالت پر گواہ بنایا جیسا کہ آیت میثاق شاہد عدل ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْہَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰہِدِیْنَ۔

ترجمہ:۔ اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔ پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ لیا۔ سب نے عرض کیا ہم نے اقرار کیا۔ تو فرمایا تم ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ لیکن ایک سوال یہ ہے کہ

اگر قرآن نسخۂ شفا ہے تو خود قرآن اپنے بارے میں یہ کیوں فرماتا ہے یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَہْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا۔

ترجمہ:۔ بہت سے لوگ اس سے گمراہ ہوں گے اور بہت سے ہدایت یافتہ ہوں گے۔ نسخۂ علاج و شفا ہونے کے بعد پھر اس سے گمراہی کیسی؟

حضرات! قرآن کریم یقیناً نسخہ علاج و شفا ہے لیکن طریقۂ استعمال کی بدعنوانی کبھی مضر ہو جاتی ہے مثلاً دوا ءالمسک طب یونانی کی بہت ہی عمدہ

قوی اور مجرب دوا ہے۔ لیکن اگر یہی دوا محرور المزاج کو بخار کی حالت میں استعمال کرا دیا جائے تو وہی مضر ہو جائے گی۔ لہٰذا اب اگر دوا المسک سے نقصان پہنچ جائے مرض میں اور اضافہ ہو جائے تو یہ ہرگز نہیں کہا جائے گا کہ دوا المسک مضر شے ہے۔ بلکہ یہی کہنا پڑے گا کہ آپ نے اس کے استعمال کا طریقہ نہیں جانا یا آپ نے نسخہ غلط تجویز کیا۔ مرض کی تشخیص نہیں ہوئی۔

حضرات! اس مقام پر پہونچ کر ایک بات اور ملاحظہ فرمائیں۔ قرآن یقیناً نسخۂ شفا ہے اس کے باوجود قرآن کا یہ کہنا کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا وَّ يَهْدِي بِهٖ كَثِيرًا جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ قرآن کے نسخۂ شفا اور علاج ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن قرآن یہ کہہ کر بتانا چاہتا ہے کہ میری تلاوت کرنے والے دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ ہوں گے جو اپنے ذہن کی سادہ تختی میرے حوالے کر دیں گے میں جو دوں گا وہ لے لیں گے۔ گویا وہ اپنے ذہن کو میرے سانچے میں ڈھالیں گے۔ لیکن دوسرا گروہ وہ ہوگا جو مجھ سے لینا نہیں چاہے گا بلکہ اپنا عقیدہ وہ گھر کی کالی کوٹھری اور مدرسہ کی چہار دیواری میں بنائے گا۔ اور عقیدہ بنا لینے کے بعد وہ اپنے عقیدہ کی مجھ سے دلیل مانگنے آئے گا۔ مثلاً اس نے پہلے یہ عقیدہ بنا لیا ان لوگوں کو مت پکارو۔ یہ سنتے ہی نہیں۔ بولتے نہیں۔ چلتے پھرتے نہیں۔ خود اپنے کام نہیں آتے۔ ہمارے کام کیسے آئیں گے وغیرہ وغیرہ

عقیدہ بنانے کے بعد وہ قرآن کے پاس آیا اور اس نے جیسے ہی ترجمہ دیکھا باچھیں کھل گئیں۔ واہ۔ واہ مجھے قرآن سے دلیل مل گئی۔ کہ قبروں پر نہیں جانا چاہیے۔ اجمیر و کلیر، بریلی و بہرائچ جانا شرک ہے۔

بس یہی وہ گمراہ طبقہ ہے جس نے قرآن کو اس کی شان نزول، اور منشاء و مراد کے خلاف استعمال کیا۔ یعنی آیت تو نازل ہوئی بتوں کے بارے میں

اور ثابت کر رہا ہے اللہ کے ولیوں اور بزرگان دین کے لئے اسی لئے قرآن کہتا ہے يضل به كثيرًا ويهدي به كثيرًا

حضرات ! قرآن نسخۂ شفا تو ہے مگر ایسا بھی ہوتا ہے ایک دوا کسی مرض میں شفا کا کام تو کرتی ہے مگر کسی اور مرض میں ابھار بھی پیدا کر دیتی ہے۔ خود نئے مرض کو بھی پیدا کر دیتی ہے جیسا کہ فی زمانہ ایلوپیتھک علاج کی بابت عام دانشوروں کا خیال ہے لیکن قرآن شفائے محض ہی نہیں ہے بلکہ شفائے رحمت بھی ہے اور رحمت کا تقاضا ہے کہ ہر تکلیف و مصیبت سے دور رکھے۔ اسی لئے اسے شفاً ورحمة للمؤمنين کہا گیا تاکہ قرآن اور عام "علاج الامراض" میں فرق وامتیاز ہو جائے۔ اور معلوم ہو جائے کہ قرآن کی حیثیت علاج الامراض قسم کی عام کتب یا ادویہ سے جداگانہ ہے۔ یہ مستقل شفا ہے۔ یہ نہ تو کسی نئے مرض کو پیدا کرتا ہے نہ ہی کسی مرض میں ابھار لاتا ہے۔

حضرات ! ایک نکتہ اور ملاحظہ فرمائیں:

کسی بھی کتاب کو دیکھنے اور مطالعہ کرنے کے لئے دو روشنی کی ضرورت پڑتی ہے ایک تو آنکھ کی روشنی دوسرے آفتاب کی۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک مفقود ہو جائے اور نہ پائی جائے تو کتاب نہیں دیکھی جا سکتی۔ مثلاً اگر آفتاب ہو اور آنکھ نہ ہو یا آنکھ ہو مگر آفتاب کے بجائے گھٹا ٹوپ تاریکی ہو تو ان دونوں حالات میں کتاب کا مطالعہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔

بس ایسے ہی قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بھی دو روشنی درکار ہے ایک آفتاب نبوت کا نور چاہیئے اور دوسرا نور ایمان۔ ابوجہل جیسے بدبخت و بدنصیب کے پاس آفتاب نبوت کی روشنی تو آ چکی تھی مگر وہ نور ایمان سے خالی تھا۔ اسی لئے قرآن کریم نے "للمؤمنین" کی قید لگائی ہے۔ یعنی قرآن شفا تو ہے مگر مومنین کے لئے۔

لہٰذا اس تقریر سے رحمت اور مومن دونوں کی قید کا مفہوم واضح ہوگیا یعنی مومن کی قید کیوں لگائی گئی اور رحمت کی قید کا فائدہ کیاہے۔

حضرات! ایک نکتہ اور ملاحظہ فرمائیں:۔

ہم نے مانا کہ سرکار طبیب حاذق ہیں۔ لیکن طبیب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک خاندانی۔ دوسرا غیر خاندانی۔ خاندانی تو وہ ہے جس کے یہاں یہ فن پشتہا پشت سے چلا آرہا ہو۔ باپ دادا لکڑ دادا سبھی طبیب رہے ہوں۔ گویا وہ پشتینی طبیب ہے۔ اور ایک غیر خاندانی۔ یعنی وہ خود تو طبیب ہے مگر اس سے پہلے اس خاندان میں کوئی طبیب نہ تھا۔ اس فن کا رواج نہیں۔ لہٰذا اس اصول کے تحت سرکار کو دیکھنا ہے۔ کہ سرکار خاندانی طبیب ہیں یا غیر خاندانی۔ اور یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے کہ غیر خاندانی پر خاندانی کو فوقیت و ترجیح ہے چونکہ اس کے پاس خود اپنا بھی تجربہ ہوتا ہے۔ اور خاندان والوں کا بھی۔ گویا ان کے پاس اپنا علم سفینہ ہی نہیں بلکہ علم سینہ بھی ہوتا ہے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہئے میرے سرکار خاندانی طبیب ہیں چونکہ حضرت ابراہیم کے شاہزادے حضرت اسماعیل ہیں۔ اور حضرت اسماعیل ہی سے سرکار کا سلسلۂ نسب ہے اس میں کوئی خلیل ہے کوئی ذبیح ہے۔ اور کوئی حبیب۔

حضرات! یہیں پر ایک نکتہ اور بھی ملاحظہ فرمائیں:

کسی بھی طبیب کے ہاتھ کا شفایاب مریض اس کے طبیب حاذق ہونے کی دلیل بن جاتا ہے۔ پھر میرے سرکار کا کیا کہنا۔ ایک دو نہیں بے شمار مریضوں نے شفا پائی۔

نئی گفتگو کا آغاز

حضرات! قرآن اپنی نوع بنوع خصوصیات میں ایسی جامع، ممتاز اور منفرد کتاب ہے کہ اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر کوئی ایسی کتاب نہیں جو اس کے بمقابل لائی جا سکے۔ ہر فن کا صاحب کمال یہی سمجھتا ہے کہ اس میں اس کا فن بھرا ہوا ہے جو مسئلہ کئی ہزار صفحات میں پھیلا ہوا ہے وہ یہاں ایک جملہ اور ایک نقطہ میں سمیٹ دیا گیا۔ ادیب، اسے بلند پایہ ادب تصور کرتا ہے۔ اہل گرامر اس سے گرامر سیکھتے ہیں، نحوی و صرفی دونوں اسے گرامر کا ترازو و پیمانہ تصور کرتے ہیں۔ اور فلاسفہ و منطقی اس سے اپنی عقل صیقل کرتے ہیں۔ باکمال شعراء اسے نثر کی بہترین شاعری جانتے ہیں، علماء اس کو خزانۂ علم و ذخیرۂ معلومات بتاتے ہیں۔ صوفیاء تزکیۂ نفس اور تطہیر کے لئے روشن کتاب یقین کرتے ہیں، مناظر اس سے فن مناظرہ کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ نقاد اسی سے نقد و نظر کا سانچہ ڈھانچہ تیار کرتا ہے، مصلح اسی سے رشد و ہدایت کا مواد فراہم کرتا ہے، مقنن، اسے قانون کا معیار و ترازو جانتا ہے، منصف اسے عدالت کا کٹہرا تصور کرتا ہے۔ معصیت کیش اسی سے جذبۂ خشیت الٰہی پیدا کرتا ہے، سجدہ گذار اسی سے لذت سجدہ اور اس کی حلاوت و شیرینی حاصل کرتا ہے۔ سپہ سالار، اسی سے فن سپہ گری کی ٹریننگ لیتا ہے۔ تاجر اسی سے لین دین کے اصول سیکھتا ہے، سود خور اسی سے خائف و تائب ہوتا ہے۔

غرضیکہ یہ ایک ایسی جامع کتاب ہے کہ جس نے جس ارادے سے لیا اپنی طلب سے کہیں زیادہ پا گیا۔

اس لئے میں اکثر عرض کرتا ہوں کہ قرآن میں ہونا اور ہے۔ اور ہمارا

پانا اور ہے۔ اگر ہم قرآن میں نہ پاتے ہوں تو یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ قرآن میں نہیں ہے۔ ایک سمندر میں بہت سے غواص غوطہ لگاتے ہیں۔ کوئی مٹی لاتا ہے، کوئی کیچڑ، کوئی کنکر پتھر لے کر آتا ہے۔ اور کوئی صدف و موتی۔

معلوم ہوا سمندر میں صدف و موتی کی کمی نہیں ہے۔ غوطہ لگانے والا چالاک اور تجربہ کار اور اپنے فن کا ماہر ہونا چاہیئے۔ ایسے ہی قرآن شریف میں اصول و قوانین، جو ہمارے حق میں موتی اور جواہرات ہیں ان کی کمی نہیں۔ البتہ اس سمندر کا غوطہ زن درکار ہے۔ ایک ہی مسئلہ میں سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ، سیدنا امام مالک، سیدنا امام شافعی اور سیدنا امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم سبھوں نے مسائل کے استخراج و استنباط کے لئے غوطہ لگایا۔ لیکن امام اعظم کے مسائل کی چمک دمک سب پر غالب رہی اور ہر روشنی ان کے مقابل ماند اور مدھم پڑ گئی۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاءُ۔

حضرات! مضامین پھیلتے جا رہے ہیں۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن میں غور و فکر کرنا، ہر کس و ناکس کا کام نہیں

ع انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

جن کے علمی مراتب بڑے ہیں۔ یہ انھیں کا کام ہے۔ اور انھیں کو اس کا حصہ وافر ملا ہے۔

جیسا غور و فکر کرنے والا رہا۔ اس نے ویسا ہی حاصل کر لیا۔ اب آپ گفتگو سے نہیں، قرآن سے قریب آجائیے۔ مثلاً لیلۃ القدر سے متعلق اختلاف ہیں، کہ وہ کون سی شب ہے؟ جسے لیلۃ القدر کہا جائے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں سیدنا امام اعظم کا بہت ہی محتاط نظریہ، یہ ہے کہ اس کا تعین ہی نہ کیا جائے تاکہ اس شب کا متلاشی ہر رات کو یہی گمان کرے۔ شاید کہ یہی رات ہو اس

طرح سجدہ ریزی اور عبادت گذاری کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہو جائے گا۔ اس شب کا متلاشی ہمیشہ اسی کی تلاش میں لگا رہے گا۔ لیکن احادیث مبارکہ سے رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں کا پتہ چلتا ہے۔ سرکار نے فرمایا ہے کہ اسے رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کیا جائے۔ یعنی ۲۱۔۲۳۔ ۲۵۔۲۷۔۲۹ مگر قرآن میں غور و فکر کرنے والے ایک بالغ نظر اشارہ فرماتے ہیں اسے ڈھونڈنا کیا ہے؟ وہ ستائیسویں شب ہے۔

اس کی دلیل میں فرماتے ہیں کہ سورہ انا انزلناہ فی لیلۃ القدر میں لیلۃ القدر کا تذکرہ تین بار ہے۔ اور لیلۃ القدر میں نو حروف ہیں ل۔ ی۔ ل۔ ت۔ ا۔ ل۔ ق۔ د۔ ر۔ لہٰذا اگر تین کو نو سے ضرب دیا جائے تو ۹ حاصل ضرب ۲۷ ہوگا۔

یہ ان کا قرآن سے طریق استدلال ہے جو ظنی و تخمینی ہے۔ کہنا یہ تھا کہ "قرآن میں ہونا اور ہے۔ ہمارا پانا اور ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک بات عرض کر دوں جو معاً لکھتے لکھتے سطح ذہن پر ابھر آئی ہے۔

(۱) سرکار نے فرمایا" لیلۃ القدر کو طاق راتوں میں ڈھونڈو۔ (۲) امام اعظم نے فرمایا اسے متعین ہی نہ کرو (۳) کسی غور و خوض کرنے والے نے ۲۷ کے متعلق اشارہ کر دیا۔

آپ کسی ذہنی الجھاؤ میں مبتلا نہ ہوں۔ ہر ایک کا منشا الگ ہے بسرکار رحمت تمام ہیں وہ چاہتے ہیں امت کو اشارہ بھی مل جائے اور ایک ہی رات میں نہیں طاق راتوں میں اسی لالچ کے تحت عبادت کرے۔

امام اعظم چونکہ عابد شب زندہ دار بھی تھے۔ لہٰذا اپنے اوپر قیاس فرماتے ہیں کہ کسی بھی بہانے اس قوم کو زیادہ سے زیادہ عبادت کا موقع مل جائے۔ بندوں سے دور خدا سے قریب آجائے۔

تیسری نظر کا منشا یہ ہے کہ زمانہ تغافل و تساہل کا ہے۔ لہٰذا اگر

زیادہ مشقت نہ اٹھا سکے تو کم از کم اس رات کو نہ گنوائے۔

حضرات! پھر اسی پیراگراف سے متعلق ہو جائیے کہ قرآن میں ہونا اور رہے ہمارا پانا اور رہے۔ آئیے ایک مثال اور لیجیے۔

فلاسفہ کہتے ہیں کہ ستاروں میں حرکت "حرکتِ دوریہ" ہے۔ یعنی ستارہ اپنے جس مرکز سے چلتا ہے پھر وہیں آتا ہے۔ لیکن قرآنی بصیرت رکھنے والے صاحب نظر فرماتے ہیں، "ٹاپک ٹیاں مت مارو" ہوائی فائرنگ سے کام نہ لو۔ بلکہ قرآن مجید میں غور کرو تو عقدہ لاینحل بہت آسانی سے حل ہو جائے گا۔ پروردگار نے جہاں ستاروں کی رفتار کا ذکر فرمایا اسے اس طرح فرمایا:

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝

وہ سب کے سب آسمان میں تیر رہے ہیں۔

لہٰذا اب ان کا کہنا یہ ہے کہ جن جملے میں ستاروں کا چلنا بیان کیا گیا ہے خود اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ستاروں کی رفتار میں بھی "دور" ہے قرآن نے کہا کلٌّ فی فلکٍ اس میں جتنے حروف ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

ک۔ ل۔ ف۔ ی۔ ف، ل۔ ک۔

لہٰذا اب اس کو داہنی طرف سے پڑھیے تو "کل فی فلک" پڑھا جائے گا اور بائیں طرف سے پڑھیں تو بھی "کل فی فلک" پڑھا جائے گا۔ جملہ کا دور حرکتِ دوریہ کا پتہ دیتا ہے۔

حضرات! بات یہی چل رہی ہے کہ قرآن میں ہونا اور رہے۔ ہمارا پانا اور رہے۔ اس سلسلہ کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں۔

اقلیدس و جامیٹری کے ماہرین فن کا یہ کہنا ہے کہ ایک کرہ تین سو ساٹھ درجے کا ہوتا ہے۔

کرہ کی تعریف یہ ہے کہ مرکز سے جتنے خطوط نکلتے ہوں وہ سب آپس میں مساوی اور برابر ہوں۔ اب مرکز کو دوسری مثالوں سے سمجھئے:



یعنی یہ نقطہ جو ہے ذہی مرکز ہے۔ اب اس سے جتنے خطوط نکلتے ہوں وہ سب آپسمیں مساوی ہوں گے۔

اب اسے تیسری مثال سے سمجھئے۔ مثلاً  یہاں کرہ بھی ہے، نقطہ مرکز بھی ہے اور خطوط بھی۔ یعنی یہ خطوط آپس میں چھوٹے بڑے نہ ہوں اگر ایسا ہوا تو اسے مرکز نہ کہا جائے گا۔

اسی لئے تو مکہ کو کرہ ارض کا مرکز کہا جاتا ہے۔ اور

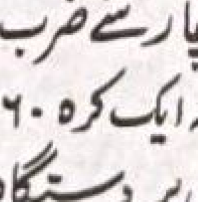
ایک جداگانہ نکتہ آفتاب رسالت کو یہاں طلوع کیا گیا تاکہ مرکز سے جو روشنی پھیل رہی ہو وہ ہر طرف یکساں اور برابر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی سمت زائد ہو۔ اور کسی سمت کم۔

بہر حال ماہرین اقلیدس کا کہنا ہے کہ ایک کرہ تین سو ساٹھ درجے کا ہوتا ہے 

اور خط مستقیم پر جب خط مستقیم گرتا ہے تو وہ نوے درجے کا "دو زاویہ قائمہ" ہوتا ہے۔ اب اسے دوسری مثال میں سمجھئے۔



یہ کرہ ہے اور خط مستقیم گرتا ہے۔ اب اگر اسی پر دوسرا خط مستقیم آجائے تو چار زاویہ قائمہ پیدا ہوں گے۔ اسے اس مثال میں سمجھئے۔



اب ان نوے کو چار سے ضرب دیدیجئے تو بنے ۹/۳۶ تو = ۳۶۰ حاصل ہوا۔ یہ اقلیدس کا کہنا ہے کہ ایک کرہ ۳۶۰ درجے کا ہوتا ہے لیکن قرآنی فہم و بصیرت اور ادراک معنی پر دستگاہ کامل رکھنے والے فرماتے ہیں۔ کہ اقلیدس والوں نے تو محض سمجھانے کی خاطر فرض کر لیا ہے کہ ایک کرہ ۳۶۰ درجے کا ہوتا ہے مگر یہ قرآن میں موجود ہے۔ اب قرآن کے قریب آجائیے۔ قرآن نے اس کا ذکر یوں فرمایا ہے: "قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ":

ہم نے اس کی منزلوں کو پوشیدہ رکھا مگر اس نگاہِ ظاہر کا کیا کہنا جو پوشیدہ سے پوشیدہ کو اپنی عمیق نگاہوں سے دیکھ لے۔ پوشیدہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں نہیں ہے بلکہ اس کی واضح دلالت یہ ہے کہ ہے تو مگر اسے پوشیدہ رکھا تاکہ قاری قرآن کو اس کی تجسّس و تلاش کا شوق پیدا ہو۔

اسی لئے تو قرآن جابجا کہتا ہے کہ فاعتبروا یا اولی الابصار گویا قرآن اہل بصیرت کو دعوت فکر و نظر دیتا ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ

حضرات! اب آپ چند لمحوں میں قرآن کا اعجاز بلاغت ملاحظہ فرمائیں:
تاریخ عرب کا آپ نے مطالعہ کیا ہوگا۔ تو یہ بات گوشۂ ذہن میں بہت اچھی طرح محفوظ ہوگی کہ اہل عرب کا دورِ جاہلیت ہمیں یہ بتاتا ہے کہ عرب ایک جنگجو قوم تھی۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے پشتینی بدلہ لیتا تھا۔ کنویں اور چشمے پر پہونچ کر پانی کے لئے اول اور بعد پر تلواریں نکل آتیں ۔

سر رہ کہیں آنے جانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز رہتی تھی تکرار ان میں،
یوں ہی روز چلتی تھی تلوار ان میں

شراب ان کی گھٹیوں میں تھی مگر بہت سی خرابیوں کے ساتھ ان کا یہ وصف تھا کہ وہ اپنے کو اہل زبان کہتے تھے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اپنے علاوہ دوسروں کو عجمی کہتے تھے جس کے معنی گونگے کے ہیں۔ یعنی ان کی نگاہ میں وہ اہل زبان تھے باقی ساری دنیا گونگی تھی۔ زبان کی تعلی اور اظہار تفوق میں انھیں غرہ تھا ڈھکے چھپے الفاظ میں نہیں بلکہ بر ملا وہ اس کا اعلان کیا کرتے۔

ان کا یہ تفاخر کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ چنانچہ وہ زبان کی حفاظت کا بہت اہتمام کرتے۔ بڑے گھرانوں کا بچوں کو دایہ کے سپرد کرنا۔ یہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ چونکہ شہر میں دوسرے شہریوں کی آمد و رفت ہوتی تھی۔ اور ان کا بھی بغرض تجارت دوسرے شہروں میں آنا جانا ہوتا تھا۔ اسی میل جول میں زبان مخلوط ہو جاتی ہے۔ بہت سے الفاظ دوسروں کے، زبان زد ہو جاتے ہیں مگر دیہات اس سے محفوظ ہوتا تھا۔ ان کی خالص اپنی ٹکسالی زبان ہوتی

تھی جس کو ان کی اپنی مادری زبان کہا جا سکتا تھا، تا کہ زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما ایسے ماحول اور ایسی جگہ میں ہو جہاں دوسری زبان کے مخلوط ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اہل زبان تھے جس پر ان کا تفاخر بجا تھا شعر و شاعری میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ وہ اپنے قصیدے کو خانۂ کعبہ کے صدر دروازے کی پیشانی پر آویزاں کر کے دوسروں کو چیلنج کرتے کہ اگر کوئی ہمارا ہم پلہ ہو تو اس کا جواب لائے۔

چنانچہ "سبعہ معلقہ" درس نظامیہ میں داخل نصاب ہے (سبعہ کے معنی سات معلقہ کے معنی لٹکایا ہوا۔ یہ وہ سات قصیدے تھے جو کعبہ کی دیوار پر لٹکائے گئے تھے۔ اسی مناسبت سے اس مجموعہ کا نام سبعہ معلقہ رکھا گیا) وہ اہل عرب کے اسی اظہار فن کی تاریخی یادگار ہے۔

عرب شعراء میں "امرأ القیس" جس کا نام سر فہرست ہے اس کے ایک واقعہ سے اندازہ کیجئے کہ اس کو دو آدمیوں نے قتل کیا مگر جب اس نے سمجھ لیا کہ اب مجھے قتل ہی کر دیا جائے گا تو اس نے ان دونوں سے کہا میری آخری آرزو ہے کہ میری دو لڑکیاں ہیں میرے قتل کے بعد میرا یہ پیغام ان دونوں کو پہونچا دینا۔ اس کا تم وعدہ کرو۔

ان لوگوں نے وعدہ کر لیا۔ اور اہل عرب ایفائے عہد میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ پیغام کے طور پر امرء القیس نے شعر کا ایک مصرعہ دیا۔ الا یا ابنتا امرء القیس ابا کما۔ وعدہ کے مطابق قاتلوں نے یہ پیغام اسکی لڑکیوں تک پہنچا دیا لڑکیاں کچھ دیر کے بعد شور مچاتے ہوئے کہنے لگیں کہ انھیں گرفتار کر لیا جائے یہ میرے باپ کے قاتل ہیں۔ جب ان سے اس سلسلہ میں استفسار کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ان کے ذریعہ میرے باپ نے مصرعہ کی شکل میں ایک پیغام بھیجا ہے اس کا دوسرا موزوں اور مربوط مصرع صرف یہی ہو سکتا ہے۔ قد قُتِل و قاتلاہ للہ اکما۔ لہٰذا ہمیں پورا یقین ہے کہ یہی ہمارے باپ کے قاتل ہیں۔

یہ میرا موضوع نہیں ہے اپنے اصل مقام پر اس کی تفصیلات عرض کروں گا۔ مجھے یہ بتانا ہے کہ قرآن رسولِ خدا پر اترا۔ عرب جنھیں اپنی زبان دانی اور فصاحت وبلاغت پر غرور تھا۔ وہ اپنے مقابل کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور نہ اپنا ہمسر سمجھتے۔ مگر قرآن کی فصاحت وبلاغت نے ان کے غرور کا شیش محل بالکل چکنا چور کر دیا۔ سنتِ الٰہیہ بھی یہی ہے کہ جس قوم کو اپنی جس توانائی پر غرور رہا پروردگار اپنے نبی ورسول کو وہی طاقت بلکہ اس سے کہیں زائد طاقت عطا فرمایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قوموں کو جھکایا کیسے جاتا۔

چنانچہ نزولِ وحی کے بعد کفارِ مکہ میں بڑی کھلبلی مچ گئی۔ کہ جو ہمارا اصل سرمایہ تھا۔ اسی پر آنچ آرہی ہے۔ بھلا وہ اسے کب برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے نت نئے حربے استعمال کئے تاکہ قرآن کی فوقیت وبرتری نہ ماننی پڑے۔

آخر آقائے دوجہاں نے انھیں کے حسبِ دستور قرآن مجید کی ایک چھوٹی سی سورت "انا اعطینک الکوثر" کو کعبہ کے صدر دروازے پر آویزاں کرا دئے جس کے معنی یہی تو تھے کہ تم اہلِ زبان ہو۔ تو قرآن کی کسی بھی سورہ کا اگر نہیں تو کم از کم اس مختصر سی سورہ کا جواب لاؤ۔ مدتوں یہ سورہ کعبہ کے صدر دروازے پر آویزاں رہی۔ قرآن نے زبان کے فن کاروں اور بازیگروں کی قلعی کھول دی۔ اور یہ ثابت کر دکھایا کہ کلامِ انسانی اور ہے اور کلامِ ربانی کا درجہ اور ہے۔ تمہارا کلام ایک مخلوق کا کلام ہے لیکن یہ اس احکم الحاکمین کا کلام ہے جو تمہارا بھی خالق ہے۔ اور زبان وبیان کا بھی خالق ہے۔

چنانچہ کفارِ مکہ نے اب ہتھیار ڈالنا شروع کر دیا لیکن آسانی سے نہیں۔ گاہے گاہے چیلنج دیتے رہے اور سرکار ان کا چیلنج قبول بھی کرتے رہے۔ چنانچہ ہم اہلِ سنت کا بھی یہی دستور ہے کہ ہم اپنے حریف کو چیلنج تو نہیں

کرتے لیکن چشم روشن دل ماشاد کہ کران کا چیلنج ضرور قبول کرلیتے ہیں۔ اور قبول ہی نہیں کرتے بلکہ نمٹتے ہیں اور انھیں ان کے گھر تک بھی پہونچا آتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے اکابر کا کہنا ہے "چھیڑو مت اور چھیڑ جائے تو چھوڑو مت"

بہر حال اس سلسلہ میں دو ایک مناظرے سماعت فرمائیں تاکہ قرآن کی فصاحت و بلاغت پر ادبائے عرب کی شکست و ہزیمت نہ صرف یہ کہ ایک تاریخی دستاویز کا کام دے بلکہ اس دستاویز کی مہر بن جائے۔

حضرات! ایک بار کفار مکہ نے صحابۂ کرام کو چیلنج کیا۔ تم اپنے قرآن کی فصاحت و بلاغت کے مدعی ہو جبکہ "ہزوا، کبار، اور عجاب" جیسے ثقیل الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ فصاحت و بلاغت کے معیار پر نہیں اترتے۔ یہ گرے ہوے الفاظ ہیں اور ایسے گرے ہوئے الفاظ کو کیسے کلام ربانی مانا جاسکتا ہے۔؟

آخر شدہ شدہ آقائے دوجہاں صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گوش ہمایوں تک یہ آواز گئی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اگر وہ چیلنج کر رہے ہیں تو تم لوگ ان کا چیلنج قبول کرلو۔

چنانچہ تاریخ، دن، جگہ، وقت سب کا تعین ہو گیا۔ اور ٹھیک اس تاریخ کو اسی وقت کفار مکہ اپنے ایک بہت ہی گھسے پٹے، بوڑھے پرانے کھرانٹ کھوسٹ ادیب کو لے کر مناظرہ کے لئے بارگاہ رسالت مآب میں پہونچے جس کی زبان دانی کا پورے عرب میں بڑا شہرہ تھا۔ وہ بوڑھا اس محفل میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی سرکار نے فرمایا، آپ کو زحمت تو ہو گی مگر وہاں نہ بیٹھئے۔ ادھر بیٹھ جائیے۔ حکم پاتے ہی وہ دوسری جگہ بیٹھ گیا۔ جیسے ہی وہ بوڑھا بیٹھا۔ سرکار نے پھر فرمایا کہ وہ جگہ مناسب نہیں ہے وہاں بیٹھ جائیے پھر اس جگہ کو چھوڑ کر وہ وہاں بیٹھ گیا مگر ناک پر غصہ آچکا تھا اس کے بیٹھتے ہی سرکار نے سہ بارہ فرمایا۔ وہ جگہ مناسب نہیں

ادھر بیٹھ جائیے۔

بس یہ سنتے ہی ناک کا غصہ زبان پر آگیا۔ اور ایک ہی سانس میں بول گیا: تنخذ نی ھزدا، کیا آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں۔ ھذا رجل عجاب یہ تو کوئی عجیب و غریب آدمی ہے انا شیخ کبار میں تو بہت معمر بوڑھا ہوں۔

یہ سنتے ہی کفار مکہ کی اٹھی گردنیں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔ یعنی وہی الفاظ جسے غیر فصیح و بلیغ کہتے تھے ان کا فصیح و بلیغ مناظر محفل مناظرہ میں بول رہا ہے۔

اب کفار مکہ کے لئے دو الزام میں سے کسی ایک کا قبول کرنا ناگزیر تھا۔ یا تو اس بوڑھے کو ادیب نہ کہیں چونکہ وہ غیر فصیح الفاظ بول رہا ہے اور اگر اسے ادیب مانو تو ہزدا، عجاب، کبار کو غیر فصیح نہ کہو کیونکہ اگر یہ غیر فصیح ہوتا تو تمہارا ادیب اسے بولتا کیسے۔ اس کا بولنا ہی فصیح و بلیغ ہونے کی دلیل ہے۔

اگر اس بوڑھے کو تم لوگ ادیب و فصیح نہ سمجھتے تو مناظرہ کے لئے لائے ہی کیوں؟ لہٰذا ہزدا، عجاب اور کبار کا فصیح و بلیغ ہونا روز روشن کی طرح واضح ہو گیا۔

گذشتہ واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہئے کہ ماہر لسانیات واقف اسرار و رموز، دانائے ظہور و غیوب، زبان کے نوک و پلک اور اس کی لچک سے کس حد تک اور کہاں تک آگاہ و مطلع تھے۔

اہل عرب کی نگاہ، زبان کی اس تہ تک نہیں پہونچی کہ ان الفاظ کے بولنے کا موقع و محل کیا ہے؟ مگر سرکار کی نگاہ زبان کا سینہ چیر کر اس تہ تک پہنچ گئی کہ اس کے استعمال کا موقع و محل پیدا کر دیا۔ اور غصے کی برہمی و جھنجھلاہٹ میں وہ اتنا بھی محسوس نہ کر سکا کہ میں جن الفاظ کے غیر فصیح ہونے پر مناظرہ کرنے آیا ہوں اسی کو استعمال کرنے جا رہا ہوں اس کو کہتے ہیں "جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے"۔ اب شکست فاش کے بعد

کفار مکہ کے پاس اور چارہ کیا تھا۔ وہ اپنا سا منھ لے کر رہ گئے اور صحابہ کرام کی گردنیں بلند سے بلند تر ہو گئیں۔ صلی اللہ تعالےٰ علی النبی الامی وآلہٖ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم صلوٰۃً وسلاماً علیک یارسول اللہ۔

اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی سماعت فرمائیں۔

دوسرا واقعہ ایسے ہی ایک بار کفار مکہ نے مناظرہ کی دھمکی دی آقائے کائنات نے اسے بھی قبول کر لیا اور پھر ان کو ایک ایسے مناظر کی تلاش ہوئی جو اس میدان کو سر کر سکے۔

چنانچہ بہت دوڑنے دھوپنے کے بعد ایک دقیانوسی ادیب کو ڈھونڈ لائے اور اسے لے کر چلے۔ وہ جب آقائے دو عالم کی بارگاہ سے قریب پہونچا تو میرے سرکار قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اور قریب آئے تو بوڑھا پیشانی کے بل گر پڑا۔ لوگوں نے سمجھا بہت بوڑھا نحیف و نزار ہے، ناتوانی کی وجہ سے چلا نہیں جاتا آگے بڑھے پیشانی اٹھائی پانی کا چھڑکاؤ کرنے لگے۔ ہائے ہائے کمزوری بہت بڑھ گئی ہے چلا نہیں جاتا۔ بوڑھے نے تیور بدل کر کہا: نادانو! میں کمزوری کے باعث گر نہیں گیا بلکہ قرآن کی ایک آیت "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ" میرے کان کے پردے سے ٹکرائی تو میں اس کا سجدۂ فصاحت ادا کر رہا تھا۔ یہ تو کلام انسانی نہیں کلام ربانی معلوم ہوتا ہے۔ ایک مختصر سے ٹکڑے میں انتہائی حسن و خوبی سے دو متضاد باتوں کا ذکر، پھر اس کا نباہ انسان کے بس کی بات نہیں۔

(یعنی قرآن کہتا ہے کہ اے لوگو! تمہاری زندگی قصاص میں ہے یعنی خون بہا میں ہے۔ یعنی خون کا بدلہ اور قتل کا بدلہ۔ حیرت ہے کہ خون بھی بہایا جائے اور زندگی بھی، زندگی کا سکون بھی حاصل ہو۔)

آپ نے اندازہ کیا یہ بوڑھا ابھی بارگاہ رسالت میں پہنچا نہیں

اور پہونچنے سے پہلے ہی ہتھیار ڈالدیا اور کاندھے کا جوا اتار دیا۔

کہنا یہ ہے کہ عرب کے اہل زبان نے آسانی سے قرآن کی فصاحت و بلاغت کا لوہا نہیں مانا۔ آزمایا، جانچا، پرکھا تب کہیں غلامی کا قلادہ گردن میں ڈالا۔ اگر یہ قرآن کسی ایسی قوم میں اتارا جاتا جو زبان سے کوری، نابلد اور ناآشنا ہوتی، تو اس کا کوئی معیار نہ ہوتا اور قرآن کو وہ اہمیت نہ حاصل ہوتی جو آج حاصل ہے

مناظرے کا ایک دوسرا رخ

میرے دادا ولکڑ دادا استاد سیدی وسندی استاذ العلما بحر العلوم صدر الافاضل حضرت مولانا محمد نعیم الدین صاحب قبلہ مرادآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کا مناظرہ ٹھیک عنفوان شباب میں ایک معمر عیسائی پادری سے ہوا تھا۔

حضرت صدر الافاضل رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ جب میدانِ مناظرہ میں تشریف لائے تو عیسائی پادری نے جوانی کی عمر دیکھتے ہوئے یہ خیال کیا، کہ آڑے ہاتھوں لے لیا جائے۔ تو بڑی تمکنت سے بولا: شاہزادے! مناظرہ سے کیا فائدہ۔ اس کا کچھ حاصل تو ہوتا نہیں سوائے تضیع اوقات کے۔ وہ بکواس کرتا رہا اور حضرت سنتے رہے۔ جب اس کی یاوہ گوئی ختم ہوئی تو حضرت نے فرمایا جناب یہ وعظ ونصیحت کی محفل نہیں ہے، میدان مناظرہ ہے چیلنج مناظرہ سے پہلے یہ لکچر دینا چاہئے تھا اب اس گفتگو کا کیا حاصل۔ اب تو ہمیں چوگاں ہمیں میداں ہمیں گوئے۔ بس اب نہ موضوع بدلے نہ میدان، مناظرہ شروع ہونا چاہئے۔

جب اس نے تحکم اور ہمت مردانگی اور علم کا جوش وغلغلہ دیکھا تو مشتعل ہو کر بولا۔ ارے شاہزادے! آپ ہم سے کیا مناظرہ کروگے۔ ہم

کو تو قرآن کے پندرہ پارے یاد ہیں۔ تم ہماری انجیل کا ہمیں ایک ہی پارہ سنادو۔

یہ سنتے ہی اہلسنت کا سرخیل جماعت، مفسر قرآن، بیباک و نڈر، مناظر اعظم گرجتی آواز میں بولا: جناب! ہمارے قرآن کا تو پندرہ پارہ آپ کے سینے میں گھر بنا چکا ہے۔ اس انجیل کا ایک پارہ تو آپ مجھ سے بعد میں سننے کا مطالبہ کیجئے گا۔ پہلے خود ہی اپنے انجیل کا ایک پارہ ہمیں سنادیں۔ یہ سنتے ہی پادری ہکا بکا رہ گیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اب سارا مجمع مطالبہ کر رہا تھا سناؤ ارے یاد ہو تو سنادے۔ پادری بغلیں جھانکنے لگا۔ اور فرار کے سوا کوئی راہ نظر نہ آئی۔

قرآن کی یہ خوبی بھی سمجھ میں آگئی اپنے تو اپنے غیروں کے بھی سینے میں اپنی جگہ بنالیتا ہے۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ آج بین الاقوامی سطح پر اگر قرآن وغیرہ کو چیلنج کیا جائے کہ اب اسے چھپنے نہ دیا جائے گا تو ہر کتاب اس اعلان کے سامنے سلنڈر کر جائے گی لیکن قرآن اور صرف قرآن اس چیلنج کو قبول کرلے گا۔

حضرات! آپ مجھے بتائیں میں بھی آپ کی عنایات اور بزرگوں کی دعاؤں سے اکثر کتابیں لکھتا رہتا ہوں۔ اگر میری کسی کتاب کا اعلان اخبارات ورسائل میں آجائے، بڑا شہرہ ہو، بڑی دھوم دھام ہو۔ حکومت کے کان کھڑے ہو جائیں۔ اور سی آئی ڈی محکمہ کو حکم دیا جائے کہ سراغ لگاؤ۔ مشتاق نظامی کی وہ کیسی کتاب ہے۔ قابل طباعت ہے یا نہیں؟ سی آئی ڈی نے چھاپہ مارا اور حکومت کو آگاہ کیا کہ بڑی ڈینجر ملک دشمن کتاب ہے۔ اس کے چھپتے ہی تہلکہ مچ جائے گا۔ خلفشار وانتشار کا اندیشہ ہے حکومت نے مسودہ قبضہ لے کر ایک ایک سطر ضبط کرلیا۔

اب آپ فرمائیں کہ کیا اس کتاب کا کوئی نسخہ روئے زمین پر مل سکے گا۔ چونکہ اس کتاب نے پریس کی صورت نہیں دیکھی، کسی نسخے کے ملنے کا کیا

سوال ؟

حضرات! ایسا کیوں ہے ؟ محض اس لئے کہ یہ تمام کتابیں پریس کی رہین کرم ہیں۔ کاغذ پر چھپا کرتی ہیں۔ لیکن قرآن ہی ایسی کتاب ہے جو بے شمار حافظوں کے سینے میں چھپتا ہے۔ قرآن کے سوا یہ تفوق و برتری آج تک کسی کتاب کو نہ حاصل ہو سکی۔ یہ ایک ایسی زندہ جاوید کتاب ہے کہ دنیا اس کے خلاف اپنا کوئی بھی ہتھکنڈہ استعمال کرے اسے زیر ہونا ہے اور قرآن کو زبر ہونا۔

حضرات! اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ عام کتابوں سے اس کا مزاج بالکل جداگانہ ہے۔ اگر اس کے زیر زبر میں تبدیلی کی گئی تو یہ صرف زیر و زبر میں تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس سے قانون تک بدل جاتا ہے۔

خیال فرمائیے جس کتاب کا زبر، زیر اور پیش کوہ ہمالہ سے بھی زیادہ وزنی ہو۔ اللہ اکبر! اس کی آیات اور سورتوں کے وزن کا کیا عالم ہوگا۔

"زبر، زیر" کی تبدیلی کا جب ذکر آ ہی گیا ہے تو اس کا ایک گوشہ ملاحظہ فرمائیے:

آیت وضو یہ ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ (الآیۃ)

آیت کا آخری ٹکڑا ہے "وَاَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ" ہم اہلسنت وجماعت "اَرْجُلَكُمْ" کے 'ل' کو زبر دیتے ہیں اسے "فاغسلوا" کے تحت مانتے ہیں۔ مگر اہل تشیع 'ل' کو زبر دینے کے بجائے "زیر" دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ وضو میں پاؤں کو دھوتے نہیں بلکہ سر کی طرح پاؤں کا بھی مسح کرتے ہیں

اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع یہ نہیں ہے کہ ان دونوں میں حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے ؟ ہمیں تو صرف گرامر کی روشنی میں بتانا ہے کہ قرآن کی

"زبر، زیر" کی بھی اتنی اہمیت ہے کہ اعراب کے بدل جانے سے قانون بدل جاتا ہے۔

گفتگو ختم ہوتے ہوتے ایک اور نکتہ سماعت فرمائیے کہ قرآن نہ تو صرف لفظ کا نام ہے اور نہ صرف معنی کا۔ قرآن لفظ ومعنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ امام اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کا ایک قول معنی سے متعلق تھا مگر وہ اس سے رجوع فرما چکے ہیں۔

چنانچہ ایک بار سید بدیع الدین زندہ مدار رحمۃ اللہ علیہ جونپور تشریف لائے جسے "شیراز ہند" کہا جاتا تھا اور اس عہد میں ایک وقت میں پانچسو علماء کی سواریاں نکلتی تھیں۔ علمائے ظاہر نے خدمت میں حاضری دی اور چند سوالات کئے۔ ان میں ایک سوال تو یہ تھا کہ ہم لوگوں نے سنا ہے آپ جو لباس زیب تن فرماتے ہیں یہ اٹھارہ برس سے پہنا ہوا ہے مگر اس پر کہیں کالی چھینٹ تک نظر نہیں آتی۔ اور دوسرا سوال یہ تھا کہ ہم لوگوں نے یہ بھی سنا ہے کہ آپ نے اٹھارہ برس سے کھانا نہیں کھایا۔

آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ آپ نے سفید بگلا دیکھا ہے؟ علماء نے کہا کیوں نہیں۔ فرمایا اس کا سفید پر اس کا لباس ہی تو ہے۔ اب یہ بتائیے اس کے پَر کے اوپر آپ نے کوئی چھینٹ دیکھی ہے؟ علماء نے فرمایا نہیں۔ آپ نے فرمایا، جب ایک پرندے کا لباس گندہ نہیں ہوسکتا، تو میں غلام مصطفےٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہوں۔ پھر میرا لباس کیوں کر گندہ ہوسکتا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہوں۔ اور قرآن لفظ ومعنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اے علمائے ظاہر جب میں قرآن کی تلاوت کرتا ہوں تو اس کے الفاظ سے میرے جسم کو غذا مل جاتی ہے۔ اور اس کے معنی سے میری روح کو۔ جب قرآن ہی سے جسم

ور وح دونوں کو خوراک مل جائے تو کھانے کا کیا سوال؟

حضرات! قرآن کی ایک دوسری انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس پر ایک طویل زمانہ گذر گیا مگر آج تک اس کا ایک ایک اعراب علی حالہ جوں کا توں محفوظ ہے اسے قدرت نے اغیار کی دست برد اور دست اندازی سے ایسا محفوظ رکھا کہ دنیا کی بہت ساری قومیں اچنبھے میں ہیں۔ چنانچہ ایک عیسائی پادری کا واقعہ ہے کہ وہ مدتوں اس کا ریسرچ کرتا رہا کہ خدا کی اس طویل وعریض اور وسیع زمین پر سب سے اچھا اور سچا مذہب کون ہے۔ اور یہ بات پڑھے لکھے عیسائیوں کو معلوم تھی۔ آخر ایک مدت مدید کے بعد اخبارات میں اعلان آیا کہ فلاں پادری نے اسلام قبول کر لیا۔

یہ خبر پھیلتے ہی عیسائیوں کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی اور اس کے پاس وفود پر وفود جانے لگے اور سب نے دریافت کیا آخر وہ کون سا داعیہ ہے جس نے تمہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کہا علیحدہ علیحدہ کیسے بتایا جائے۔ سب واپس جاؤ۔ اخبار میں میرا اعلان پڑھ لینا۔ اخباری بیان جو آیا وہ یہ ہے:

"مذہب اسلام میں ویسے بے شمار خوبیاں ہیں مگر اس بات سے بہت متاثر ہوا اگر دنیا کا بہترین خطاط قرآن کی کتابت کرے اور دنیا کا سب سے اچھا پریس چھاپے اور سب سے عمدہ کاغذ پر چھپے اور اس کی جلد بھی خوبصورت اور عمدہ۔ لیکن مسلمان کے کان میں اس کی بھنک آجائے کہ اس میں کہیں زبر کی جگہ زیر آگیا ہے تو اس کا کوئی نسخہ لینا نہیں چاہے گا۔ برخلاف اس کے انجیل میں من مانی کاٹ چھانٹ ہوتی ہے۔ ترمیم وتنسیخ

کی جاتی ہے۔ گھٹایا بڑھایا جاتا ہے مگر اس انجیل محرف کو لینے میں عیسائیوں کو کوئی تامل نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ انجیل محرف ہے۔

رسولُ اللہ جو عطا فرمائیں اُسے لے لو!

حضرات! آج میری تقریر میں غلط و کھوکھلے نعرے کا بھرم کھولنا ہے۔ کچھ نام نہاد مدعیانِ اسلام کا، یہ کھوکھلا نعرہ ہے کہ ہمیں جو لینا ہوگا خدا سے لیں گے۔ اور خدا یہ فرماتا ہے کہ تمہیں وہی لینا پڑے گا جو میرے مصطفےٰ تمہیں دیں گے۔

گویا جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے وہ ان کی برہنہ پشت پر تازیانۂ عبرت ہے اور مکروہ چہرے پر غیبی طمانچہ۔

معلوم ہوا میرے سرکار خدا اور بندوں کے درمیان ایک وسیلہ ہیں۔ اب اسی کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى حَبِيْبِهِ الْمُصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

حضرات! جس آیت مبارکہ کی میں نے تلاوت کی ہے۔ اب کسی تمہید کے بغیر اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ خدائے قدیر ارشاد فرماتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ میرے مصطفیٰ جو کچھ تم لوگوں کو دیں لے لے لو اور جن چیزوں سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔

کہنے کے لئے بظاہر کتاب اللہ کا ایک مختصر ٹکڑا ہے لیکن خداوند قدوس نے اسی مختصر سے ٹکڑے میں ہمارے قانون زندگی کو سمو دیا ہے اور اسی اتنے ہی حصے میں ہمارے دستور حیات کو سمیٹ دیا ہے۔

یہ انسانی کتاب نہیں آسمانی اور منزل من السماء کتاب ہے۔ اسمیں امثال و نظائر کا پھیلاؤ بھی ہے اور قانون کا ایجاز و اختصار بھی۔ ویسے ہم اور آپ بھی کسی کی تعریف میں بولتے ہیں کہ فلاں خطیب کا کیا کہنا "ایسا جادو بیان مقرر کہ اس نے سمندر کو کوزہ میں بھر دیا۔ لیکن یہ اردو زبان

کی صرف کہاوت اور ضرب المثل ہے۔ مگر میں نے جس آیت کی تلاوت کی ہے، وہ اس کہاوت کی منہ بولتی مثال ہے۔ ہم اس کی تفصیل آگے عرض کریں گے سب سے پہلے اس بات کو ذہن نشیں کر لیجئے کہ میرے مصطفےٰ جو دیں اسے ہم لے لیں اور وہ جن چیزوں سے روکدیں ہم اس سے رک جائیں۔

حضرات! اگر مسلمان کو یہ قانون یاد رہ جائے تو اس کا قدم کبھی ڈگمگا نہیں سکتا۔ نہ ہی وہ پھسلے اور نہ وہ گرے۔ مثلاً اگر وہ کسی چیز کو پینا چاہتا ہے اور ہونٹوں کے قریب آتے آتے اسے یاد آجائے کہ میں اسے پینے تو جارہا ہوں، کہیں رسول خدا نے اسے حرام تو نہیں فرمایا۔ اب اسے وہ پی نہیں سکتا۔ اس کا ضمیر نفرت و ملامت کرے گا۔ ہاتھوں سے پھینک دے گا۔ اگر وہ کسی چیز کو کھانے جارہا ہے مگر اسے یہ خیال آجائے کہ میں کھانے تو جارہا ہوں، کہیں میرے سرکار نے اسے حرام تو نہیں کہا؟ بس وہ نوالہ اب حلق سے نیچے نہیں اتر سکتا۔ اسے اگل دے گا، پھینک دے گا۔ ایسے ہی وہ اگر کسی طرف بڑھتا جارہا ہے، کہیں آقائے دوجہاں نے وہاں جانے سے روکا تو نہیں۔ اب یہ قانون اس کے پاؤں کی بیڑی بن جائے گا۔ قانون کا احترام اور اس کی عظمت آہنی زنجیروں میں جکڑ دیں گے۔ اب وہ ایک قدم بھی آگے نہیں کھسک سکتا۔

بس معلوم ہوا ہمیں وہ لینا ہے جو میرے سرکار ہمیں دیں، اور ان چیزوں سے آنکھیں پھیر لیتی ہے، دامن سمیٹ لینا ہے، کترا کے گذر جانا ہے۔ جن چیزوں سے سرکار نے ہمیں روک دیا ہے۔

حضرات! میں نے ابھی ایک بات آپ سے عرض کی تھی کہ اردو ادیب تو صرف بولتا ہے کہ سمندر کو کوزے میں بھر دیا لیکن اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے خواجہ نے عملاً اسے کر کے بھی دکھا دیا۔ آپ کو یاد ہوگا جب سلطان ہند غریب نواز اجمیر شریف لائے۔

تو انھیں اہلاً و سہلاً نہیں کہا گیا۔ ان کا پرتپاک خیر مقدم نہیں ہوا۔ بلکہ طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ اور نوع بنوع امتحانات لئے گئے۔ لیکن میرے غریب نواز کو ہر میدان میں فتح و نصرت اور بالادستی حاصل رہی۔

عہد جاہلیت کے فراعنہ اپنی نت نئی ترکیبوں سے زیر کرنا چاہتے تھے مگر اللہ کا برگزیدہ بندہ اپنی حکمت عملی اور قوتِ باطنی سے اس کی ایسی کاٹ کر دیتا کہ ان کا ہر طلسم تارِ عنکبوت سے کمتر ثابت ہوتا۔

اس عہد کے راجپوت اسے برداشت نہیں کر پا رہے تھے کہ ہم صنم پرستوں کے بیچ یہ نماز، روزے اور مصلی و تسبیح والا کیسے آگیا۔ ایک مقدس دروازہ کے قدسی صفات مہمان کے ساتھ ظالموں سے جو کچھ بھی ہو سکا وہ سب کر دکھایا۔ لیکن غریب نواز کے پائے استقامت میں جنبش تک نہ آئی وہ ایسے ہی جمے رہے جیسے کوہِ ہمالہ اور رتار اگڑھ کا پہاڑ زمین کی چھاتی پر جما ہوا ہے۔ آلام و مصائب کے پہاڑ توڑے گئے، ہر چند کوشش کی گئی کہ یہ پردیسی یہاں سے بھاگ کھڑا ہو۔ لیکن غریب نواز بہت خاموشی سے عملاً انھیں بتاتے رہے کہ اگر بھاگنا ہی مقصود ہوتا تو یہاں میں آتا ہی کیوں؟ اسے مستقبل ہی بتائے گا کہ ہمارا بوریہ بستر گول ہوتا ہے یا تمہارا۔

چنانچہ اس نے ترکش کا آخری تیر پھینکا۔ اور غریب نواز و معتقدین پر "اناساگر" کا پانی بند کر دیا۔ متوسلین نے عرض کیا اب تو جور و جفا اور ظلم و ستم کی حد ہو گئی۔ ظالموں نے اناساگر کے پانی پر پہرہ بٹھا دیا ہے۔ ہم اب اس کی ایک بوند تک نہیں پا سکتے۔ گویا میدانِ کربلا اپنی تاریخ کو پھر دہرانا چاہتا ہے۔ اللہ کے ولی سلطانِ ہند نے فرمایا یہ چھاگل لو۔ اور اناساگر کا پانی اس میں بھر لاؤ۔

حضرات! اگر آج کا مرید ہوتا تو جاتا نہیں، پیر سے مناظرہ کرتا۔ حضور! کہاں اناساگر، جو کہنے میں ساگر اور دیکھنے میں جھیل معلوم ہوتا ہے

بھلا اس کا پانی اس میں کیسے آسکتا ہے۔ لیکن وہ پندرہویں صدی کا مرید نہیں تھا بلکہ نگاہ خواجہ کا پروردہ تھا۔ اس نے درسگاہ خواجہ میں تربیت پائی تھی جنکی ایک نگاہِ کرم چور کو سلطان، محکوم کو حاکم، اور وہی نگاہِ عتاب راجہ کو پرجا بنا دے، جو آن کی آن میں انسانیت کی کایا پلٹ دے حکم پاتے ہی مرید نے چھاگل اٹھائی۔ چونکہ وہ جانتا تھا کہ بھیجنے والا چھاگل بھی دیکھ رہا ہے، اور ساگر بھی۔

لہٰذا وہ اناساگر کے قریب پہونچا اور اناساگر کی بوند بوند، قطرہ، قطرہ چھاگل میں بھر لایا۔ اب ساگر ساگر نہ رہا بلکہ چٹیل میدان بن گیا۔

اب اجمیر والوں کی آنکھ کھلی، دن میں تارے نظر آنے لگے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ تب غریب نواز نے اپنی خاموش اداؤں میں سمجھایا کہ ہمارا تمہارا تو یہی فرق ہے کہ تم پانی کو تلاش کرتے ہو اور پانی مجھے تلاش کرتا ہے۔ آنکھیں کھولو۔ ہوش میں آؤ۔ دیکھو کہ تم کس سے آنکھیں ملانا چاہتے ہو۔

حضرات! میں نے یہی تو عرض کیا تھا کہ اردو ادیب صرف بولتا ہے کہ سمندر کو کوزے میں بھر دیا۔ مگر میرے غریب نواز نے اسے عملاً کر کے دکھا دیا۔

حضرات! مجھے معاً ایک بات سطح ذہن پر ابھر آئی کہ کوئی نیا تخیل، نیا نکتہ اور نئی دریافت ہو۔ لہٰذا مجھے اجازت دیجئے کہ وہ بات عرض کی جائے دوستو! اناساگر کو کوزے میں بھر تو لیا گیا مگر یہ صرف چلتا پھرتا واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ معاندین کے ایک اہم سوال کا مسکت اور دنداں شکن جواب ہے بہت ہی ہوش گوش سے سن لیجئے، کہ سوال کربلا پر تھا اور جواب اجمیر سے مل رہا ہے۔

اب میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں، ذہن و فکر کی بھرپور توانائیوں سے

آنے والی گفتگو کو سماعت فرمائیں:

حضرات! ہمارا یہ کہنا ہے کہ سید الشہداء، نواسہ رسول، جگر گوشہ بتول، سیدی سرکار امام عالی مقام میدان کربلا میں "مظلوم" تھے مگر مجبور نہیں تھے۔ اگر پانی کے ارادے سے کربلا کی زمین پر اپنی ایڑیوں کی ٹھوکر مار دیتے تو ندیاں بہ جاتیں، چشمے ابل پڑتے، میدان نینوا جل تھل ہو جاتا۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا۔ وہ محض ولی نہیں ولی گر تھے۔ اگر وہ کسی مرد مسلمان پر اپنی نگاہِ کرم و نظرِ عنایت اٹھا دیتے تو ولی بنا دیتے۔ اسی لئے تو حضرت نیاز بریلوی نے فرمایا ہے ؎

اے دل بگیر دامنِ سلطانِ اولیاء
یعنی حسین ابن علی جانِ اولیاء

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ درسگاہ نبوت میں حسین کو صرف پڑھایا ہی نہیں گیا، پلایا بھی گیا ہے۔

واضح رہنا چاہئے کہ میرے سرکار پڑھاتے بھی تھے اور پلاتے بھی تھے۔ اس عنوان پر میری ایک مستقل تقریر ہے۔ "درسگاہ اور خانقاہ" درسگاہ میں پڑھایا جاتا ہے اور خانقاہ میں پلایا جاتا ہے۔ یعنی ایک عالم ظاہر کسی طالب علم کو جو علم پندرہ برس میں دیتا ہے اللہ کا ولی اگر اسی علم کو کسی کو دینا چاہے تو آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے اور کلیجے میں انڈیل دیتا ہے چونکہ درسگاہ میں پڑھایا جاتا ہے اور خانقاہ میں پلایا جاتا ہے۔

حضرات! میں عرض کر رہا تھا کہ حسین کو صرف پڑھایا نہیں گیا بلکہ علمِ ظاہر و علمِ باطن پلایا بھی گیا ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام کا یہ واقعہ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک بار آقائے دوجہاں نے چند صحابۂ کرام کو تبلیغ اسلام کے لئے فرمایا کہ تم فلاں جگہ جاؤ، تم فلاں جگہ جاؤ وغیرہ وغیرہ۔ صحابۂ کرام نے انتہائی ادب واحترام سے عرض کیا یا رسول اللہ! حکم سر آنکھوں پر، لیکن

سرکار ہمیں جہاں بھیج رہے ہیں ہم وہاں کی زبان نہیں جانتے اس جانے کا حاصل کیا ہوگا۔

ع زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

مگر یہ حضرات رات کو سوئے اور صبح جب اٹھے تو جسے جہاں جانا تھا اسے وہاں کی زبان معلوم ہو چکی تھی۔ اس پر وہ قابو پا چکے تھے۔

حضرات! یہی میرا مدعا ہے کہ سرکار پڑھاتے بھی تھے اور پلاتے بھی تھے۔ اس کو پڑھانا نہیں کہا جاتا اس کو پلانا کہتے ہیں۔

اب آیئے اصل مقصد پر۔ میں یہی تو کہہ رہا تھا کہ سرکار امام حسین ولی بھی تھے اور ولی گر بھی تھے۔ انھیں صرف پڑھایا ہی نہیں گیا بلکہ پلایا بھی گیا۔ صرف درسگاہِ نبوت ہی میں نہیں درسگاہ مرتضےٰ اور تربیت گاہِ فاطمہ ان سبھوں میں بھی ان کی تعلیم ہوئی ہے۔ متن درسگاہِ مصطفےٰ ہے اور مرتضےٰ و بتول زہرا اس کے شرح و حواشی ہیں۔ ایسے متن کے لئے ایسے ہی حاشیہ نگاروں کی ضرورت تھی۔ پھر کیا کہنا اس متعلم کا جس کے معلم مصطفےٰ ہوں اور حاشیہ نگار مرتضےٰ و فاطمہ ہوں۔

حضرات! اسے علم سفینہ نہیں بلکہ علم سینہ کہا جاتا ہے۔ گویا حسین کو پڑھایا ہی نہیں جا رہا ہے بلکہ پلایا بھی جا رہا ہے۔ پھر کیا کہنا ان پلانے والوں کا جس نے اپنے کو علم کا شہر کہا اور علی کو اس کا دروازہ۔ خیال تو فرمایئے، بات کہاں سے کہاں تک پہونچی۔ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا

اب خیال فرمایئے۔ بات کہاں سے کہاں پہونچی جو خود براہِ راست مصطفےٰ مرتضےٰ، اور سیدہ فاطمہ سے لے رہا ہو اس کی وسعتِ علم کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ نہ تو دینے والے میں کوئی کمی اور نہ ہی لینے والوں میں۔ کوئی پڑھا رہا ہے اور کوئی پڑھ رہا ہے۔ کوئی پلا رہا ہے، کوئی سیراب ہو رہا ہے۔

حضرات! ذرا غور تو فرمایئے، جسکی ایک نگاہِ نبوت نے سیدنا ابوبکر کو صدیق۔ سیدنا عمر کو فاروق، سیدنا عثمان کو غنی و سخی، اور سیدنا علی کو ولی بنایا ہو، آج کیا کچھ حسینؓ کو دیا ہوگا۔ ہم سوچتے سوچتے ختم ہو جائیں مگر اس لینے اور دینے کی تہ تک نہ پہونچ سکیں۔

اللہ اکبر! کیا کہنا حسین کے علوِ مرتبت کا جس نے مصطفےٰ کی گود میں معرفت حق حاصل کی ہو۔ اور سیدنا علی کے کاندھوں سے کائنات کی بلندی کو دیکھا اور چھوا ہو۔ اور حضرت سیدہ فاطمہ کی چادر میں سمٹی ہوئی پوری کائنات کا مطالعہ کیا ہو۔

کوئی بد باطن اور آنکھ کا اندھا ہی کہہ سکے گا کہ حسین ولی نہیں تھے۔ یا پھر وہ کربلا میں مجبور تھے۔

آؤ دیکھو کہ حسین کو کیسے پلایا جاتا تھا۔ کبھی کبھی انتہائے محبت و پیار میں سرکار ابد قرار صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی زبان مبارک کو ہونٹوں سے باہر کر دیتے اور حسین اس کو چوسا کرتے۔

حضرات! مجھے کہہ لینے دیجئے کہ ایک ظاہر بیں آنکھ تو صرف یہ دیکھ رہی ہے کہ نواسۂ رسول، نانا کی زبان چوس رہا ہے مگر ایک حق نگر، حق شناس آنکھ اس کے سوا یہ بھی دیکھ رہی ہے زبان کون چوس رہا ہے کس کی زبان اور کون سی زبان چوس رہا ہے۔

حضرات! ذہن و فکر پر دباؤ ڈالئے اور میرے جملے پر غور کیجئے کہ کس کی زبان اور کون سی زبان ہے، کبھی بولے تو قرآن بن جائے اور کبھی گویا ہو تو حدیث کا سرمایہ مل جائے۔ گویا اسی ایک زبان سے دونوں چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اسی نوک زبان سے قرآن بھی ہے اور اسی زبان سے حدیث بھی۔ لہٰذا اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ خالی زبان نہیں چوسی جا رہی ہے بلکہ اس کے پردے میں حکمت قرآن اور رموز احادیث پلائے جا رہے ہیں

ہیں ۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک ۔

اب تو یقین ہو گیا ہو گا کہ امام حسین صرف ولی نہیں ولی گر تھے ۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ کربلا میں حسین مظلوم تھے مجبور نہیں تھے اگر وہ چاہتے تو ایڑیوں کی ٹھوکر سے میدانِ کربلا کو جل تھل کر دیتے ۔

حضرات ! اس تفصیل میں کہیں میرا عنوان بھول نہ جائیے گا کہ سوال کربلا پر ہے اور جواب اجمیر سے مل رہا ہے ۔ لہٰذا پھر اسی نقطۂ آغاز پر آجائیے کہ امام کربلا میں مظلوم تھے مجبور نہیں تھے ۔

ایک سوال :۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ حسین مجبور نہیں تھے بلکہ مظلوم تھے تو ہمارا معاند دشمنِ حسین سوال کرتا ہے کہ اگر حسین مجبور نہیں تھے تو علی اصغر کے لئے پانی کیوں نہ منگوایا ۔ چھ مہینے کے بچے کا چہرہ اترا ہوا ہے ہونٹوں پر خشکی اور پپڑی ہے ، آنکھ کے ڈھیلے ابھر رہے ہیں ، گلے میں کانٹے پڑ گئے ہیں ۔ اور مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی حسین پانی نہ منگا سکے ۔

جواب :۔ حضرات ! یہی تو وہ مقام ہے جہاں پہنچانے جا رہے ہیں چونکہ امام حقیقت آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ میں یہاں کرامت کا مظاہرہ کرنے نہیں آیا ۔ اگر کوئی کرامت دکھائی اور اس کی مدد سے کام لیا تو بات ہی کیا رہ گئی ۔ زیادہ سے زیادہ باب کرامت میں دو چار کرامتوں کا مزید اضافہ ہو جائے گا ۔

امام حسین کو یقین تھا کہ نانا جان کی امت پر تو یہ پہلی کربلا ہے ابھی نہ جانے کہاں کہاں دانہ پانی بند کیا جائیگا ۔ اگر آج میں نے کرامت سے کام لیا اور پھر کہیں یہی حالات پیدا ہوئے تو یہ امتِ مسلمہ کلیجہ مسوس کر رہ جائے گی ۔ اور یہ سوچ کر اس کی ہمت پست ہو جائے گی کہ ہم میں کوئی

حسین کرامت والا نہیں۔ لہٰذا یہ معرکہ کیسے سر کیا جائے ؟

حسین اس یقین واثق کے ساتھ میدان کربلا میں ڈٹے ہوئے ہیں مادی طاقتوں کے سامنے مادی جنگ کی جائے گی۔ لہٰذا علی الرغم کھلے بندیہ کہہ دیا ؎

ادھر آؤ پیارے ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر ، آزمائیں

حسین کرامت والے ہیں مگر آپ کرامت دکھا نہیں رہے ہیں کہ انھیں قوم کو دستورِ حیات اور اصولِ زندگی دینا ہے۔ یعنی اے لوگو! اگر تم جینے کا ڈھنگ سیکھنا چاہتے ہو تو حسین کو فاطمہ کی آنگن میں دیکھنا اور اگر مرنے کا سلیقہ سیکھنا ہے تو حسین کو کربلا میں دیکھنا۔ میں تمہیں موت وزندگی دونوں کا سبق پڑھانے آیا ہوں۔

لیکن ہمارا معاند بہت ہی ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔ ہماری اس بات پر مطمئن نہیں ہوتا گلے کی رگیں پھلا کر کہتا ہے ہم یہ نہیں جانتے ہم تو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر امام حسین کرامت والے تھے تو علی اصغر اور خیمہ کے دوسرے اعزا و اقربا کے لئے "پانی" کیوں نہ منگایا۔

حضرات! اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ میں نے ہی تو کہا تھا کہ سوال کربلا پر ہے اور جواب اجمیر سے دیا جا رہا ہے۔

اے نادانو! میرے غریب نواز نے انا ساگر کا پانی منگا کر کیا بتایا۔ یہی تو بتایا کہ اولادِ حسین میں ہوں وہ میرے باپ دادا ہی تو ہیں اور درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ لہٰذا تم کربلا ہی کو مت دیکھو۔ اجمیر بھی دیکھو کہ جب ان کا بیٹا پوتا ایسی کرامت والا ہو سکتا ہے تو ان کے اجداد وامجاد کی کرامتوں کا کیا عالم ہوگا۔ لیکن ہمارا حریف نہ ماننے کی قسم کھائے بیٹھا ہے وہ کہتا ہے ہمیں منطق و فلسفہ کی بھول بھلیاں نہیں چاہیے، ہم تو

آنکھوں کا مشاہدہ چاہتے ہیں لہٰذا بات وہ کہو جو کلیجے میں اتر جائے۔

لہٰذا اے دوستو! ہمارے حریف کو آواز دو میں اب وہ بات کہے جا رہا ہوں کہ ذہنوں کے زنگ آلود تالے ٹوٹ جائیں گے۔

حضرات! اب میں آپ کے انصاف کا طلب گار ہوں۔ ہمارے حریف سے کہہ دیجئے کہ وہ پانی منگانا ہی مت دیکھے بلکہ یہ بھی دیکھے کہ حسین کے سامنے کون ہے اور خواجہ کے سامنے کون؟ تو اب مجھے عرض کر لینے دیجئے کہ حسین کے سامنے یہ (داڑھی پر ہاتھ پھیر کے) یعنی داڑھی والے اور خواجہ کے سامنے وہ ہیں (سر پر ہاتھ پھیر کے) یعنی ایریل والے لہٰذا معلوم ہونا چاہئے کہ کرامت ایریل والوں کو دکھائی جاتی ہے۔ داڑھی والوں کو نہیں۔

سیدنا حسین پر تو یہی جلال طاری تھا کہ نانا کا کلمہ بھی پڑھتا ہے اور کرامت بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ سوال کربلا پر تھا اور جواب اجمیر سے مل رہا ہے۔ معذرت کے ساتھ

حضرات! بات بہت پھیل گئی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رسول اللہ جو دیں اسے لے لو اور سرکار جس سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ۔ اب ہمیں غور یہ کرنا ہے کہ رسولِ خدا نے ہمیں کیا دیا اور ہم نے کیا لیا۔ وہ کیا دیں اور ہم کیا لیں۔ کیا وہ درہم و دینار دیں تو ہم لے لیں، وہ زر، زمین دیں تو ہم لے لیں، باغ باغیچہ دیں تو ہم لے لیں وغیرہ وغیرہ۔

حضرات! اس لئے دینے سے پہلے یہ سوچنا پڑے گا کہ منصب نبوت کیا ہے، منصبِ رسالت کیا ہے؟ کیا دے رسول اپنی قوم کو، اور کیا دینے آیا ہے۔ نبی اس لئے مبعوث نہیں کیا جاتا پھر وہی سوال باقی رہ گیا پھر ہم کیا لیں۔

حضرات! اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ نبی جس چیز کو فرض کہے تم اسے

فرض کہو۔ جسے واجب کہیں اسے واجب کہو، جسے حلال کہیں اسے حلال کہو۔ جسے حرام کہیں اسے حرام کہو، جسے جائز کہیں اسے جائز کہو، جسے ناجائز کہیں اسے ناجائز کہو، جسے مکروہ کہیں اسے مکروہ کہو، جسے تنزیہی کہیں اسے تنزیہی کہو۔ جسے تحریمی کہیں اسے تحریمی کہو۔ جسے مباح کہیں اسے مباح کہو جسے مستحب و مستحسن کہیں اسے مستحب و مستحسن کہو، جسے شرک کہیں اسے شرک کہو، جسے بدعت کہیں اسے بدعت کہو۔

اس طرح کے احکام اوامر و نواہی، اصول و ضوابط، خواہ وہ معاش سے متعلق ہوں یا معاد سے کسی سے بھی متعلق ہوں ہم اس میں رسول اللہ کے حکم کے پابند ہیں۔ گویا شریعت محمدی کے ٹکسال کے یہ وہ کھنکتے سکے ہیں جسے تم من مانی استعمال نہیں کر سکتے، شرک وہیں بولو جہاں مصطفےٰ بلوانا چاہیں۔ اور بدعت ضلالت اسے کہو جسے مصطفےٰ کہلوانا چاہیں۔ اب آپ اس اجمال کی تفصیل میں آجائیے :-

یعنی اگر کوئی خواجہ غریب نواز کی قبر اطہر پر نہیں جانا چاہتا تو اپنے نہ جانے کی دلیل میں وہ یہ کہہ سکتا ہے میرے آقاؤں نے مجھے روکا ہے۔ میری کتابوں نے مجھ پہ پابندی لگائی، میرے مولویوں نے مجھے منع کیا ہے، میرا نفس اور میرا ضمیر انکار کرتا ہے نہ جانے کی دلیل میں یہ ساری باتیں کہہ سکتے ہیں مگر شرک و بدعت نہیں بول سکتے۔ یعنی شرک وہیں بولو جہاں رسول خدا بلوانا چاہیں اور بدعت وہیں کہو جہاں مصطفےٰ کہلوانا چاہیں۔ یہ تمہاری تجوری کا خانہ ساز سکہ نہیں ہے کہ اسے جہاں چاہو استعمال کر لو۔

حضرات! کچھ آج ایسے لوگ بھی ہیں جو اولیائے کرام کے مزاروں پر نہ تو خود جاتے ہیں اور نہ ہی کسی کو جانے دینا چاہتے ہیں جہاں دیکھئے وہ شرک و بدعت کا پٹارہ لیے بیٹھے ہیں۔ شرک و بدعت کی تفصیلی بحث تو آپ اسی عنوان کے تحت سماعت فرمائیے گا۔ آج میں ان گرہوں کو

کھول دینا چاہتا ہوں جو مزارات کی حاضری سے متعلق ہیں۔

سب سے پہلے تو آپ یہ ذہن نشیں کرلیں کہ مزارات پر جاتے تو ہم لوگ ہیں مگر حاشیہ یہ لگاتے ہیں۔ گویا کتاب ہماری اور ترجمہ آنجناب کررہے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ تم ہوٹلوں میں ہمارے خلاف بولتے ہو، قہوہ خانوں میں ہماری غیبت کرتے ہو، چوراہے پر ہمارے خلاف زہر افشانی کرتے ہو، کوچہ و بازار میں ہمارے اوپر طعنے کستے ہو، اٹھتے بیٹھتے ہمیں قبر پجوا کہتے ہو اس کے باوجود تمہارا کہنا ہے کہ ہم تو کچھ بھی نہیں کہتے۔ آخر اس الزام تراشی، بہتان بندی، غلط بیانی اور بدزبانی کے بعد تم اور کیا کرنا چاہتے ہو؟ کیا چوراہے کی جنگ لڑنا چاہتے ہو، یا ہاتھا پائی کرنا چاہتے ہو؟ اور جہاں تمہارا بس چلتا ہے وہاں یہ بھی ہو رہا ہے۔ تمہیں شرم و غیرت آنی چاہیئے۔ خالص عقیدے اور علمی مسائل کو تم نے اپنی چرب زبانی اور قوتِ بازو کی آزمائش گاہ میں ڈال دیا ہے۔

علاوہ ازیں یہ فرائض و واجبات کی حیثیت نہیں رکھتے۔ بعض فروعی مسائل ہیں اور تم نے انھیں اس قدر اچھال دیا کہ قوم دو دھڑوں میں بٹ گئی اور ہماری اکائی، دوئی سے بدل گئی۔ آج ان ہی مسائل کا ہر جگہ رونا رویا جا رہا ہے۔ ؎

اے چشمِ اشک بار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو جل رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

اے نادانو! انصاف و دیانت کا گلا مت گھونٹو۔ ان تمام خرافات اور الزام تراشیوں کے بعد تم یہ کہہ کر گذر جانا چاہتے ہو کہ ہم تو کچھ نہیں کہتے: ؎

بڑے پاک دامن بڑے نیک طینت
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

ہمارا مطالبہ:۔ حضرات! ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم تمہاری نظر میں "قبر بجوا" ہیں تو اسے گلی کوچے میں کہنے کے بجائے خود ہم سے کیوں نہیں کہتے۔ ایک بہت ہی سادہ شعر سطح ذہن پر ابھر آیا ہے سماعت فرمائیں۔ ؎

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

یہ کیا بات ہوئی کہ ہماری بات غیروں سے کہو اور ہم سے نہ کہو لہٰذا جب بات آہی گئی ہے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان کی شکایات و اعتراضات پر ایک فیصلہ کن گفتگو کر لی جائے تاکہ ذہن میں کوئی چبھتا ہوا کانٹا نہ رہ جائے۔ اب ہم تدریجاً اپنے معمولات کا سرسری جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

ایک نئی بحث کا آغاز

(۱)

قبر کی حاضری، ایصال ثواب، چادر اور پھول ڈالنا، مدد مانگنا، چادر چومنا وغیرہ وغیرہ۔

حضرات! جہاں تک قبروں کی حاضری کا مسئلہ ہے "یا دیں مٹائی نہ جائیں بلکہ انھیں برقرار رکھی جائیں" یہ اسی گفتگو کی تفصیل ہے جو اس عنوان کے تحت آچکی ہے۔

آپ اسے ملاحظہ فرمائیں اس میں اچھے خاصے اشارات ملیں گے جس میں میں نے یہ واضح کیا ہے۔ ہم نے رسول اللہ کو حضرت آمنہ کی قبر پر دیکھا۔ ہم نے سرکار دو عالم کو شہدائے احد کی قبروں پر دیکھا ہم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ رسول اللہ کی قبر انور

صدیق اکبر اور فاروق اعظم کی قبر اطہر پر حاضری دی۔ سید احمد کبیر رفاعی نے حاضری دی، حضرت امام شافعی نے حضرت امام اعظم کی قبر پر حاضری دی، سرکار خواجہ غریب نواز نے داتا گنج بخش لاہوری کی قبر پر حاضری دی، خود سرکار نے فرمایا جس نے حج کیا اور میری قبر پر حاضری نہ دی اس نے مجھ پر ظلم کیا۔ سرکار نے یہ بھی فرمایا جس نے میری قبر اطہر پر حاضری دی اس پر میری شفاعت واجب ہو گئی۔

لہٰذا اس مقام پر سمجھنے کے لئے یہ اشارات کافی ہیں اب اس پر ہمیں گفتگو کرنا نہیں ہے۔

مغالطہ

ان کا سب سے بڑا فریب اور مغالطہ یہ ہے کہ یہ "چومنے" کو پوجنا کہتے ہیں۔ خود میرا معمول ہے کہ جب میں غریب نواز کے آستانہ پر حاضری دیتا ہوں تو میں حاضری میں بلند دروازہ، جو نظام حیدرآباد دکن کی غلامی کی نشانی ہے میں اس کا پہلا زینہ چومتا ہوں اور یہ رات کے اندھیرے اور کالی کوٹھری میں نہیں، بلکہ لاکھوں لاکھ کے مجمع میں، میں نے چوما۔ اور انھوں نے کہا پوجا۔

اب ان سے دریافت کیجئے اگر اس طرح کے چومنے کا نام پوجنا رکھ دیا جائے تو اس دنیا میں کوئی مسلمان مل سکے گا؟

واحسرتا! مسلمانوں کو کافر و مشرک بنانے کا جذبہ اس قدر اپنے حدود سے متجاوز کر چکا ہے کہ اس نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی کہ حق و ناحق کا امتیاز جاتا رہا۔ اس لئے مجھے کہہ لینے دیجئے کہ پوجنا اور ہے چومنا اور ہے۔ پوجنا وہاں بولا جاتا ہے جہاں کسی کو معبود سمجھ کر حاضری دی جائے۔ خوش عقیدہ سنی مسلمان ہر چند کہ اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دیتا ہے،

مگر وہ صاحبِ مزار کو اللہ نہیں کہتا بلکہ اللہ والا کہتا ہے۔ وہ ان کو خدا نہیں کہتا بلکہ محبوبِ خدا کہتا ہے۔ وہ بزرگانِ دین کے کشف و کرامات اور ریاضت و مجاہدات کا قائل ہے مگر وہ ان کو اللہ کی مخلوق اور بندہ ہی کہتا ہے۔ وہ انھیں ہرگز ہرگز اللہ اور خدا نہیں کہتا۔ عقیدے کی اس صراحت کے باوجود چومنے کو پوجنا کہنا اسے تعصب، تنگ نظری، دلی دشمنی، الزام تراشی اور حقائق سے چشم پوشی نہ کہا جائے تو کہا کیا جائے؟

ع آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے؟

حضرات! یہ تو ایسا کوئی سر پھرا ہی ہوگا جو یہ کہے کہ بندہ نہیں خدا لیٹا ہوا ہے۔ یہ عقیدہ تو مسلمانوں کو ماں کی گود میں ہی مل جاتا ہے کہ اللہ حیّ و قیوم ہے۔ ہمیشہ سے ہے، آج ہے اور ہمیشہ کے لئے ہے اللہ کی موت نہیں، جب موت نہیں تو اس کی قبر نہیں۔ جب قبر نہیں تو اس کی چادر نہیں۔ معلوم ہوا قبر اور چادر یہ خدا کے لئے ہے ہی نہیں۔ بلکہ ہے تو یہ محبوبِ خدا کے لئے ہے۔

اتنی واضح صراحت کے بعد بھی پوجنے اور چومنے کا فرق نہ سمجھا جائے۔ تو اس کے علاوہ اور کیا کہئے ؎

یارب نہ وہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

حضرات! میں نے دہلیز کو چوما، چوکھٹ کو چوما، چادر چوما اس کو انھوں نے پوجنے سے تعبیر کیا۔ میں انصاف کا طلب گار ہوں اگر اس چومنے کا نام پوجنا رکھ دیا جائے تو حجرِ اسود بھی چوما جاتا ہے، غلافِ کعبہ بھی چوما جاتا ہے، قرآن کا جزدان بھی چوما جاتا ہے، کیا ان کے چومنے والے سب کے سب پجاری ہیں اور مشرک ہیں؟ بتلائیں؟؟

ایک بات یہیں واضح کر دی جائے تاکہ پوجنے اور چومنے کا فرق

نمایاں ہو جائے۔

اسلام کا دورِ آغاز دیکھئے کہ رسولِ خدا نے اللہ کے گھر سے تین سو ساٹھ پتھروں کو نکال پھینکا۔ یہ سب پتھر ہی تو تھے لیکن اسی گھر میں ایک پتھر کو نصب کر دیا جسے چوما جاتا ہے۔ اب اس فرق کو واضح کیجئے، کہ دونوں پتھر ہی تو ہیں مگر ایک کو نکالا گیا اور دوسرے کو جایا گیا، نصب کر دیا گیا۔

حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جو پتھر پوجا جاتا تھا اسے نکال دیا گیا۔ اور جو چوما جاتا تھا اسے جا دیا گیا۔ جب اللہ کے گھر میں پتھر چوما جائے اور اسے پوجنا نہ کہا جائے تو غریب نواز کی چوکھٹ اور دہلیز چومنے کو پوجنا کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟

چادر چومنا

خوش عقیدہ مسلمان نمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد قرآن کی تلاوت کرنا چاہتے ہے تو پہلے تلاوت نہیں کرتا بلکہ اسے چومتا ہے۔ جب وہ چومتا ہے تو ہونٹ کس پر پڑتا ہے۔ آخر جزدان ہی پر تو۔؟ یہ کپڑا ہی تو ہے۔؟ تو کیا مسلمانوں کو کپڑا چومنے کا ہیضہ ہو گیا ہے۔؟

اگر ایسی بات ہوتی کہ ہمارا مزاج کپڑا ہی چومنے کا ہوتا تو کلاتھ مرچنٹ کے یہاں آتے اور خوب کپڑے چومتے، اپنی شیروانی چومی جاتی، اپنا دامن چوما جاتا، مگر ایسا نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ وہ جزدان کو کپڑا سمجھ کر نہیں چوم رہا ہے بلکہ نسبتِ قرآن کو چوم رہا ہے۔ بس ایسے ہی جو مسلمان اللہ کے ولی کی قبر کی چادر چوم رہا ہے۔ اسلئے نہیں کہ کمخواب و مخمل سمجھ کر چوم رہا ہے بلکہ نسبتِ ولایت اور نسبتِ خواص کو چوم رہا ہے۔ کسی کمتر اور چھوٹی شی کو جب کسی بڑی شے

سے نسبت ہو جاتی ہے تو اس میں بھی بڑائی آ جاتی ہے۔

نسبت کی بحث

(۱)

نسبت بذاتِ خود نہ تو حسن ہے نہ قبیح۔ نسبت کی اچھائی، برائی منسوب الیہ کے اعتبار سے ہے۔ جیسے زمان، مکان نہ فی نفسہٖ حسن ہیں اور نہ قبیح۔ مثلاً جمعہ کا دن افضل ہے چونکہ حضرت آدم علیہ السّلام کی ولادت باسعادت کا دن ہے اور دوشنبہ سب سے افضل ہے۔ چونکہ سرکار کی ولادت باسعادت کا دن ہے۔

ایک صحابی نے عرض کیا کہ حضور ہم دوشنبہ کو روزہ رکھیں حضور نے فرمایا ہاں، چونکہ ولدت فیہ میں اسی دن پیدا ہوا ہوں۔ ایسے ہی زمین کا وہ حصہ جس سے سرکار کا جسدِ اطہر لگا ہے وہ کائنات کے ہر حصہ سے افضل و اعلیٰ ہے۔

(۲)

سیدنا امام مالک جو اکابر محدثین سے ہیں جن کو حضور نے بطور پیشن گوئی اعلم مدینہ فرمایا ہے۔ وہ ایک مرتبہ علماء و فضلا کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی سے گذر رہے تھے۔ ایک کچی اور پرانی دیوار کو دیکھ کر آپ نے بوسہ دیا لوگوں کے استفسار پر آپ نے فرمایا کہ اس دیوار کی قدامت اور پرانا پن یہ بتلاتا ہے کہ ممکن ہے ادھر سے میرے سرکار کا گذر ہوا ہو اور سرکار نے اپنا دستِ کرم اس پر رکھ دیا ہو۔ اسلئے اس کو نسبت ہے میرے سرکار سے۔

(۳)

حضرت! حضرت علامہ جامی علیہ الرحمہ کا مدینہ کی سرزمین پر پیشاب

وپاخانہ نہ کرنا اور جواب میں یہ فرمانا کہ کہیں اس مقام پر میرے سرکار کا قدم ناز، زندگی مبارک میں نہ پڑ گیا ہو۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاں سرکار کا قدم ناز پڑ جائے وہاں پیشاب پاخانہ کیا جائے۔ حضرت جامی نے سرکار کا قدم نہ دیکھا تھا پھر بھی تعظیم کی یعنی صرف قدم کا تصور تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی تعظیم کے لئے دیکھنا ضروری نہیں ہے بلکہ تصور بھی انسان کو واجب التعظیم بنا دیتا ہے مثلاً کعبہ کی تعظیم ہر شخص پر واجب ہے خواہ دیکھے یا نہ دیکھے۔ اسی لئے کہ سرکار نے فرمایا ہے، کہ کوئی بول و براز کے وقت نہ استقبال قبلہ کرے اور نہ تو استدبار قبلہ۔ یہ حکم دیکھنے یا نہ دیکھنے سے متعلق نہیں ہے جو لوگ تعظیم کا دار و مدار دیکھنے پر کرتے ہیں۔ ان کی بنا پر وہی تعظیم کرے جو دیکھے۔ صرف مکہ کے وہ لوگ جو کعبہ کی چہار دیواری دیکھیں۔ لہٰذا قیام، میلاد میں یہ کہنا کہ کیا تم رسول کو دیکھتے ہو؟ یہ بے عقلی کی دلیل اور خلاف اصول بات ہے۔

(۴)

حضرت سیدنا ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ قاضی القضاۃ نے ایک شخص کو قتل کا حکم دیدیا۔ صرف اس لئے کہ آپ دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ اور کدو شریف تناول فرما رہے تھے، جو سرکار کی محبوب ترین غذا ہے۔ آنے والے لا احب القرع میں کدو کو پسند نہیں کرتا۔ کدو کے محبوب و پسندیدہ نہ ہونے پر قتل کا حکم کیوں دیا گیا۔ صرف اس لئے کہ کدو حضور کو پسند ہے کدو کو سرکار سے نسبت ہے "قرع" عربی زبان میں لمبے سفید کدو کو کہتے ہیں جس کو ہماری زبان میں لوکی اور کدو دونوں کہتے ہیں۔

---

(۵)

ہدایہ جلد ثالث باب الکراہیۃ کے حاشیہ پر عبداللہ ابن عباس کی روایت ہے کہ عرب کے بدو یعنی صحرا نشیں جنگل کے رہنے والے جس وقت مدینہ پاک کی طرف سفر کرتے۔ جہاں سے سرحدِ مدینہ شروع ہوجاتی وہاں کی کنکریوں کو لے کر چومتے اور بوسہ دیتے۔

بدویوں سے لوگوں نے دریافت کیا یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کنکر اور پتھر چوم رہے ہو۔ فوراً ان جنگل کے رہنے والوں نے جواب دیا یہ کنکر کنکر سمجھ کر نہیں چوما جا رہا ہے بلکہ یہاں سے مدینہ کی سرحد شروع ہوگئی ہے۔ یہاں کے ایک ایک ذرّہ کو نسبت ہے، میرے سرکار سے اس لئے یہاں کا ایک ایک ذرّہ اس قابل ہے کہ بوسہ دیا جائے چوما جائے۔

(۶)

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ جس وقت بیت اللہ شریف کا طواف کرنے آئے تو حجرِ اسود کے مقابل کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں تو پتھر ہے اور پتھر چوما نہیں جاتا مگر ذرا ہی دیر کے بعد حجرِ اسود سے لپٹ گئے، بوسہ دیا۔ فرمایا کیا کروں تجھے نسبت ہے میرے سرکار سے۔

(۷)

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وعظ فرما رہے تھے درمیان وعظ میں متعدد بار کھڑے ہوگئے۔ وعظ کے بعد لوگوں نے دریافت کیا کہ کھڑے ہونے کی کیا وجہ تھی۔ تو آپ نے فرمایا خاندانِ اہلبیت کا ایک چھوٹا سا بچہ کھیل رہا تھا جب وہ ادھر سے گذرتا تھا تو اس کی تعظیم کے لئے کھڑا ہوجاتا تھا۔ یہ کیوں صرف اس لئے کہ نسبت ہے سرکار سے۔

(۸)

جز دان میں لپٹا ہوا قرآن کریم جب ہاتھوں میں لیا جاتا ہے۔ فوراً ہماری نگاہ عقیدت بوسہ دیتی ہے۔ کیوں، کیا اس لئے کہ ٹیریکاٹ جرمن کے کارخانہ سے بن کر آیا ہے یا اس لئے کہ یہ چھینٹ احمد آباد کے کارخانہ کی بنی ہوئی ہے، یا اس لئے کہ یہ سوت بنارس میں تیار ہوا ہے۔ صرف اس لئے کہ اب وہ کپڑا اس قرآن سے لپٹ گیا ہے جو لایا ہوا ہے محمد رسول اللہ کا۔ نسبت پیدا کر لی ہے قرآن مصطفےٰ سے۔

(۹)

جزدان ہٹا کر دفتی چومتے ہیں صرف اس لئے کہ لپٹ گئی ہے قرآن مصطفےٰ سے۔

(۱۰)

ایسے ہی ایک انسان خواجہ غریب نواز شہنشاہ بغداد کے دربار اقدس میں حاضر ہوتا ہے تو مزار مبارک کی چادر کو چومتا ہے، بوسہ دیتا ہے، حسین و خوبصورت و قیمتی کپڑا سمجھ کر نہیں۔ صرف اس لئے کہ اس کو شہنشاہ بغداد و سلطان الہند سے تعلق ہو گیا ہے یہ ثمرہ ہے نسبت کا۔

نکتہ:۔ یہ تو دو نگاہوں کا فرق ہے کہ کس کی نگاہ صرف خواجہ کے روضۂ مبارک کی اینٹ اور پتھر دیکھتی ہے اور کس کی حقیقت شناس نگاہ کنکر و پتھر کو چوم کر خواجہ کی روحانیت کو دیکھتی ہے۔ یہ تو نگاہ کا فرق ہے۔

(۱۱)

ادائیگی مستحب کے لئے محبت کی ضرورت ہے۔ محبت خود ایک مستقل قانون ہے اس کو دوسرے قانون کی حاجت نہیں ہے۔ فرائض و واجبات اور سُنن کے لئے مار پیٹ دھمکی کی ضرورت پڑتی ہے مگر مستحب

کے لئے صرف محبت کی ضرورت ہے۔

یہ قصۂ لطیف ابھی ناتمام ہے
جو کچھ بیاں ہوا وہ آغازِ باب تھا
وما علینا اِلاّ البلاغ

